مئی - جون ۱۹۴۸ء

جامعہ

جنوری ۸۰

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۷	بابت ماہ جنوری ۱۹۶۸ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

جون ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ تحریک (دہلی) کے "اقبال نمبر" میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، عنوان تھا "ایک گنج گراں مایہ کی تلاش"۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال نے مجھے لاہور بلایا اور یہ خواہش کی کہ "میں ایک معتدبہ مدت کے لئے لاہور میں سکونت اختیار کروں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اس کی کچھ خدمت کر سکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبے میں ان کی مدد کر سکوں، وہ منصوبہ یہ تھا ——— انھوں نے اسلامی اصول فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا، یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانے میں، ان نوٹس کی ترتیب و تہذیب اور انھیں کوئی قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لئے دقت سے خالی نہیں، ان کی خواہش یہ تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں"۔ یہی وہ گنج گراں مایہ ہے جس کی آج ایک مدت کے بعد ڈاکٹر صاحب کو تلاش ہے، معلوم نہیں یہ نوٹس اب کس کے پاس ہیں اور موجود بھی ہیں یا نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبال نے اسلامی فقہ پر کافی غور و فکر کیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اس عہد میں اس کے پورے لٹریچر اور اس کے اصولوں کا از سر نو جائزہ لینا چاہیئے، اس کا اندازہ ان کے اس خطبہ سے ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "الاجتہاد فی الاسلام" اور جو ان کی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں چھٹے خطبے کے طور پر شائع ہوا ہے، علامہ کے یہ خطبے انگریزی میں تھے، پہلے چھ خطبے تھے، بعد میں ایک کا اور اضافہ ہوا جسے انھوں نے لندن کی ایک علمی انجمن کی دعوت پر لکھا تھا

اور جس کا عنوان تھا "کیا مذہب کا امکان ہے؟" ان خطبوں کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے برسوں میں بڑی محنت سے تیار کیا اور ۱۹۵۸ء میں بزم اقبال (لاہور) نے شائع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں خطبات کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو سید نذیر نیازی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تھے، ان کے ذریعہ علامہ مرحوم نے دریافت کیا کہ کیا ڈاکٹر سید عابد حسین ترجمے کا کام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں، ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر معذوری ظاہر کی تو نذیر نیازی کے نام قرعۂ فال نکلا، ترجمہ میں جس احتیاط سے کام لیا گیا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود علامہ نے اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ دیکھا اور ضروری اصلاحات کیں، مقصد یہ تھا کہ ترجمہ کا سبج اور اسلوب متعین ہو جائے، علامہ کی یہ ہدایت بھی تھی کہ اردو داں ارباب علم کو خطبات کا مطلب سمجھنے میں دشواری نہ ہو اور یہ بہتر ہوگا کہ اگر اس کے بعض اجزاء علماء کی نظر سے گذر جائیں، چنانچہ جیسا کہ مترجم نے مقدمہ میں لکھا ہے، مولانا محمد سورتی، مولانا اسلم جیراجپوری اور سید سلیمان ندوی جیسے جید علماء نے ترجمے کو سنا اور دیکھا اور اصلاحیں بھی دیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب بھی اُن موقعوں پر جب مولانا سورتی اور مولانا جیراجپوری ترجمہ سنتے، موجود ہوتے اور خطبات کے مباحث اور مصطلحات پر تبادلۂ خیالات کرتے، اس طرح یہ ترجمہ بڑی حد تک مستند کہا جا سکتا ہے۔

چھٹے خطبہ "الاجتہاد فی الاسلام" میں علامہ اقبال نے بڑے فکر انگیز نکتے اٹھائے ہیں اور بڑی اخلاقی حرارت سے کام لیا ہے، اس خطبہ کا اصل عنوان یہ ہے "اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول"۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیائے قدیم کے نظریے کے برعکس اسلام کائنات کو متحرک قرار دیتا ہے، مدنیت کی سطح پر اسلام نے اپنی توجہ صرف ذاتی قدر و قیمت پر رکھی، رنگ و خون کا رشتہ زمین پیوستگی کا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد انسانی کے لئے کسی خالص نفسیاتی اساس کی جستجو جب ہی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس حقیقت کا ادراک ہو جائے کہ نوع انسانی ایک ہے اور اس کی زندگی کا مدار اصلاً روحانی ہے؛ حرکت کے اصول سے اللہ تعالیٰ کی اس آیت پر اساس مستحکم ہوتا ہے کہ تغیر و تبدیلی کے جلو میں ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے، ذات الٰہیہ زندگی کی روحانی اساس ہے جو قائم و دائم ہے اور یہ ہر تغیر اور ہر تبدیلی میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس

طرح علامہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ثبات اور تغیر دونوں خصوصیتوں کو ملحوظ رکھنے ہی سے ایک خوشگوار حیات اجتماعی قائم ہو سکتی ہے،

اس تمہید کے بعد علامہ نے بتایا ہے کہ اجتہاد کیا ہے اور صراحۃً کہا ہے کہ نظری طور پر سنی اسلام نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا، گو جب سے مذاہب اربعہ قائم ہو چکے ہیں عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی۔ انھوں نے اس پر بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ جو نظام قانون قرآن مجید جیسی کتاب کو اپنی اساس قرار دیتا ہے جو زندگی کو متحرک اور متغیر مانتا ہے، وہ کس طرح جمود و تعطل کا شکار ہو گیا، انھوں نے مغرب کے اہل قلم کی سطحی قیاس آرائیوں کی نفی کرتے ہوئے خود اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں، تفصیل کی تو گنجائش نہیں، البتہ اس سلسلے کے چند بلیغ ٹکڑے نقل کئے جاتے ہیں۔

بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) کے بعد قدامت پسند مسلم مفکر چاہتے تھے جیسے بھی ممکن ہو اسلام کی ہیئت اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ وہ بات ہے جس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی تھے، یہ اس لئے کہ قوائے انحطاط کا سد باب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے، لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علما نہیں سمجھتے تو یہ کہ قوموں کی اور ہستی کا دار و مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، قدر اور صلاحیت کیا ایوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔
——— یوں بھی ماضی کا غلط احترام، علیٰ ہذا ضرورت سے زیادہ تنظیم کا وہ رجحان جس کا اظہار تیرھویں صدی اور بعد کے فقہاء کی کوششوں سے ہوتا ہے، اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا اور یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ کی ذات میں ... اس روش کے خلاف ایک زبردست ردعمل رونما ہوا۔
——— بدقسمتی سے اس ملک (غیر منقسم ہندوستان) کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے، وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر کسی

فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

—— لیکن پھر اس سلسلے میں جو مطلب اور قرآن مجید کا وہ مطمح نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر رہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہوگا اس کی روش ارتقاء کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے....

—— مگر پھر اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے، اس لئے ہمیں چاہئے جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں، تعلیمات قرآنی کی یہی وہ خاصیت ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ لینا ہوگا۔

علامہ اقبال کی فکری کاوشوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ان کے اشعار پر تو سر دھنتے ہیں لیکن اُن کے افکار کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے، اس سے بڑی مظلومیت اور کیا ہو سکتی ہے، ہمارے انگریزی داں اور علماء دونوں اس میں شریک ہیں، طبقۂ علماء یہ کہہ سکتا ہے کہ خطبات انگریزی میں تھے اس لئے ہماری رسائی ان تک نہیں ہوئی، حالانکہ یہ عذر لنگ ہوگا، پھر بھی اردو ترجمہ کو شائع ہوئے کوئی ۹ سال کا عرصہ ہوا، کیا یہ ترجمہ ہندوستان کے علماء میں متداول ہوا۔ اگر ہوا تو انھوں نے اس کا کیا اثر لیا؟ علامہ کے اشعار ہر طبقہ میں مقبول ہوئے، بہت گائے گئے، بہت گنگنائے گئے، اور ہر گروہ نے اپنے مطلب کی باتیں ان سے نکال لیں، لیکن وہ فکر و فلسفہ، زندگی، کائنات اور خدا کے تعلق سے متعلق وہ آفاقی نظریہ جو اُن کے سیکڑوں اشعار اور ان کے خطبات کی روح ہے کتنے لوگوں نے اپنایا؟ ایسے تمام لوگوں سے علامہ کی شکایت اپنے پیر رومی کی زبان میں یہی ہے:

ہر کسے، از ظنِ خود، شد یارِ من
وز درونِ من، نجست اسرارِ من

ڈاکٹر جعفر رضا بلگرامی

قومیت

(عہد حاضر میں)

۱

عہد حاضر کی قومیت بہت کچھ فرانسیسی انقلاب اور صنعتی انقلاب کی مرہونِ منت ہے۔ فرانس کا انقلاب ایک سماجی انقلاب تھا جبکہ انگلستان کا صنعتی انقلاب ایک سائنسی و تکنیکی انقلاب تھا۔ قومی مملکتوں کی تشکیل کے لئے ایک نے سیاسی اور دوسرے نے معاشی ڈھانچہ فراہم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی مملکتوں کے لیے انگلستان اور فرانس ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ موجودہ دور کی قومیت مغربی یورپ کی قومیت کا ہوبہو چربہ ہے۔ اگرچہ دورِ جدید کی قومی مملکتوں نے مغرب کی قومی مملکتوں سے بہت کچھ استفادہ کیا پھر بھی دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مغربی یورپ میں قومی تصور پہلے آیا پھر مملکتیں بنیں جبکہ دورِ جدید میں مملکتیں پہلے ہی سے موجود تھیں، قومی تصور بعد میں پیدا ہوا۔

موجودہ قومی مملکتوں کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک "ارجنل" قومی مملکتیں جن کے قومی تصورات خود رو تھے اور جن کو کسی باہری ترغیب کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دوسری وہ جو "ارجنل" قومی مملکتوں کے تسلط کے خلاف ایک ردِعمل کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ یہ ردِعمل خود دو طرح کے تھے کیونکہ یہ مختلف ماحول میں پیدا ہوئے۔ ایک ردِعمل جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھا جہاں حکمراں طبقہ نے عوام کو بری طرح کچل رکھا تھا۔ اس کے خلاف عوام میں ایک قومی شعور جاگا اور وہ قومی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ جیسا کہ چین میں چیانگ کائی شیک اور روس میں زار کے خلاف ہوا۔ دوسرے قسم کا ردِعمل نوآبادیاتی

میں بدیسی حکومت کے خلاف پیدا ہوا لیکن اس کو بروئے کار لانے میں کچھ عرصہ لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوآبادیات کی ابتدائی سوسائٹی میں وہ اعتماد پیدا ہو سکا تھا جو کہ ایسے ردعمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ لوگوں میں خوداعتمادی ختم کر دیتا ہے۔ قومی لیڈر وہی کہلاتے ہیں جو ایک طرف اپنے ملک کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے اور دوسری طرف بدیسی حکومت کے سیاسی اداروں، حربوں اور چالوں سے پوری طور پر واقفیت حاصل کر کے یہ "خوداعتمادی" اپنے اور اپنے ملک کے باشندوں میں پھر سے پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ خوداعتمادی اپنے اور اپنے ملک کے باشندوں میں پھر سے پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ خوداعتمادی حاکم کے اجتماعی شعور کے مقابلہ میں خود محکوم میں اجتماعی شعور کا احساس پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ایک بار اگر یہ شعور پیدا ہو جائے تو پھر نوآبادیات کی ہر حرانی اس کو سربسر کرتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیات میں حاکم طبقہ کا ہر ایک کا سلوک قومی شعور کو ہمیشہ مستحکم کر رہا ہے اور اسی بنا سے حصول آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر "ازحل" قومیت اور دور جدید کی قومیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ازحل قومیت اتفاقی ہے جبکہ دور حاضر کی قومیت نہیں۔ ازحل قومیت سامراجی ہے جبکہ موجودہ دور کی قومیت سماجی برابری کا مطالبہ کرتی ہے۔ آج کی قومیت سیاسی ہی نہیں ہے یہ کسی حد تک معاشی ہے جو دنیا کی مملکتوں میں ایک خودمختار سماجی و معاشی اکائی کی حیثیت سے زندہ رہنے کا شعور پیدا کرتی ہے۔

۲

ایشیائی قومیت" نہ تو کسی قدیم سوسائٹی کی خودساختہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی یہ کوئی منفرد طرز زندگی جس کو بچا کر رکھا جو "قومیت" کو بچا کے رکھنے کے مترادف ہو۔ یہ تو ایک ایسی سوسائٹی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو باہری طاقتوں کی مداخلت سے شکست خوردہ ہو چکی تھی اور جس کو تعمیر نو کی فکر تھی تاکہ وہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں عزت و برابری کا مقام حاصل کرے۔ ایشیائی قومیت کا یہ مشترک مقصد مختلف ملکوں میں مختلف شکل اختیار کر رہا ہے۔ ہندوستان اور انڈونیشیا

میں اس نے ایک فکر انگیز اور جذباتی انقلاب کی صورت اختیار کی جس کا مقصد مغربی طاقتوں کی بیخ کنی تھی۔ چین میں یہ کمیونسٹ انقلاب کو پھیلانے کا ایک بااثر حربہ بن گئی۔ جاپان نے قومی انقلاب کو برپا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس نے ملایا، برما، انڈونیشیا اور فلپائن میں نہ صرف تربیتی ٹریننگ کا انتظام کیا بلکہ ہتھیار بھی تقسیم کئے۔ ہندوستان کی "انڈین نیشنل آرمی" کو منظم کیا اور ہندوستان کے قومی لیڈر سبھاش چندر بوس کو سپہ سالار بنایا۔ جو بھی شکل اس انقلاب نے اختیار کی مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح ایشیا سے مغربی طاقتوں کے تسلط کو ختم کر دیا جائے۔

بدیسی حکومت کے خلاف انقلاب کے اس مشترک مقصد نے ایشیا کی قوموں کو مستحکم و متحد کر دیا۔ عامی تنگ نظری ختم کر دی۔ سماجی شعور وسیع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں سوسائٹی متحرک ہو گئی۔ سیاسی کارکردگی بڑھ گئی۔ انقلابی طبقہ سے وابستگی کا احساس پیدا ہو گیا اور قوم ملک کے یکساں مقصد کے لئے جاں نثاری وسرفروشی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ سب سب بڑی کامیابیاں سہی لیکن ان کی حیثیت بہرحال عبوری اثاثہ کی ہے۔ ان کو انقلاب کا مقصد سمجھ لینا غلط ہوگا۔ ہم اب تک قومی انا کو بدیسی حکومت کے تسلط کو توڑنے کی سعی کام میں لگاتے رہے لیکن حصول آزادی کے بعد جب قومی نصب العین کے تعین اور قومی اداروں کے قیام کا وقت آیا تو ہماری قومی کارگزاریاں اور مفاد زوال پذیر ہونے لگے اور ذاتی مقاصد جذبہ جاں فروشی پر حاوی ہونے لگے۔ قومی یک جہتی جو ایک دوسرے سے اور مملکت سے ہم آہنگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے ایشیا میں منفی صورت میں بدیسی حکومت کے خلاف تو باقی رہی لیکن جب تعمیری مقاصد طے کرنے کا وقت آیا اور مثبت جدوجہد کی ضرورت پیش آئی تو اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ قوموں کی پہچان ہمیشہ "منفی" ہوتی ہے ان کو آپ کسی مثبت خاصیت سے نہیں پہچانتے بلکہ محض اس وجہ سے جانتے ہیں کہ فرانسیسی جرمن نہیں ہوتے یا اطالوی اور تھائی لینڈ کے باشندے رومی یا ملائی نہیں ہوتے۔ یہ بات ایشیا کی قومیت پر بھی صادق آتی ہے اپنی قومی یک جہتی کو برقرار رکھنے کے لئے ایشیا کی قومیت کو ہمیشہ کسی باہری دشمن کی تلاش رہتی ہے۔ اسی منفی رویہ کی وجہ سے آج ایشیا کی قومیت قوت فیصلہ سے محروم نظر آتی ہے۔ اشتراکیت یا سوشلزم، جمہوریت یا مطلق العنانیت،

ڈائنٹت یا جمہوریت، مذہبی یا سیکولر مملکت۔ یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے متبادل نظام سوسائٹی کے مختلف طبقے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان اداروں اور نظاموں میں سے کس کو چھوڑا جائے اور کس کو اختیار کیا جائے۔ یہی گومگو کی کیفیت روزمرہ کے مسائل میں بھی نظر آتی ہے ہندوستانی کو بحیثیت قومی زبان کے اپنایا جائے یا انگریزی کو ایک مدت غیر معینہ کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ انڈونیشیا اپنی یکجہتی کے لئے وحدانی طرز حکومت کو اختیار کرے یا علیحدگی کے جذبہ کو مطمئن کرنے کے لئے وفاقی طرز حکومت کو اختیار کرے تو "یونین" اور "یونٹ" کے درمیان اختیارات کی تقسیم کس تناسب سے ہو۔ اسی طرح معاشی سرگرمیوں کو فرد اور مملکت کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک طرف فرد کی آزادی و اس کی انفرادیت کو کوئی نقصان نہ پہونچے اور دوسری طرف سماجی مساوات و انصاف پر بھی آنچ نہ آنے پائے۔ ان مسائل پر قطعی فیصلہ نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ قومیت کا خود کوئی مثبت نصب العین نہیں ہے۔ قومی مقصد کی یکسانیت مختلف طبقوں کے درمیان بٹ کر رہ گئی ہے جس کے نتیجہ میں ہر طبقہ اپنے آپ کو قومی مقصد کا واحد رہنما اور دوسرے طبقوں کے وجود کو قومی مفاد کے منافی سمجھتا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کی تشکیل مختلف طبقاتی عناصر سے ہوئی ہو تو ان میں سے کسی ایک طبقہ کو قومیت کا صحیح رہنما تسلیم کر کے نمایاں حیثیت دینا یا کسی کو یہ کہکر علیحدہ کرنا کہ یہ قومیت کے عام کردار سے میل نہیں کھاتا انتہائی خطرناک صورت ہے۔ کسی بھی بنا پر ہم ان میں سے کسی کو علیحدہ نہیں کر سکتے کیونکہ سب ہی قومی زندگی کے ناقابل فراموش اجزاء ہیں۔

صحیح قومیت کے اظہار کا ذریعہ ایک آزاد حکومت ہوتی ہے لیکن ایشیائی حکومتوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ عوام اور ان کے چند لیڈروں کے درمیان ایک زبردست ذہنی خلا ہے۔ عوام اَن پڑھ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہیں۔ اُن کے لیڈر خیالات کے اعتبار سے مغربی ذہنیت رکھنے کی وجہ سے اپنی ہی سوسائٹی میں اجنبی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں طبقوں میں اظہار خیالات کے لئے کوئی رابطہ باقی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ قومی لیڈر مستعار لئے ہوئے سیاسی اداروں میں وہ ضروری تبدیلیاں کیسے کریں جو عوام کے سماجی و روایتی شعور اور مقامی ضرورتوں کے پیش نظر ضروری ہیں۔

جہاں اظہار خیال کے راستے یوں مسدود ہوں اور حاکم و محکوم ایک دوسرے کے لئے اس طرح اجنبی ہوں وہاں حکومت صحیح معنوں میں آباد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ صحیح قومیت کے اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ قومی شعور برقرار رکھنے کے لئے ایشیائی قومیت نے غلط وعدے کئے اور نفرت کے جذبہ کو ہوا دی اس نے قومی ذمہ داری کے احساس کو کمزور کر دیا جس کے نتیجہ میں اظہار خیال اور سیاسی کارکردگی مضمحل ہو گئی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابھی سیاسی اداروں کی جڑیں مضبوط بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ فوج نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں نئی حکومتوں کو اقتصادی حیثیت سے زیر بار ہونا پڑا اور اپنے تمام معاشی و سماجی منصوبوں کو ترقی کی رفتار سست کرنی پڑی۔ چین میں سماجی انحطاط کا باعث فوج کی سیاسی سرگرمیاں ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی اقتصادی حالت ابتر ہونے کی وجہ بہت کچھ یہ ہے کہ دونوں میں فوجی اسلحے کی دوڑ جاری ہے۔ انڈونیشیا اور ویٹ نام میں فوج کی سیاسی سرگرمیاں اس کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں۔

معاشی حیثیت سے ایشیائی ممالک نے جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کے گٹھ جوڑ کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جس کا مغربی ممالک ایک عرصہ تک کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایشیا کے قومی لیڈروں کے ذہن میں یہ خیالات غیر قومی حکومتوں کے استحصال سے وابستہ رہے ہیں۔ اس لئے ایشیا میں معاشی و سماجی پالیسی میں سوشلزم یا تعریفاً سوشلسٹ نظریہ کی طرف ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ جمہوری سرمایہ داری کو رد کر کے "جمہوری سوشلزم" کو اختیار کرنے کی خواہش رکھتے ہوں مشکل در اصل یہ ہے کہ ذہنوں میں ابھی تک سوشلزم ہی کی تعریف صاف نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشی و سماجی پالیسی انفرادی و ریاستی انٹر پرائز کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی ہے۔

بدیسی حکومت کے خلاف ایشیا میں قومی یکجہتی برقرار رکھنے کے لئے "خود پسندی" اور "خود شناسی" ضروری تھی لیکن حصول آزادی کے بعد ایشیائی قومیت کی "خودی" میں انتہا پسندی نے مختلف طبقاتی عوامل کی ہم آہنگی کو ختم کر دیا۔ اس طرح قومی انقلاب کے وقت جو خصوصیت یکجہتی کا باعث تھی وہ

اب تفریق کا باعث ہو گئی۔ اس کی وجہ سے "ملیوول" سوسائٹی کے تمام مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اور اکثریت اقلیت کی کشمکش شروع ہو گئی۔ آج ایشیا کی قومیت کے سامنے یہ بنیادی مسئلہ ہے اس وجہ سے نہیں کہ اور تمام مسائل اسی سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان مسائل کی موجودگی میں اکثریتیں ہونے لگتا ہے کہ ایشیائی ملکوں کو قومی مملکت بھی سمجھا جائے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ملیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں چینی، لنکا میں سنہالی، ہندوستان میں ناگا، برما میں Karen اور Shan اور انڈونیشیا میں اہل جاوہ ایسے ہیں جو ان ممالک میں خود مختار رہنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان مطالبات کی شدت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایشیا کی مملکتیں آگے چل کر چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹ جائیں گی بالکل اسی طرح جس طرح سے عہد وسطیٰ کے یورپ نے اپنے مقامی مطالبات کی تسکین کے لئے اپنے کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے پر مجبور پایا۔ بنگال صوبہ کا خود رائے دہندگی اور مرکز سے آزادی کا مطالبہ اور پنجاب اور سرحد صوبوں کے درمیان تقسیم دراصل اسی رجحان کے ابتدائی مظہر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اقتصادی منصوبہ بندی اور قومیت کے درمیان گہرا تعلق پیدا ہو جانے سے شاید یہ مرکز گریز کا رجحان رک جائے لیکن یہ امید موہوم ہے۔ بہر حال ایشیا کی قومیت کے سامنے جو سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کرنے میں دقتیں ہیں وہ دراصل خارجی نہیں بلکہ داخلی ہیں۔ وہ ہمارے ذہن، اسپرٹ اور رجحان کی دقتیں ہیں جس کی وجہ سے ہم کبھی پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی آگے بڑھتے ہیں۔ اس طرح ہم رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

۳

عربوں کی قومیت کا سرچشمہ ایک عرصہ تک انگلستان اور فرانس رہے لیکن بعد میں دونوں سے رنجشیں پیدا ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے مینڈیٹ ختم کر کے سیریا اور لبنان کو آزادیاں تو دیں لیکن اور انگلستان نے اسرائیلیوں کو فلسطین میں بسا کر ایک نئی ریاست کی بنا ڈالی۔ اس کے بعد ہی عربوں کی قومیت کا واحد مقصد مغربی طاقتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہاشمی خاندان کے افراد دولت عثمانیہ کے خلاف قومی انقلاب میں حصہ لے کر مغربی طاقتوں کا قرب حاصل

کرتے تھے۔ لیکن آج کے قومی رہنماؤں میں صدر ناصر کی حیثیت نمبر اول کی ہے مغربی طاقتوں کے سخت مخالف ہو گئے اور ان کا مقصد عرب سوسائٹی کی ازسرِ نو تشکیل ہو گیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کی دلچسپی کی وجہ صرف تیل نہیں ہے بلکہ اس کی جغرافیائی حیثیت بھی ہے۔ مغربی طاقتوں کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ نقشہ میں کہاں ہے اس کے بعد یہ اہم ہے کہ اس کے ریگستانوں کی تہہ میں کیا ہے۔ چنانچہ عدن کی نو آبادیات، خلیج فارس سے برطانیہ کا معاہدہ اور کویت سے اس کی دلچسپی کی وجہ "ارضیاتی" اور "جیوپولیٹیکل" دونوں ہیں، جس کی سخت مخالفت سعودی عرب اور عراق کر رہے ہیں۔

لیکن عرب قومیت کی انفرادیت مغربی ممالک کی مخالفت میں نہیں بلکہ اس کو آپسی جھگڑوں میں استعمال کرنے میں مضمر ہے۔ مثال کے طور پر ایران میں ڈاکٹر مصدق کا برسرِ اقتدار آنا بھی قومیت اور ۱۹۵۳ء میں ان کا معزول ہونا بھی۔ اسی طرح ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان عراق کے صدر جنرل قاسم کا برسرِ اقتدار اور معزول ہونا قومیت ہی کی کرشمہ سازی سمجھی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد شام کے ہر انقلاب کو قومی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں یمن کا ریپبلکن انقلاب بھی قومی اور اس کے ردِ عمل میں شاہی انقلاب بھی قومی کہلاتا ہے۔ برطانیہ کے خلاف صدر ناصر کی کارکردگی کو بھی قومیت کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں شرقِ اردن کے بادشاہ نے عرب لیجن سے جنرل گلب کو علیحدہ کر دیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اردن کے بادشاہ کا ناصر کے حامیوں کے خلاف اقدام بھی "قومیت" کہلاتا ہے کیونکہ اس نے جارڈن کو متحد کیا اور تقسیم ہونے سے بچا لیا۔

آپس کی ان نا اتفاقیوں کی وجہ محض سیاسی نہیں بلکہ معاشی بھی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو معاشی حیثیت سے دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے وہ امیر ممالک جن کے پاس تیل کے ذخیرے ہیں اور باقی وہ غریب ممالک جو اس دولت سے محروم ہیں۔ جب بھی کبھی عرب یکجہتی کو بامعنی بنانے کی بات آتی ہے امیر ممالک یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی تیل کی دولت میں غریب ممالک کو بھی شریک کرنا پڑے گا جس کے لئے وہ آمادہ نہیں ہیں۔ انھیں معاشی مقاصد کی حفاظت میں وہ

عرب اتحاد کے بجائے موجودہ سیاسی سرحدوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ عرب یونین بن جانے کے بعد چاہے سیاسی سرحدیں جوں کی توں باقی رہیں لیکن معاشی سرحدیں ضرور ٹوٹ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ پان عرب سیاسی یونین کا مطالبہ شدت سے ان ممالک کی طرف سے آتا ہے جو غریب اور تیل کی دولت سے محروم ہیں جیسے مصر، سیریا اور یمن اور اس تجویز کی مخالفت وہ امیر ممالک کرتے ہیں جن کے یہاں تیل کے ذخیرے ہیں جیسے سعودی عربیہ، عراق، کویت اور خلیج فارس۔ اسلامی برادری اور تہذیبی وحدت کی ہم آہنگی کی بات صرف زبانی کی جاتی ہے ورنہ مشرق وسطیٰ کا معاشی طبقہ موجودہ ریاستی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا سخت مخالف ہے کیونکہ یہی سرحدیں تو اس طبقہ کی تجارتی اجارہ داری کو قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس طرح عرب قومیت کا وجود ایک جذباتی محرک کا ہے جو بحیثیت محرک تو رہے گا لیکن اٹلانٹک سے لے کر خلیج فارس تک اس جذبے کو کوئی سیاسی حقیقت سمجھنا یا اس کی امید کرنا محض خیالِ خام ہے۔

۴

کہا جاتا ہے کہ قومی مملکتوں کی سرحدیں خود یکساں مملکت مقرر کرتے ہیں۔ کسی اور طرح سے ان کا تعین غیر فطری ہوتا ہے اس اصول پر افریقہ کی کسی مملکت کو قومی مملکت نہیں کہا جا سکتا۔ افریقہ میں فطری سرحدیں قبیلوں کی ہیں جبکہ مملکت کی سرحدیں بدیسی حکومت کی بنائی ہوئی ہیں۔ یوروپ کی نوآبادیاتی طاقتوں نے فطری قبائلی سرحدوں کا خیال کئے بغیر افریقہ کو اپنی مصلحت کے مطابق بانٹ لیا۔ اب جبکہ یہی آزاد مملکتوں کی سرحدیں قرار پا چکی ہیں اس سے 'مل' کے قول کی تصدیق نہیں ہوتی کہ "ملکوں کی سرحدیں قوموں کے اعتبار سے ہونی چاہئیں"۔

قومی مملکتوں کی تشکیل میں انفرادی وفاداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ افریقہ میں مشکل یہ ہے کہ جن اکائیوں سے یہ وفاداری وابستہ ہے وہ یا تو قومی مملکتوں سے بہت چھوٹی ہیں یا بہت بڑی۔ محدود وابستگی قبیلہ کے ساتھ ہے جس کو قومی مملکت کا مرتبہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا سیاسی وسماجی رقبہ مملکت سے بہت چھوٹا ہے۔ وسیع وابستگی پان افریقی تصور کے ساتھ ہے جس میں کئی سیاسی وسماجی اکائیوں کا وجود قومی مملکت کی تشکیل میں حائل ہے۔ افریقہ کے سامنے یہی دو بڑی دشواریاں ہیں۔ ایک طرف

تو ملکی سرحدیں غیر فطری اور دوسری طرف انفرادی وفاداری چھوٹی وبڑی اکائیوں میں تقسیم جن میں سے کسی پر بھی قومی مملکت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

حصول آزادی کے بعد افریقہ قبائلی جھگڑوں کا شکار ہو گیا جس میں طاقت و اختیار کی دوڑ شروع ہو گئی اور سب ہی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے یا حاوی ہو جانے کے منصوبے بنانے لگے۔ ایک قبیلہ جس کو دوسرے قبیلے اپنے سے کمتر سمجھتے تھے، وہ آزادی کے بعد ترقی کی دوڑ میں آگے نکل گیا۔ گولڈ کوسٹ میں آشانتی قبیلہ سرحدی نسلوں کو اسی نظر سے دیکھتا تھا لیکن نکرومہ کی قیادت میں سرحدی قبائل حصول آزادی کے بعد آگے بڑھ گئے اور انھوں نے گولڈ کوسٹ میں (جس کا آزادی کے بعد نام گھانا ہو گیا ہے) اپنے لئے ایک مخصوص مقام حاصل کر لیا جو دوسرے نسلوں کے لئے باعث رشک ہو گیا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں کے وجود کی مخالفت اسی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ ان کی بنیادیں قبائلی ہیں اور یہ افریقہ کی مملکتوں کو قبائلی بنیادوں پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر رکھ دیں گی۔ کہا جاتا ہے کہ افریقہ کی موجودہ سوسائٹی میں اگر "ملٹی پارٹی سسٹم" کو جگہ دے دی جائے تو اس سے تقسیم کار مرکز گریز عناصر کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ لیکن سوسائٹی کی اسی خصوصیت کی وجہ سے کسی ایک پارٹی کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر عوام تک پہونچنے اور ان سے کوئی رابطہ قائم رکھنا ہے تو سب سے موثر ذریعہ وہی قبیلے ہیں۔ افریقہ کی تاریخ اور افریقہ کی روایات کو قومی رنگ دے کر قبائلی تفریق کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس سے قومی شعور ابھرنے کے بجائے قبائلی (خوشگوار یا ناخوشگوار) تعلقات کا تصور ابھرتا ہے۔ افریقہ کے لئے یہ قبیلے ایک تخریب کی علامت بن چکے ہیں اور جب تک ان کو ختم نہ کر دیا جائے قومی مملکت کا وجود ناممکن ہے۔ اس مسئلے کو دو طرح سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلا حل یہ ہے کہ قبیلوں کے اعتبار سے قومی مملکتیں بنا دی جائیں جیسا کہ نائجیریا میں دیکھتے ہیں جہاں ملکی اور قبائلی سرحدیں ایک ہیں۔ لیکن یہ حل صرف وہیں کارگر ہو سکتا ہے جہاں قبیلے خود اتنے بڑے ہوں کہ ان پر مملکت کا اطلاق ہو سکے۔ دوسرا حل یہ ہے کہ قبائلی وجود کو ختم کر کے سوسائٹی میں ایک قومی تصور پیدا کیا جائے۔ یہی طریقہ اکثر ملکوں نے اختیار کیا ہے لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود قبیلوں

کا وجود باقی ہے اور اس لحاظ سے افریقہ کا ہر چھوٹا بڑا، وحدانی و وفاقی ملک اپنے اندر ایک "کٹانگا" سمائے ہوئے ہیں۔

پان افریقی تصور یورپ کے اس پورے رویہ کے خلاف ایک ردِّ عمل ہے جو اس نے ماضی میں افریقہ کے ساتھ روا رکھا۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ایک نسلی تعصب کی پیداوار ہے جس کا مقصد سیاہ فام قوموں کی برتری قائم کرنا ہے۔ دوسرے پان افریقی تصور کا ایک وسیع نظریہ پیش کرتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق یہ نسلی تعصب سے بالاتر ہر اس شخص کے لئے ہے جو افریقہ میں پیدا ہوا ہو اور وہاں کا باشندہ ہو۔ کچھ کا نظریہ ہے کہ افریقہ کی معاشی ترقی اور اس کے اتحاد کے لئے یہ تصور بہت ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افریقہ کی قومیت نہ صرف یہ کہ بے معنی بلکہ خطرناک ہو جائے اگر اس کو پان افریقی تصور سے وابستہ نہ کر دیا جائے۔ ۱۹۵۹ء میں نکرومہ نے گھانا کی دسویں سالگرہ کے موقع پر کہا تھا کہ "آج سے کوئی شخص اپنے آپ کو فانٹی، آشانتی، ایو، گا اور ڈوگماس نہ سمجھے وہ سب اپنے آپ کو اہلِ گھانا سمجھیں۔" یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ گھانا ملک کے قومی تصور کو مضبوط کرنے کے لئے ایسا نہیں کہہ رہے تھے بلکہ جیسا کہ انھوں نے خود آگے چل کر واضح کیا کہ "اس سے وہ انسانی ذہن کو قبائلی تنگ نظری سے آزاد کرا کے ایسی وسیع النظری پیدا کرانا چاہتے ہیں جو پان افریقی تصور کا نصب العین ہے۔" اسی پان افریقی تصور کے پیش نظر افریقہ کے باشندے اپنے آپ کو کسی ذاتی ملک کے بجائے پورے افریقہ سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ افریقی شخصیت، افریقی تاریخ، افریقی تہذیب، افریقی سوشلزم، افریقی جمہوریت اور سول سروس کا گلدستہ افریقی سانچے کا تصور ان چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں کیا ہی نہیں جا سکتا جو یورپ کے تسلط کی دین ہیں۔

اس وقت افریقہ کی قومیت ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہے۔ اگر چھوٹی مملکتوں کو گھٹا کر قبیلوں کے مطابق کر دیا جائے تو اس سے قبائلی جھگڑے اور اس سے پیدا شدہ نقصانات سے تو نجات مل جائے گی لیکن موجودہ قومی مملکتوں کا تصور باقی نہیں رہے گا۔ دوسری طرف اگر پورے افریقی براعظم کو پان افریقی تصور کے تحت ایک اکائی مان لیا جائے تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا اتنے بڑے علاقہ اور

اس میں بسنے والے اتنے مختلف باشندوں پر ایک قومی مملکت کا اطلاق ہو سکتا ہے ؟ یورپ خود اس کشمکش سے گزر چکا ہے۔ ایک طرف رومن امپائر کا آفاقی تصور تھا اور دوسری طرف جاگیرداری کا مقامی تصور۔ لیکن ان میں سے کوئی قومی مملکت کی شکل اختیار نہ کر سکا تھا۔ علاقائی مملکتوں کے قیام نے اس کشمکش سے نجات دلائی کیونکہ یہ اکائی ایسی تھی جو جاگیرداری سے بڑی اور رومن امپائر کے آفاقی تصور سے چھوٹی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسے قبائلی اور پان افریقی تصور سے پیدا شدہ مشکلات کے حل کے لئے افریقہ کو بھی یورپ کی طرح کسی علاقائی مملکت کے قیام کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

۵

تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ایک زمانہ تک خاندان، گاؤں، قبیلہ اور ذات پات تک محدود رہی۔ اگرچہ قومیت پوری انسانی برادری کو اپنے اندر سمو لینے میں ناکامیاب رہی لیکن اس سے انسان کی اجتماعی زندگی کم از کم ایک محدود دائرے سے نکل کر قومی مملکت کے وسیع دائرے تک ضرور پہونچ گئی۔ قومی مملکتیں اپنی ارتقاء سے لے کر آج تک تین مرحلوں سے گزر رہی ہیں۔

پہلی منزل خالص قومیت کی منزل ہے۔ اس منزل میں قومیت کا مقصد تسلیم شدہ جغرافیائی حدود میں اقتدار اعلیٰ کے ساتھ آزادی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس ابتدائی منزل کی قومیت کو "اجتماعی خود غرضی" کا نام دیا گیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کو آپ "اجتماعی تعلق خاطر" کہہ لیجئے۔ اس منزل کی قومیت میں خودی کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنی تہذیب اور اپنے طریقہ زندگی کو مکمل اور صحیح سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کی تہذیب اور طریقۂ زندگی سے نفرت پیدا کر کے اس کو مضبوط بنایا جاتا ہے۔

قومیت کی دوسری منزل "اجتماعی تحفظ" کی منزل ہے۔ یہ منزل اس وقت آتی ہے جب قومی مملکتوں کو یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی بقا کے لئے "پہلے" "اس" اور دوسرے جو لازم و ملزوم ہیں اور ان کے حصول کے لئے ایک دوسرے کی امداد ضروری ہے۔ یہاں پہونچ کر پہلی منزل کی "خالص خود غرضی" "مصلحت اندیشی" میں بدل جاتی ہے۔ قومی مملکتوں کو اپنی بقا کے لئے اپنا وجود حقیر یا ناکافی معلوم ہونے لگتا ہے اگرچہ جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ اسی قومی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے

جو پہلی منزل کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس منزل میں آکر وطن پرستی کا جذبہ اگرچہ غیر ضروری نہیں سمجھا جاتا لیکن ثانوی ضرور سمجھا جاتا ہے۔

تیسری منزل بین الاقوامیت کی منزل ہے جس کے سامنے قومی ضرورت دب جاتی ہے کیونکہ اس کا منصب العین انسانیت ہوجاتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر انسانی ضرورتوں کو قومی سرحدوں میں بانٹ کر نہیں پورا کیا جاتا۔ جیسا کہ اب تک قومی ریاستیں پورا کرتی رہی ہیں یا ان سے بھی پہلے شہری ریاستیں پورا کیا کرتی تھیں۔ یہ منزل پورے طور پر حاصل نہیں کی جا سکی ہے اور نہ اس وقت تک حاصل ہو سکے گی جب تک فوجی طاقت کو کسی بین الاقوامی ادارے کے سپرد نہ کر دیا جائے اور مملکتیں یہ خیال نہ ترک کر دیں کہ اقتصادی نظریہ و پالیسی طے کرنا ان کے اقتدار اعلیٰ میں شامل ہے۔ ایسا ہونے کے بعد تہذیبی اکائی کو سیاسی اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی جس کی وجہ سے وہ دوسری اکائیوں کے برسرپیکار رہا کرتی ہے۔ اسی صورت میں تقسیم کار عناصر کی اصل وجہ ختم کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے بین الاقوامیت کی منزل تک رسائی مشکل ہے۔ لیکن مملکتوں میں عام رجحان قومیت کی اسی تیسری منزل کی طرف پایا جاتا ہے۔ "یونیسکو" نے انسانی تہذیب کی آفاقیت، سائنس کی لامحدود وسعت اور نفرت و رنجش سے پاک تعلیم پر زور دیا ہے۔ یہ اصول محض غیر قومی نہیں بلکہ مکمل طور پر بین الاقوامی ہیں۔ انھیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا دھیرے دھیرے بین الاقوامی نظریہ کی طرف گامزن ہے۔

آج دنیا کی مملکتوں میں توازن باقی نہیں ہے کیونکہ یہ قومیت کی مختلف منزلوں سے گزر رہی ہیں اور منزلوں کے اختلاف کے باوجود بہرحال سب ہی کو مل جل کے رہنا ہے۔ اگرچہ پندرھویں صدی میں یورپ، ایشیا اور امریکہ اور اٹھارویں صدی میں برطانیہ اور جاپان مختلف منزلوں میں تھے لیکن چونکہ رسل و رسائل کی کمی تھی اس لئے ایک دوسرے سے اجنبی تھے اور ان اختلافات کا کوئی احساس نہ پیدا ہوا تھا لیکن آج یہ بات آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک جبکہ قومیت کی تیسری منزل میں داخل ہو رہے ہیں ایشیا اور لیٹین امریکہ کے بہت سے ممالک ابھی دوسری منزل اور افریقہ پہلی ہی منزل میں ہے۔ مسئلہ اور بھی

پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مرحلوں کو تسلسل کے ساتھ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ہی ملک جو بین الاقوامی نظریہ کا حامل ہے کچھ مسئلوں میں روایتی قوم پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے انسانیت کے لئے بین الاقوامی وفاداری پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "انسانی نسل ایک ہے۔ یہ کہنا محض طرز بیان نہیں ایک تاریخی حقیقت کی جانب اشارہ ہے۔" ایک دوسری تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ "آج بیسویں صدی کا انسان جبکہ کائنات کے راز افشا کر رہا ہے اُس کو دنیا کے کسی گوشے میں محض اس وجہ سے محصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اتفاق سے وہاں پیدا ہوا تھا۔ ہماری حقیقی قومیت انسانی نسل ہے اور ہمارا گھر یہ دنیا۔" اس لحاظ سے ہندوستان کا نقطۂ نظر بین الاقوامی قرار پاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہندستان کے سیاسی فیصلے خالص قومی ہیں۔ کیرالا میں کمیونسٹوں کی گرفتاری جماعتی کونسل میں پاکستان کی کشمیر میں بے جا مداخلت کے خلاف ہندستان کا احتجاج۔ ہندوستان کے وزیر دفاع کا اعلان کہ ہندوستان چین یا پاکستان کی طرف سے ہونے والے ہر حملہ کے لئے تیار ہے۔ مغربی جرمنی، کناڈا اور ایران کے خلاف ہندوستان کا سخت احتجاج کہ یہ ممالک پاکستان کو سیبر جیٹ اور دوسرے فوجی ساز و سامان فراہم کر کے ہندستان کے امن کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ ہندوستان کا ایک اقدام سابق صدر کے الفاظ میں "بین الاقوامی" ہے جبکہ دوسرا اقدام خالص "قومی" ہے۔ ایک اقدام "پر امید" ہے تو دوسرا ایسی خالص "حقیقت" جس سے کوئی ملک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قومیت کی دونوں منزلیں بیک وقت ایک ہی ملک، ایک ہی زمانہ اور ایک ہی نسل میں پائی جاتی ہیں۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ آفاقیت قومیت کو کسی منزل میں پہونچ کر اپنے میں جذب کر لے گی۔ یوروپین کمیونٹی۔ پان افریقی۔ پان عرب اور کمیونسٹ تحریکیں عالمی ریاست کی طرف ہماری رہنمائی کر رہی ہیں۔ لیکن یہ سب قبل از وقت امیدیں اور آرزومندانہ خواہشات ہیں۔ یہ بڑی اکائیاں اگرچہ مافوق لاقومیت کا درجہ رکھتی ہیں لیکن دراصل ایک دوسرے کے خلاف منظم کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ اعتماد سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب ہماری رہنمائی بین الاقوامیت کی طرف کریں گی۔ اس کے

علاوہ ابھی خود قومیت کی منزلوں کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ کوئی بھی ملک اپنی تمام کج ادائیوں کو چھوڑ کر چشم زدن میں ایک منزل سے دوسری اور دوسری سے تیسری منزل میں نہیں پہونچ سکتا۔ جب تک قومیت کی منزلوں کے درمیان یہ "فاصلے" موجود ہیں عالمی یکجہتی ناممکن ہے۔ اس لئے قومیت ہی انسانی برادری کی سماجی توسیع کا واحد وسیلہ رہے گی ۔

سلام مچھلی شہری

غزل

اُسے بھی اپنے مسائل میں مبتلا نہ کرو
اُداس ہو تو کسی دوست سے ملا نہ کرو

کلی کھِلے گی، ستارے ضرور چمکیں گے
یہ اور بات کہ تم شکریہ ادا نہ کرو

مجھے تو اتنے پریشان، اتنے افسردہ
چراغ بن کے کہا تھا، کبھی چلا نہ کرو

گُنہ کی راہ میں۔ اک روشنی کا موڑ بھی ہے
مرے لیے ابھی اے دوستو! دعا نہ کرو

جو حُسن کار ہو۔ ساری فضا تمھاری ہے
اگر نہیں ہو تو پھر شکوۂ فضا نہ کرو

نئے رفیقو! مرے حال پر ترس کھا کر
ابھی سے ترکِ تعلق کی ابتدا نہ کرو

یہ کم نہیں ہے کہ اس دور میں بھی زندہ ہو
سلام! صورتِ حالات کا گلا نہ کرو

عبدالحلیم ندوی

عربی ادب میں افسانہ نگاری

رُومان پسند مکتب فکر

(۲)

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ منفلوطی اپنی ان کہانیوں کے ذریعہ معاشرہ کی دکھتی رگ پر اپنے مخصوص طریقے سے انگلی رکھ رہے تھے ایک دوسرا ادیب بھی بالکل انھیں کے نہج پر بالکل یہی کام کر رہا تھا اور وہ تھا جبران خلیل جبران۔

بہت سے لوگوں کو شاید یہ بات عجیب سی لگے کہ میں نے جبران خلیل جبران کو جو شاید عربی میں ترقی پسند ادیبوں کے ہیرو اور قابل تقلید ادیب سمجھے جاتے ہیں بظاہر ایک مذہبی خیالات رکھنے والے اور مشرقی تہذیب وتمدن کے خوگر ادیب کے ساتھ ملا دیا ہے اور دونوں کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا ہے مگر کیا کیجئے کہ حقیقت یہی کچھ کہتی ہے۔

جبران لبنان کے ایک گاؤں میں ایک غریب گھرانے میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں انتقال کر گئے۔ باپ کا سایہ سر سے بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا۔ ماحول ایسا تھا کہ جہاں بقول میخائیل نعیمہ "مارونی عیسائی، اور تھوڈکس عیسائی تاجر سے تیل تک نہیں خرید سکتا تھا"[۱] لبنان میں اس وقت عیسائی پروہتوں اور زمینداروں کا راج تھا۔ دینی معاملات میں پادریوں کی بات حرف آخر اور دنیاوی معاملات میں زمینداروں کا حکم قانون اور دستور تھا، جس سے سرتابی کرنے والا گردن زدنی تھا۔ ان دو پاٹوں

---

(۱) مقدمہ میخائیل نعیمہ لمؤلفات جبران

کے بیچ میں لبنانی قوم بڑی مصیبت، فقر و فاقہ اور تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مارونی عیسائیوں کے بہت سے خاندان اس دوطرفہ مصیبت کی تاب نہ لاکر امریکہ، برازیل اور میکسکو کے شہروں میں ہجرت کر گئے تھے۔ انھیں خاندانوں میں جبران کا خاندان بھی تھا جو ۱۸۹۵ء میں امریکہ پہنچا اس وقت جبران کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ اس خاندان نے امریکہ کے شہر باسٹن میں ایک زمانے تک بڑی تنگدستی اور فقر فاقہ کی زندگی گزاری۔ ان کی بڑی بہن ماریانا محلے ٹولے کے لوگوں کے کپڑے سی کر گزر بسر کرنے کے لئے چند سکے کما لیتی تھیں۔ چنانچہ جبران نے ایک دن بڑے درد سے ان سے کہا کہ "تمھاری سوئی میری آنکھوں کو اندھی اور تمھارا تاگا میرے گلے میں پھانسی کا پھندا معلوم ہوتا ہے"۔ جبران خلیل جبران نے اس تکلیف دہ ماحول اور ناساعد حالات میں پرورش پائی تھی طبیعت حساس تھی چنانچہ ان سارے واقعات نے دل پر وہ گہری چھاپ ڈالی جو رہتی عمر تک نہ مٹی اور جوں جوں وہ بڑھتے گئے دین و دنیا کے ٹھیکیداروں کے خلاف ان کا جذبۂ انتقام پروان چڑھتا گیا اور جب گوش و ہوش کی آنکھیں کھلیں تو یہ طے کر لیا کہ ان دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے اور اس مشن کو کامیاب بنا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں اکثر انھیں دونوں یعنی دین و دنیا کے ناقص علمبرداروں کی برائیوں، مظالم اور بدکرداریوں کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ دوسری برائی جو اس زمانہ میں لبنانی متوسط خاندانوں میں بری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تھی لڑکیوں کی بغیر ان کی مرضی کے بے جوڑ شادی، جس سے نہ معلوم کتنے خاندان تباہ ہوئے اور کتنے معصوم اور بے گناہ بچے ماں باپ کے جیتے جی یتیم ہو گئے۔ جبران نے اس زخم پر بہت تیز نشتر لگائے ہیں[۱]

آئیے اب جبران کی کہانیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان کا انداز فکر، طرز نگارش اور مرکزی خیال کیا ہے اور کہاں تک وہ ان میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

جبران نے سب سے زیادہ لڑکی سے بغیر پوچھے اور اس کی مرضی کے خلاف زبردستی شادی کر دینے پر قلم اٹھایا ہے اور اتنی شدومد اور اپنے فن کی پوری قوت سے اس مسئلہ پر لکھا ہے کہ اس کی مثال کسی اور ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ اور یہ اس وجہ سے کہ وہ خود بھی اس برائی کے کشتہ ہیں۔ ان کو سلمی کرامہ سے شدید محبت تھی اور سلمی کو بھی ان سے شدید لگاؤ تھا۔ سلمی سے ان کی شادی کی بات چیت طے ہو چکی

۱۔ مقدمہ میخائیل نعیمہ لمؤلفات جبران

تھی لیکن مطران نے سلمیٰ کو اپنے بھتیجے سے شادی کرنے پر مجبور کیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو سلمیٰ نے شادی کر لی لیکن اس غم میں جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔ اس واقعہ کی چوٹ جبران کے دل پر اتنی کاری لگی کہ ساری عمر اس سے خون رستا رہا اور ان کی کہانیوں کی شکل میں دنیا کے سامنے اس ظلم وجور کی خون چکاں کہانی کو دہراتا رہا۔ اس کی بہترین مثال ان کی کہانی "وردۃ الہانی" "مضجع العروس" اور "مرتا البانیہ" ہیں[۱]۔

ان کہانیوں میں انھوں نے جبری شادی اور اس کے مہلک انجام پر بڑے درد اور تاثر سے قلم اٹھایا ہے اور چونکہ خود اس مہلک بیماری کا شکار ہیں اس لئے جو کچھ لکھا ہے حقیقت میں ڈوب کر اور کرب والم کی ایسی آمیزش کے ساتھ کہ سنگدل سے سنگدل آدمی کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں اسی طرح نوجوانوں کی اخلاقی پستی اور کم ہمتی کو بھی بڑے پراثر انداز سے نمایاں کیا ہے جو سادہ لوح سیدھی سادی لڑکیوں سے محبت وعشق کی پینگ بڑھا کر اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد انھیں بے عزتی، بدنامی اور گمنامی کے تاریک گڑھے میں ڈال کر کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی کہانی "مرتا البانیہ" اس اس خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

"وردۃ الہانی[۲]" میں جبران نے جبری شادی کی برائی اور اس کے انجام پر بڑے موثر طریقے سے قلم اٹھایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک دوشیزہ کی شادی ۱۸ سال کی عمر میں گھر والے ایک بوڑھے رئیس سے کر دیتے ہیں۔ بوڑھا شوہر نوجوان بیوی کے دل کو موہ لینے کے لئے اسے گہنوں اور زیورات سے لاد دیتا ہے کمخواب و دیبا میں لپیٹ دیتا ہے۔ گلے کلائی کو مرصع زیورات اور سر کو ہیرے جواہرات کے تاج سے مزین کر دیتا ہے۔ ناز ونعم کا ہر سامان اس کے قدموں پر لاکر ڈھیر کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نوجوان بیوی کا دل اس کی طرف مائل نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک چڑیا کی طرح محسوس کرتی ہے جسے سونے کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے .... اور ایک دن وہ اپنے خواب غفلت سے جاگتی

۱۔ جورج صدح : أُدَبَاءُ وَأُدَبَاءُ نَا فِی المهاجر الامیریکیۃ

۲۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

ہے۔ دیکھتی ہے کہ وہ سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے۔۔۔۔ پھڑپھڑاتی ہے۔ ناگہاں اس کی نظر ایک مفلوک الحال نوجوان پر پڑتی ہے جو بڑا سجیلا طرحدار اور زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ سیم وزر کی جگہ اپنی کتابوں اور مسودوں کے درمیان ایک معمولی سے گھر میں رہتا ہے مگر وہ اپنے شوہر کی کوٹھی، اس کا مال دولت چھوڑ کر اس غریب نوجوان کے ساتھ رہنے لگتی ہے خواہ معاشرہ اس کو اس فعل پر مورد الزام ٹھہرائے اسے دین کے ٹھیکیدار گردن زدنی ٹھہرائیں یا خاندان اور قبیلہ کی ناک کٹے، جائے مگر اس کو اس سے کیا اس نے جس کو چاہا۔ جس سے اس کا دل لگا اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع مل گیا اور یہی زندگی کا سب سے بڑا لطف اور حاصل عمر ہے۔ ؎

دل کو تو مل گئی اماں سایۂ زلف یار میں

وردہ اپنا سارا واقعہ کہانی کے راوی کو اپنی زبان سے سناتی ہے اور مردوں اور معاشرہ کے خلاف خوب زہر اگلتی ہے۔ اپنی رام کہانی ختم کر لینے کے بعد قصہ کے راوی کو لے کر اپنی لڑکی کی طرف جاتی ہے اور اسے کھول کر سامنے کی شاندار حسین وجمیل کوٹھیاں جن میں عیش وعشرت کے سارے سامان مہیا ہیں دکھاتی ہے۔ اس کے بعد ان کے اندر کی زندگی کا نقشہ کھینچتی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کوٹھیوں میں رہنے والے بوڑھے وزراء وامراء نوخیز حسین وجمیل لڑکیوں سے عشق کا اظہار کر کے انھیں ان جنت نظیر کوٹھیوں میں لے آتے ہیں مگر جسمانی اور جنسی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنا دل دوسری بازاری عورتوں سے بہلاتے ہیں اور ان کی نوجوان حسین بیویاں دوسرے حسین نوجوان مردوں سے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی کمزوری معلوم ہے اس لئے ہر ایک دوسرے کی غلطی جانتے ہوئے بھی چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔

میخائیل نعیمہ نے اس کہانی پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"السیدۃ وردۃ" جبران کی ایک ایسی کہانی ہے جو شادی بیاہ کے سلسلے کی روایتوں پر مبتلا لوگوں کی ایک پختہ بنیاد ہی نہیں سکتی ہے۔ اگر ہم اس تخلیق کو افسانہ کہیں یا اس میں اس ظلم وجور سے نکلنے کا راستہ یا حل تلاش کرنے لگیں تو یہ مفردات پر ایسی چیز لاد دینے کے مرادف ہوگا جو ان کے بس سے باہر ہو کیونکہ کہانی شروع سے آخر تک ایک مظلوم عورت کی چیخ اور شکایت ہے۔

لیکن اس شکوہ اور اس پکار میں جبران نے اپنی پوری فنی صلاحیت اپنا بھرپور جوش، اپنا حسین پیرایہ بیان، اپنا پورا زور قلم اور دل دردمند کا پورا خلوص سمو دیا ہے[1]۔"

اس کہانی کے لکھنے سے جبران کا مقصد یہ ہے کہ وہ قاری کے سامنے ازدواجی تعلقات سے متعلق اپنی رائے پوری وضاحت اور صفائی سے پیش کریں اور یہ بتائیں کہ معاشرہ میں جبری شادی کی جو خرابی پیدا ہوگئی ہے اس کا انجام کتنا ہولناک اور ہوشربا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار "وردۃ الہانی" کی زبان سے جو طویل خطبہ دلایا ہے (وردۃ الہانی اپنا سارا قصہ کہانی کے راوی سے اپنی زبان سے بیان کرتی ہے) اس طرح کرتے ہیں:

"یہ مرد جو عالم ابدی سے آتے ہیں اور پھر اسی میں زندگی کا حقیقی مزہ چکھنے سے پہلے واپس چلے جاتے ہیں اس عورت کے دل کا درد اور رادوہ نہانی سمجھ ہی نہیں سکتے جسے وہ اس وقت محسوس کرتی ہے جب اپنے آپ کو دو مردوں کے درمیان پاتی ہے۔ ایک تو وہ جسے وہ آسماں کی مرضی اور اس کے ایما سے چاہتی ہے اور دوسرا وہ جس سے وہ زمینی شریعت کے مطابق صرف چپکا دی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی دردناک کہانی ہے جو عورت کے خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہے۔ مرد اسے ہنستے ہوئے پڑھتا ہے اس لئے کہ وہ اسے سمجھتا ہی نہیں اور اگر سمجھ گیا تو اس کا قہقہہ بیہودگی (فجور) اور سنگدلی میں بدل جاتا ہے اور اپنے غیظ و غضب کا اظہار عورت کے سر پر آگ اور گندھک برسا کر کرتا ہے اور اس کے کانوں کو لعنت و ملامت اور ڈانٹ پھٹکار سے بھر دیتا ہے[2]۔"

بلاشبہ جبران اپنی اس کہانی کے ذریعہ اپنے مرکزی خیال کو بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اس ظلم کے خلاف قاری کے دل میں غم و غصہ اور انقلاب لانے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

۱۔ مقدمہ میخائیل نعیمہ مؤلفات جبران

۲۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ ص ۲۶ الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۲۲ مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیۃ۔ مصر

لیکن ایک دوسری برائی کا دروازہ بھی کھول دیا ہے جو اگر بند نہ ہو تو پھر معاشرہ صرف حسب دل خواہ جنسی لذت اندوزی کا گہوارہ بن جائے وہ یہ کہ شادی اگر اپنی مرضی سے نہیں ہوتی ہے تو پھر عورت کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ معاشرہ، دین اور رسم و رواج کے سارے بندھنوں کو توڑ کر جس سے اس کا دل اٹکے اس سے لٹک جائے۔

جبران نے اس کہانی میں بھی اور اس قسم کی دوسری کہانیوں میں بھی جس شادی کا ذکر کیا ہے وہ عام طور سے عیسائی طریقے پر کی ہوئی شادی ہے جو ایک مرتبہ ہو جانے کے بعد نہیں ٹوٹ سکتی۔ کیونکہ حضرت مسیح کا قول ہے اور اسی پر عام مسیحیوں کا اعتقاد اور عمل ہے کہ

"جس شادی کو اللہ نے کرادیا اسے پھر کوئی انسان نہیں توڑ سکتا۔"

مگر یہ برائی اسلامی معاشرہ میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہ تصور نہیں ہے کہ جس شادی کو قاضی نے کرادیا وہ رہتی عمر تک نہیں ٹوٹ سکتی بلکہ اسلام نے چند شرائط کے ساتھ عورت کو بھی حق خلع دیا ہے اور وہ ان اسباب کو اٹھا کر قاضی سے خلع کرانے کی درخواست کرسکتی ہے اور اسے اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر وردہ کی طرح کسی دوسرے کے ساتھ ناجائز طریقے پر رہنے لگے اور بیسوا اور خائنہ کا لقب پائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر آپ اس کہانی پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کہانی کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ہے۔ یعنی یہ بات صرف مذہب عیسوی کے ایک خاص طبقہ پر صادق آسکتی ہے۔ عام روشن خیال عیسائیوں اور مسلمان گھرانوں میں اس قسم کے واقعات بالکل نہیں پیش آسکتے کیونکہ اس قسم کی لڑکیوں کے لئے عدالت کے دروازے ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں "عیز کفو" یا "ناقابلِ زندگی" کے لائق نہ ہونے کی صورت میں عورت کے حق میں فیصلے ہوتے رہتے ہیں اور زن و شوہر میں قانوناً علیحدگی کرا دی جاتی ہے۔ اسی لئے عربوں میں عام ہندوستانیوں کے مقابلہ میں طلاق کے واقعات زیادہ پائے جاتے ہیں اور اب اس کو ہندوستان کے برخلاف برا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس اعتبار سے جبران کی یہ کہانی اس آفاقیت کو کھو دیتی ہے جو کہانی کو حیات جاوداں بخشتی ہے۔

امین الغریب نے کہا ہے کہ "اس عورت کو خائنہ اور فاجرہ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو

"خائن عورت" اور شوہر کے اس مفہوم کو نہیں سمجھتے جسے ہم سمجھتے ہیں۔"[1]

مین الخریب اور جبران اس معاملہ میں بالکل حق بجانب ہیں کہ اس طرح کی ظالمانہ بندشوں کو ٹوٹ جانا چاہئے کہ اس سے معاشرہ میں بہت سی ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے گھن کی طرح کھائے جاتی ہیں۔ مگر یہ اس لئے پیدا ہوئیں کہ مذہب عیسوی نے ایک ایسی پابندی عاید کر دی ہے جو عام مسلمانوں اور عربوں کے لئے پابندی نہیں رہ گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس چور کو سزا نہیں دیں گے جس نے معاشرہ کے قانون کو توڑ کر چوری کی ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس چوری کرنے میں حق بجانب ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے اس قسم کے جرائم کی اجازت دے دی خواہ مجرم اضطرار کی حالت میں ارتکاب جرم کر رہا ہو تو پھر گناہوں اور جرائم کا ایک ایسا دروازہ کھل جائے گا جو شاید کسی ترکیب سے بند ہونے میں نہ آئے گا۔ واقعاتی لحاظ سے دیکھئے تو مجھے اس میں شبہ ہے کہ کسی معاشرہ میں اور "وردۃ" جیسے خاندان میں اس قسم کا واقعہ اتنی آسانی اور اتنے چپ چاپ ہو جائے کہ نہ کسی کو اعتراض ہو اور نہ کوئی دار وگیر ہو۔ پھر شوہر اس آسانی سے اس ذلت کو برداشت کر لے اور خاص طور سے وردۃ کا شوہر جو ایک متمول، صاحب اثر، جہاندیدہ اور بارسوخ آدمی ہے جس کے ہاتھ میں دولت کے ساتھ ساتھ حکومت اور ارباب حکومت کا زور رکھی ہے۔

"مرتا البانیہ" میں جبران نے ایک یتیم لڑکی کا قصہ بڑے دردناک انداز سے لکھا ہے۔ شمالی لبنان کے چھوٹے سے گاؤں "بان" میں یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ جب گود میں تھی باپ کا اور دس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ماں کا انتقال ہو گیا۔ نیک پڑوسی نے اسے پالا پوسا اور خدمت سپرد کی گائے چرانے کی۔ وہ لبنان کی خوبصورت وادیوں میں گائے چراتے چراتے ایک حسین صحرائی پھول کی طرح کھل کر اپنے حسن وجمال کی خوشبو سے ساری وادی کو مشک بیز بنانے لگی اور ایک دن جب وہ ندی کے کنارے اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی موجوں کی ہم آغوشیوں کے منظر کا لطف اٹھا رہی تھی کہ ایک سجیلا تنومند وتندرست

۱۔ مقدمہ الارواح المتمردۃ

گھوڑ سوار ادھر سے گذرا۔ اس نے جو اس لالۂ صحرائی کو آغوش فطرت دیکھا تو ایک ہی نظر میں دل دے بیٹھا اور اسے لے کر بیروت پہنچ گیا۔ جہاں اس نے اس سے ایک عرصہ تک اپنی جنسی بھوک مٹانے اور ایک بچہ کی ماں بنانے کے بعد اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اور ایک شام کو جب قصہ کا راوی بیروت کے ایک مرکزی بازار میں گھوم رہا تھا تو ایک بچہ نے پھولوں کا ایک ہار اسے پیش کیا کہ اسے خرید لے۔ اس نے اس سے نام و پتہ پوچھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ وہ "مرتا البانیہ" کا لڑکا ہے اور اسے باپ کا نام نہیں معلوم تو راوی اس کے ساتھ مرتا البانیہ کی ٹوٹی پھوٹی کوٹھری میں پہنچا جہاں وہ بستر مرگ پر پڑی آخری گھڑیاں گن رہی ہے۔ راوی اپنا تعارف کراتا ہے اور لبنانی ہونے کے ناطے اس سے اپنے حالات بتانے کی درخواست کرتا ہے۔ مرتا اپنا سارا قصہ نوجوان کی بے وفائی سے لے کر پانچ سال تک دکھ درد سہنے کی ساری کہانی بڑے درد و اندوہ سے بیان کرتی ہے۔ اور یہ کہتے کہتے کہ "اے ہمارے آسمانوں پر رہنے والے باپ ..... تیرا نام مقدس تیرے فرشتے مقدس تیری مرضی جس طرح آسمانوں میں جاری و ساری ہے اسی طرح زمین پر بھی ہو۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے" اس کی زندگی کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں اور اس کی پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں کسی غیر مرئی شے پر جم کر رہ جاتی ہیں۔

"اور جب سپیدۂ صبح نمودار ہوا تو مرتا البانیہ کی لاش ایک لکڑی کے تابوت میں رکھی گئی جسے دو فقیروں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور شہر سے دور ایک الگ تھلگ کھیت میں اسے دفن کر دیا گیا۔ کاہنوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا اسے قبرستان میں جہاں صلیب کا نشان ہے دفن کرنے سے منع کر دیا اور اس کو اس گڑھے تک پہنچانے میں جو آبادی سے دور تھا صرف دو آدمی تھے ایک اس کا لڑکا اور دوسرا ایک نوجوان جسے زندگی کی مصیبتوں اور پریشانیوں نے رحم کرنا سکھا دیا تھا[۱]"

جبران نے اس کہانی کے ذریعہ غالباً لبنانی معاشرہ میں رائج ایک دوسری برائی کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح متمول گھرانے کے من چلے اور جنسیت پرست نوجوان

۱۔ مرتا البانیہ

اپنی خواہش نفسانی کو بجھانے کے لئے ۔ وہ لوح گاؤں کی لڑکیوں کو دھوکہ دے کر شہر کی چمکتی دمکتی زندگی اور اس کی لذت کوششوں کا لالچ دلا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور جانوروں کی طرح اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں اور جب ان کے شباب کا ایک ایک قطرہ چوس لیتے ہیں تو انھیں بیکس ولاچار گندی گلیوں میں چھوڑ کر کسی دوسرے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں ۔ اس ظلم کے خلاف جبران جو کچھ خود کہنا چاہتے تھے اسے انھوں نے مرتا کی زبان سے کہلوانے کی کوشش کی ہے ۔ کہانی بہت اثر انگیز اور پر درد ہے ۔ اس میں ایک مظلوم عورت کے درد کی پکار ۔ اس کے زخموں کی کسک اور کس مپرسی اور بیچارگی کی آہ وفغاں ہے ۔

یہ کہانی بھی بیان کے اسلوب اور فن کی ایک زندہ مثال ہے ۔ کہانی صرف تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے اور تینوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات اور حوادث کے منطقی نتیجہ کے طور پر اپنے رول نہیں ادا کر رہے ہیں بلکہ ان سے جبران اپنی مرضی اور خیالات کے مطابق رول ادا کرا رہے ہیں ۔ جس کا نتیجہ بقول سعد صائب یہ ہے کہ

> "اس کہانی میں مرکزی خیال اس کہانی سے کہیں بڑا ہے جو اسے جبران نے پہنایا ہے اور جس شکل میں یہ ظاہر ہوا ہے کیونکہ یہ خیال زیادہ تر کرداروں کے اقوال اور خطبات میں ادھر ادھر بکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ ان کے اعمال اور افعال سے کم ظاہر ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی نگار واقعات کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ جا بجا واقعات اور حوادث پر اظہار رائے بھی کرتا جائے ۔ گویا کہ کہانی کے کردار اس کے ہاتھ میں گڑیوں کی طرح ہیں جنھیں وہ جہاں اور جیسا چاہتا ہے گھماتا ہے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے ان کی زبان سے ادا کراتا ہے ۔"[1]

کہانی اگرچہ بہت موثر اور المناک ہے لیکن اگر اس پر واقعاتی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو بہت ڈھیلی ڈھالی اور کمزور اور حقیقی زندگی سے بہت دور دکھائی دے گی بھلا یہ ممکن ہے کہ گاؤں کی ایک سیدھی سادی

۱۔ سعد صائب ۔ الادیب ماہ نومبر ۱۹۶۲ء

لڑکی ایک گھوڑ سوار کے ساتھ جسے کبھی اس نے نہ دیکھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی ایک لامعلوم دنیا کی طرف بغیر سوچے سمجھے چل دے اور بے بیروت پہنچ کر اپنے آپ کو اس کی ہوس رانیوں اور جنسی لذت کوشیوں کے حوالے کردے۔ یہاں تک کہ اس کا نتیجہ ایک بچے کی شکل میں بھی ظاہر ہو جائے اور اچانک وہ اسے چھوڑ کر چل دے اور وہ داد و فریاد بھی نہ کر سکے۔ نہ آس پاس کے لوگ اور پڑوسی ہی اس حرکت کے خلاف آواز اٹھائیں بلکہ سارے واقعات اس طرح ہوتے رہیں کہ جیسے ملک میں نہ کوئی قانون ہے نہ کوئی اخلاقی ضابطہ اور نہ معاشرہ میں کوئی اصول ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ ملک میں کوئی قانون نہیں ہے اور نہ کوئی اخلاقی ضابطہ، اور نہ یہ کہ ایسے واقعات ہوتے نہیں ہیں۔ ہوتے ضرور ہیں لیکن اس کے کچھ منطقی نتیجے ہوتے ہیں۔ واقعات اور حوادث کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر کہانی اپنے مقصد کی طرف فطری طور سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہر واقعہ اور ہر موڑ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا معلوم ہوتا ہے اور اس سے دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ جبران کے یہاں یہ بات مفقود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص حادثہ اپنی ایک خاص رائے کو ظاہر کرنے کے لئے یا کسی خاص بات کو کہنے کے لئے گڑھا ہے۔ کرداروں کے اعمال کے فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ پانچ سال گزارنے کے بعد جبران کو اس لڑکی کا معلوم "انجام" جاننا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے انھیں مرتا کے پانچ سالہ لڑکے کو پھول فروش بنانا پڑا اور سارے بازار سے گھمانے پھرانے کے بعد اسے قصہ کے راوی کے پاس لانا پڑا اور اس کے منہ سے مرتا کا نام کہلوا کر راوی کو مرتا تک لے جاکر، دل میں غم و غصہ کی جو چنگاریاں سلگ رہی ہیں انھیں مرتا کے منہ سے کہلوانا پڑا۔ مرتا بھی اپنی کہانی ایک واعظ کی طرح شروع کرتی ہے اور کہانی ختم ہوتے ہی اس کی نبض کی بھی آخری سانسیں چھوٹ جاتی ہیں۔ کہانی فنی نقطۂ نظر سے اتنی کمزور ہے کہ اگر آپ کرداروں کو نکال دیں اور کہانی کے جملوں کو جوڑ دیں تو ایک بہت بلیغ خطبہ بن جائے گی کہانی نہ رہے گی۔ اس لئے کہ افسانہ میں جان کرداروں اور ان کے اعمال سے نہیں بلکہ جبران کے سیال قلم اور آتشیں افکار نے ڈالی ہے اور یہ قلم اور یہ افکار اتنے جاندار اور موثر ہیں کہ انسان کے دل پر اپنی چھاپ چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اس چھاپ پر اس سے تیز رنگ کی

چھاپ پڑ جائے تو وہ رنگ غائب ہی ہو جائے یا کمزور ضرور پڑ جائے۔

تیسری کہانی "مضجع العروس" میں جبران نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک لڑکی جس کی شادی ایک صاحب ثروت اور متمول آدمی سے اس کی مرضی کے خلاف کر دی جاتی ہے تو شب زفاف کو وہ اپنے محبوب کو پہلے قتل کرتی ہے پھر خود بھی خنجر مار کر خودکشی کر کے اس کے سینہ سے لگ کر جان دے دیتی ہے اور مرنے سے پہلے ایک لمبا چوڑا خطبہ دیتی ہے جس میں وہ اپنے دولہا اور دعوت ولیمہ میں شریک لوگوں کو مخاطب کر کے اس طرح روپے پیسے کے زور پر شادی کرنے اور محبت کرنے والوں کے بیچ میں حائل ہونے کی برائی پر بہت آتشیں انداز میں تقریر کرتی ہے اور آخرکار اپنے محبوب کے سینہ پر سینہ رکھ کر اور اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ کر یہ کہتی ہے کہ

"خبردار اے ملامت کرنے والو ہمارے جسموں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرنا اور اگر تم نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو ہم دونوں کی روحیں جو اس وقت تم لوگوں کے سر پر منڈلا رہی ہیں تمہاری گردنوں کو بڑی سختی سے پکڑ لیں گی اور بڑی بے دردی اور بے رحمی سے تمہارے گلوں کو گھونٹ دیں گی[۱]"

اس کہانی کے ساتھ جبران نے ایک فٹ نوٹ دیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ حادثہ انیسویں کے نصف آخر میں شمالی لبنان میں پیش آیا۔ اس واقعہ کو قرب وجوار کی ایک فاضل خاتون نے مجھ سے بیان کیا۔ خاتون کہانی کے ایک کردار کی عزیزہ بھی ہیں"

جیسا کہ جبران نے فٹ نوٹ میں کہا ہے ممکن ہے اس جیسا حادثہ واقعتاً پیش آیا ہو لیکن جبران نے اسے جس طرح مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے اس نے اس کی واقعیت کو تخیل میں گم کر دیا ہے۔ لڑکی کے مرتے وقت کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے غلط خبر دی گئی تھی کہ اس کا محبوب کسی دوسری عورت نجیبہ کو چاہتا ہے اور اس کا احساس، سلیم کو دعوت میں بے چین دیکھ کر ہوتا

۱۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

چنانچہ وہ اسے باغ میں بلواتی ہے اور اس سے معذرت کرتی ہے کہ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ تم نے اب مجھ کو چاہنا چھوڑ دیا ہے اس لیئے میں نے شادی کر بیٹھی۔ اب تم مجھے معاف کرو۔ ظاہر ہے وہ اس کا یہ گناہ معاف نہیں کرتا اور اس پر وہ اس کے پہلے چھرا گھونپ دیتی ہے اور پھر خود بھی چھرا گھونپ کر مر جاتی ہے۔

حالانکہ یہ ہے کہ جب اسے خبر دی گئی کہ [illegible] تم کو نہیں چاہتا ہے تو کیا وہ اس [illegible] نہیں کر سکتی تھی [illegible] خاص طور سے جب اس کے پاس [illegible] کی ایک بہت اچھی بھروسے کی [illegible] [illegible] میں شادی کرانے آتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ [illegible] شادی کو [illegible] کر دی ہے کیونکہ [illegible] بڑی اور [illegible] پادری اور لڑکی کی [illegible] [illegible] شادی کی دعوت میں [illegible] ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے اور وہ سب کچھ سوتا ہے جو کہانی میں دکھایا گیا ہے اور جو واقعات اعتبار سے مبالغہ پر مبنی ہے۔ ابن الغریب نے لکھا ہے کہ[1]

"ایک پادری نے جب یہ قصہ پڑھا تو کہا کہ اس میں محض مبالغہ آرائی ہے [illegible] کیا کہہ رہی ہے؟ تو ہم نے کہا کہ [illegible] کہ کوئی پادری ایک لڑکی کو شادی کے رشتے میں [illegible] معلوم کئے اور پوری طرح اطمینان کئے [illegible] باندھ دے گا۔ ہم نے کہا کہ گستاخی [illegible] [illegible] ہمارا ادعا ہے کہ اس [illegible] لڑکی جو کچھ بھی کہتی ہے اس کے [illegible] [illegible] نہیں ہوتی [illegible] رسم و رواج اور [illegible] ہمہ گیر ہوتا ہے۔"

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عام طور سے [illegible] لڑکیاں کسی کا دل [illegible] اسی وجہ سے جس سے باندھ دی جائیں ادھی کر لیتی ہیں اور جگ ہنسائی اور نصیحت [illegible] جو [illegible] کی لڑکی نے کی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کا یہ واقعہ ہے اور اس زمانے [illegible] ان کی [illegible]

۱۔ مقدمہ "الارواح المتمردۃ"

بہادر اور اتنی عجیب زبان اتنی بڑی فلسفی اور عالم ہے کہ اس کے سامنے بڑے بڑے بہادر لوگوں کو بھی آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور دوسری طرف اتنی بیوقوف اتنی سادہ لوح اور شکی مزاج ہے، کہ صرف سنی سنائی بات پر دوسرے آدمی سے محض اپنے محبوب سے انتقام لینے کی خاطر یا اسے جلانے کے لئے شادی رچا رہی ہے، اور اس خبر کی صداقت تک نہیں کرتی۔ اس جیسی لڑکی سے اس کی بھی توقع بے جا نہیں ہے کہ وہ خود ہی سلیم کے پاس زینب کو لے کر جاتی اور بنفس نفیس ساری بات کی تحقیق کرتی۔ مگر جبران نے اسے یہ کام نہیں کرنے دیا اس لئے کہ پھر غلط فہمی دور ہو جاتی اور کہانی کی تان جہاں جبران توڑنا چاہتے تھے نہ توڑ سکتے۔ درحقیقت جبران اپنی کہانیوں میں واقعاتی تسلسل اور حقیقت سے ان کے تعلق کی طرف کم توجہ دیتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہے کہ اپنے خیالات وہ فنکار کرداروں کے منہ سے خواہ حقیقت پر مبنی ہوں یا نہ ہوں ادا کرا دیں۔ اس لئے جب کہانی پڑھ چکیے تو یہ زبان سے کم ہی نکلتا ہے کہ ایسا واقعہ ابھی تو فلاں جگہ پیش آیا تھا۔ یا ہمارے جاننے والوں میں ایک آدمی کے یہاں بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ رہ گیا جبران کا یہ کہنا کہ اس کہانی کو ایک خاتون نے انھیں سنایا تھا اور وہ خود بھی اس لڑکی کی عزیز تھیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس قسم کا ایک واقعہ ہوا لیکن کیا ایسے واقعات معاشرہ میں عام طور سے آئے دن ہوتے رہتے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ واقعہ ایک خاص واقعہ ہے جو ایک دفعہ ہو گیا اس شاذ و نادر واقعہ پر تو آپ کہانی کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ورنہ پھر کہانی اپنی آفاقیت یا شمولیت کھو دے گی۔

ان اجتماعی موضوعات کے علاوہ جبران نے ارباب حکومت، کلیسا اور پادریوں کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں کا اسٹیج بھی شمالی لبنان کے گاؤں یا قصبے ہیں کیونکہ بقول جبران:

"ابتدائے آفرینش سے آج تک یہی ہوا ہے کہ موروثی شرافت پر نازاں لوگ عوام کے خلاف سپاہیوں اور دینی رہنماؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کئے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو بنی نوع انسان کی گردن کو اپنے چنگل میں پھنسائے ہوئے ہے۔ اور اس وقت تک اس سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا جب تک اس دنیا سے جہالت اور غباوت کا خاتمہ نہ ہو جائے اور جب تک ہر مرد کی عقل بادشاہ اور ہر عورت کا دل کاہن (پادری) نہ ہو جائے۔"

یہ اس لئے کہ "موروثی شرافت" کا مالک اپنا محل کمزور غریبوں کے جسموں پر کھڑا کرتا ہے اور پادری کرجا کی قربان گاہ صلیب و قربان بردار مومنوں کی قبروں پر بناتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والی شہر بیکس کسان کے بازوؤں کو اپنے قبضہ میں کئے رہتا ہے اور پادری اپنا ہاتھ اس کی جیب میں دیئے رہتا ہے حاکم کھیت کے سپوتوں کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھتا ہے اور پادری ہنستے ہوئے ان سے چھٹا رہتا ہے اور چیتے کی چڑھی ہوئی تیوری (عبوست) اور بھیڑیے کی مسکراہٹ کے درمیان بکریوں کا گلہ ختم ہو جاتا ہے ۔ حاکم شریعت پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پادری دین کی اطاعت کا اور ان دونوں کے درمیان جسم فنا ہو جاتے ہیں اور روحیں (تعفن) گھلی رہتی ہیں ۔"

"اور لبنان میں جو ایسا پہاڑ ہے جہاں سورج کی کرنوں کی روشنی کی بہتات ہے لیکن جہاں علم و معرفت کی روشنی کی کمی ہے ۔ شریف اور پادری نے اس غریب و لاچار کسان کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے ۔ جو زمین کو جوتتا ہے اور اس سے غلہ پیدا کرتا ہے بالکل اس طرح جس طرح وہ اپنے جسم کو اول الذکر کی (حاکم) تلوار اور ثانی الذکر (پادری) کی لعنت سے بچاتا ہے ۔"

"موروثی شرافت" کا مالک لبنان میں اپنے محل کے سامنے کھڑے ہو کر لبنانیوں سے چلا کر کہتا ہے کہ "سلطان نے مجھے تمہارے جسموں کا مالک بنایا ہے" اور پادری قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر صدا دیتا ہے کہ "اللہ نے مجھے تمہاری روحوں کا والی بنایا ہے" مگر لبنانی اپنے منہ پر تالا لگائے ہوئے چپ چاپ سب کچھ سن لیتے ہیں کیونکہ جن دلوں پر گرد کی تہہ جم گئی ہو وہ ٹوٹتے نہیں کیونکہ مردے رونے نہیں ۔[1]"

یہ ہے وہ پس منظر جس میں جبران نے حاکموں اور دینی رہنماؤں کی برائیوں، ان کے ظلم و استبداد کے قصوں، ان کی بے رحمیوں، لاقانونی حرکتوں اور من مانی کارروائیوں کا پردہ فاش کیا ہے اور لبنانیوں کی بیچارگی، مجبوری، جہالت اور فقر و فاقہ کا نقشہ بہت دردناک اور موثر انداز میں کھینچا

۱۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ ۔ کہانی ۔ خلیل الکافر

... ساتھ ہی اس دین کے خلاف جو انسان کی مجبوری اور اس کی کس مپرسی پر رحم نہ کرے اور اس حاکم کے خلاف جو رعایا کے فقر و فاقہ اور ان کی تنگ دستی کا علاج نہ کرے علم بغاوت بلند کرنے کی بالواسطہ تلقین کی ہے ... سکتا ... یہ اس ... ممکن نہیں جب تک شانہ نہیں بد... علم و حکمت کی روشنی ... نور جلوہ گر نہیں ...

... میں سب سے زیادہ موثر اور دردناک دو کہانیاں ہیں۔ ایک یوحنا ... ایک تیسری کہانی بھی ہے جو بادشاہوں اور دینی پیشواؤں کے عدل و انصاف ... ہے اور وہ کہانی ہے "صراخ القبور" جس کا ماحصل یہ ... را با کے ... پر کھا جا۔"

یوحنا المجنون میں جبران نے ایک چرواہے کا قصہ لکھا ہے جس کا نام یوحنا ہے۔ اس کی جوانی کی آنکھیں گائے بیل چرانے اور اسباب سے چھپ چھپ کر چپکے سے انجیل پڑھتے کھلیں۔ اور اس طرح اس نے زندگی اور زندگی ... کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھا اور عزم کیا کہ انھیں اپنی زندگی میں خود برتے گا اور جو لوگ صرف زبان سے ... کو اپنانے کی ضرورت پر، ان کی حقانیت اور افادیت پر لکچر دیتے ... مخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرے گا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ حسب معمول اپنے جانور چرانے کے لئے جاتا ہے، چراگاہ پہنچ کر جانور ... چگنے میں لگ گئے اور یوحنا اپنی دنیا میں کھو گیا۔ جانور چرتے چرتے قریب کے گرجا کے کھیتوں میں جا پہنچے پادریوں نے انھیں پکڑ کر بند کر لیا۔ جب یوحنا اپنی خیالی دنیا سے چونکا اور جانوروں کی طرف نظر اٹھائی تو اندازہ ہوا کہ جانور تو بہت کم ہو گئے ہیں چنانچہ وہ انھیں ڈھونڈھتا گرجے جا پہنچتا ہے اور پادریوں سے بڑی لجاجت اور شرمساری سے درخواست کرتا ہے کہ پہلی دفعہ غلطی ہوئی ہے آج اس کو ...

۱۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

... الارواح المتمردۃ : یوحنا المجنون

[illegible]س کے جانوروں کو چھوڑ دیں۔ پھر وہ کبھی بھی انھیں لے کر اس علاقہ میں نہ آئے گا۔ مگر پادری بغیر تاوان
[illegible] کے پر تیار نہیں ہوتے ہیں۔ گ[illegible] اور گرجے کے پر[illegible]
سے تاوان دینے کے لئے مجبور کرنے لگتے ہیں لیکن اس کے پاس تاوان دینے کے لئے کچھ نہیں۔ چنانچہ اسے
[illegible] آتا ہے اور وہ انجیل [illegible] وں کے خلاف ایک طویل پوری تقریر کرتا
جس میں انھیں بڑی [illegible] اور انجیل مقدس کے ان اسباق و احکام کا ذکر کرتا ہے جن کا تعل[illegible]
[illegible] بجائے اچھا اثر ہونے کے انھیں اس کی یہ باتیں زہر لگتی ہیں اور
[illegible] یں بند کر دیتے ہیں۔ بیچاری ماں دوڑی ہوئی آتی ہے اور بیٹے کی طرف
[illegible] بغیر جرمانہ لئے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے چنانچہ دکھیا ماں اپنا وہ ہار پادر[illegible]
[illegible] اس کی ماں نے شادی میں اسے دیا تھا ادا [illegible] یوحنا کو پادریوں کی قید سے
چھڑا کر [illegible] ایک نئی قربان گاہ کے افتتاح کی تقریب ہوتی ہے۔ وہاں سا[illegible]
گاؤں کے [illegible] کے دیہاتوں کے رہنے والے جمع ہیں اس تقریب کے خاتمہ پر یوحنا پھر ایک
[illegible] پادریوں کی [illegible]، دنیا طلبی، حرص و ہوس کا پردہ فاش کرتا ہے۔ چنانچہ
[illegible] ہیں اور اس وقت تک اسے نہیں چھوڑتے جب تک اس کا بوڑھا باپ آ کر
[illegible] مقدس مریم کا واسطہ دے کر اس کا اقرار نہیں کرتا کہ یوحنا پاگل ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی
[illegible] ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے پادریوں کو اس کے دماغ خراب ہونے کا یقین ہوتا ہے۔
[illegible] کر دیتے ہیں اور یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ یوحنا پاگل ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی نہ آئے مگر
یوحنا اپنی [illegible] م، استقلال سے جما رہتا ہے۔ وہ ان کے تقدس اور مذہب کے [illegible] میں
زر گری کی مذمت سے باز نہیں آتا لیکن اس کی بات اب سننے والا کوئی نہیں۔ دیوانوں کی یاوہ گوئی کو
کون [illegible] کا احساس ہو جاتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ
[illegible] زیادہ ہو اور میں تنہا ہوں اس لئے میرے متعلق چرچ میں آ کر کہو اور میرے ساتھ
[illegible]رو۔ کیونکہ بھیڑیے بکریوں کو رات کی تاریکی میں پھاڑ دیتے ہیں لیکن ان کے خون کے

نشانات وادی کے سنگریزدں پر باقی رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور سورج پہاڑ [illegible] سے طلوع ہوتا ہے ۔

[illegible] بیں پر کہانی [illegible]

[illegible] اس کہانی میں جبران نے عیسوی مذہب کے ٹھیکہ داروں کے مکروفریب اور دین کے نام [illegible] عمارت گری کو واقعاتی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح پادریوں کے خلاف جبران [illegible] جو آگ بھڑک رہی ہے اسے اپنے [illegible] سے دوسروں کے سینوں میں منتقل کرنے [illegible] ان کے مکروفن سے بچے رہیں اور ان کے بظاہر لاہوتی لیکن بباطن طاغوتی باتوں [illegible] نہ کھائیں لیکن بقول محمد یوسف نجم :

"کہانی کرداروں اور واقعات میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے میں یکسر ناکام ہے۔ کہاں ایک [illegible] جا اور کہاں فصیح وبلیغ حکمت وموعظت سے لبریز دو تقریریں ۔ کہاں کوہستان کا یہ سیدھا [illegible] نوجوان کہاں اس کی تقریر کی وہ گہرائی اور فلسفہ کی وہ دقیق باتیں ۔"

[illegible] جبران بول رہے ہیں اور اس طرح بول رہے ہیں کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ "زبان غیر سے فریاد میری" پھر کہانی اپنی جگہ پر بہت کمزور اور بے جان ہے اور پڑھنے والا آسانی [illegible] سمجھ جاتا ہے کہ یہ کہانی جبران نے صرف اس لئے گڑھی ہے کہ پادریوں اور کلیسا کے خلاف ان کے دل میں جو پھپھولے پڑ گئے ہیں انھیں صرف پھوڑنے پر اکتفا کریں ۔ حقیقی زندگی سے شاید ان واقعات کا تعلق کم ہے ۔

جبران نے کلیسا اور اہل کلیسا کی ظلم وزیادتی کی داستان ایک اور کہانی "خلیل الکافر"[۲] میں [illegible] کی ہے اور ساتھ ہی حکومت کے ذمہ داروں کی چیرہ دستیوں اور خود فریبیوں کے ماتحت اہل کلیسا سے گٹھ جوڑ کرکے کسانوں پر ظلم وستم ڈھانے کے واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔

[illegible] یوسف نجم : القصۃ فی الادب العربی ۲۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

"خلیل الکافر میں واقعات کا منطقی تسلسل بالکل مفقود … یوحنا کی طرح ایک …
… یہ ہے کہ خلیل گرجا گھر … ہوا ہے اور یوحنا اپنے ماں باپ کے جانوروں کا۔ یوحنا بھی چپکے
… انجیل کی تلاوت کر کے حقیقت تک پہنچا ہے اور خلیل بھی۔ یوحنا تو کسی حد تک موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ارباب کلیسا
کی بد اعمالیوں کے خلاف اپنی دونوں تقریریں کرتا ہے لیکن خلیل تو حقیقت ابدی کو انجیل کے ذریعہ معلوم کرنے
کے بعد ایک دن بغیر کسی … واسطے اس کے کہ وہ ان حقیقت نے تبلیغ کا جذبہ شدید اس کے دل میں
پیدا کر دیا تھا) پادریوں کے سامنے جا کر ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دیتا ہے جس میں ان کی زندگی سے
… ت اور دجل و فریب کا پردہ فاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ماہ کے لئے
گرجے کے قید خانہ میں قید کر دیا جاتا ہے لیکن جب قید سے نکلتا ہے تو پھر وہ ایک ایسے موقعہ سے جو کسی طرح
… اؤں کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا ہے … یہ ہے کہ اس
… میں جس میں شدید برف باری ہو رہی تھی طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے دسروی سے
… گرجے سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ جب بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے تو ایک بیوہ
… اس کی جوان لڑکی اسے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہیں اور تیمار داری کرتی ہیں۔ جس کا اعتراف وہ اس فلسفیانہ
… کہتا ہے "لیکن تند و تیز ہواؤں اور برف کے ڈھیروں کے پیچھے تاریکیوں اور کالے بادلوں
کے پرے چاند ستاروں کی دنیا سے بھی دور غرض کائنات اور موجودات کی ہر چیز کے ماورا ایک طاقت
کار فرما ہے جو سراسر علم و معرفت اور رحم و کرم ہے۔ اس طاقت نے میری چیخ و پکار سن لی۔ اس نے یہ نہ چاہا
کہ میں … البتہ میں سے جو کچھ بچ رہا ہے انھیں جانے بغیر مر جاؤں۔ اس لئے اس نے تم دونوں
کو میرے پاس بھیج دیا کہ تم دونوں مجھے موت اور قبر کی بے پناہ گہرائیوں سے نکال کر زندگی کی کارگاہ میں
… آؤ"۱

… اس طرح خلیل دونوں عورتوں کی تیمار داری اور دلسوزی کی بدولت اچھا ہو کر کارگاہ حیات

۱۔ الارواح المتمردۃ

میں دوبارہ داخل ہو جاتا ہے لیکن شیخ عباس کی [illegible] جو اس علاقہ کا حاکم ہے اس پر پادریوں کی نافرمانی اور کلیسا کی بے حرمتی کرنے کے جرم میں مقدمہ چلتا ہے۔ جب [illegible] تو شیخ عباس [illegible] کہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی صفائی میں ایک لمبی چوڑی تقریر کرتا ہے جو کتاب کے [illegible]ت پر مشتمل ہے۔ تقریر میں عیسوی مذہب کے صحیح خدوخال کو پیش کرنے کی کو[illegible] [illegible] اور دینی رہنماؤں کے ظلم و زیادتی مکر و فریب کا پردہ پورے جوش اور جرأت سے فاش کرتا ہے پھر عام لوگ جو اس مقدمہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ان سے مخاطب ہو کر ان کو [illegible] کی زندگی گزارنے کے خلاف ابھارتا ہے۔ اس کی تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ جب شیخ عباس خلیل کی باتوں کی تاب نہ لا کر اپنی تلوار سونت کر اس پر جھپٹتا ہے تو تماشائیوں میں سے ایک تنومند [illegible] کر اس کی تلوار کو پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "جناب والا اپنی تلوار میان میں کر لیجئے کیونکہ جو تلوار اٹھاتا ہے وہ اسی تلوار سے ختم بھی ہو جاتا ہے"۔

خلیل کی موثر تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سارا مجمع اور شیخ عباس کے سارے کارندے جو خلیل کو [illegible] پکڑ کر لائے تھے شیخ عباس اور پادری الیاس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ شیخ کے کارندے [illegible] سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور اس قدر اشتعال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس موقع پر ان دونوں کا قتل ہو جانا کوئی بعید بات نہیں دکھائی دیتی لیکن جبران اس پورے مجمع میں اتنی جرأت نہیں پیدا ہونے دیتے کہ وہ دونوں کو قتل کر دے، پھر یہ سارا مجمع انتہائی طیش میں خلیل کے حکم سے اس گرجے میں پہنچتا ہے جہاں سے خلیل کو نکالا گیا تھا لیکن وہاں بھی بجائے اس کے کہ یہ مجمع پادریوں سے ان کے جرائم کی بازپرس کرے، خلیل کی ایک دوسری تقریر سننے میں مصروف ہو جاتا ہے جو اس موقعہ پر بالکل ٹھونسی ٹھانسی معلوم ہوتی [illegible] کے بعد انتہائی سکون سے خلیل مریم اور راحیل کے پیچھے ان کی جھونپڑی کی طرف چل [illegible] سب لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی [illegible] میں گئے تھے اور سیر و تفریح کے بعد گھر واپس آ گئے اور پھر دو ایک گھڑی بھی گذرنے نہیں پائی کہ جھونپڑیوں کے دیئے گل ہو گئے اور اطمینان و سکون نے اپنی چادر اس گاؤں پر پھیلا دی اور خوابوں نے کسانوں کی روحوں

اپنی مکروہ عمل میں لے لیا اور شیخ عباس کی روح کو رات کے بھوتوں کے ساتھ جاگتی ہوئی چھوڑ دیا کہ اپنے [illegible]ہوں کے سامنے تڑپتی رہے اور اپنے خام خیالوں کے پنجے میں پڑی آہیں بھرتی رہے"۔ کہانی کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ شیخ عباس پاگل ہو کر [illegible] اور خلیل کی شادی بیوہ کی لڑکی راحیل سے ہو جاتی ہے اور وہ اس گاؤں میں رہنے لگتا [illegible] بغیر کسی قانونی چارہ جوئی کے گاؤں کی ساری زمین کسانوں کی ملکیت ہو جاتی [illegible] نہ ان سے کسی قسم کا ٹیکس وصول کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کو یہاں غلہ کی وصولی کے لئے آتے ہیں اور آج پچاس سال گزرنے کے بعد اگر کوئی ادھر سے گزرے تو لبنان کے اس [illegible] جگہ ایک خوبصورت شہر بسا ہوا ہے جو باغات اور ہرے بھرے کھیتوں [illegible] ہے۔" اور اس طرح بغیر کسی منطقی تسلسل اور واقعات کے فطری طریقے سے ظہور پذیر [illegible] ختم ہو جاتی ہے جو جبران کے کلیسا اور ارباب کلیسا پر شدید حملہ اور ان سے نفرت و کراہیت کی ایک زندہ مثال ہے۔

یوحنا المجنون اور خلیل الکافر میں بقول ابن الغریب "صرف یہ فرق ہے کہ یوحنا ارباب کلیسا سے ہار مان کر مر گیا لیکن خلیل اپنے بیکس و لاچار اور خود غرض دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر زندہ رہا۔ یوحنا کو اس بھاری جوئے کا احساس تھا جسے پادریوں اور پروہتوں نے غریب کسانوں [illegible] رکھا تھا۔ اس لئے اس نے اس کے خلاف پر زور درد بھری اور المناک آواز اٹھائی۔ مگر ان کی چیرہ دستیوں، جوڑ توڑ اور ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور آخر کار "پاگل" کا لقب پاکر مر گیا۔" مگر خلیل اپنی مدلل وزنی اور دل لگتی باتوں کے بل بوتے پر ججوں اور حاکموں کے سامنے کھڑے ہونے کی طاقت رکھتا تھا۔ پھر اس کے ہمنوا گاؤں کے لوگ اور کسانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تھی جو اس کی بات پر کان دھرتی تھی اور اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی اور ظلم کو

۱۔ الارواح المتمردۃ ۔ قصہ خلیل الکافر

۲۔ مقدمۃ الارواح المتمردۃ

محسوس کرکے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ لبنان کے دھالوں [illegible] کے گاؤں میں ہنسی خوشی اور آرام وچین سے زندگی گزارتا رہا مگر یوحنا کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ ماں باپ [illegible] کے پادریوں کے مقابلہ میں آلیں کیونکہ ان کا اور ان کے بیٹے کا کوئی ہمنوا نہ تھا کوئی ساتھی نہ تھا۔ لاچاری، کس مپرسی اور تنگدستی آدمی [illegible] کو حق کہلانے پر بسا اوقات مجبور کردیتی ہے اور یہی یوحنا کے ساتھ ہوا۔ غرض کہ جبران کی تمام کہانیوں کا یہی رنگ ہے اور ان کے لکھنے کا یہی ڈھنگ۔ دراصل یہ طرزِ نگارش اس مکتب فکر کے تمام ادبا کا مشترک اسلوب ہے۔ خواہ وہ جبران ہوں یا مصطفےٰ لطفی منفلوطی یا مصطفےٰ صادق الرافعی۔

میخائیل نعیمہ نے خلیل جبران کے اسلوب بیان اور فن افسانہ نگاری کے متعلق لکھا ہے:

"جبران اپنے قصوں میں ایسے واقعات اور ایسے کردار پیش کرتے ہیں جن میں فنی باریکی اور واقعہ کی صحیح تصویر کشی ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ ان واقعات اور کردار کو پیش کرنے کا مقصد ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی مدد سے اپنے قلم کی جولانیاں دکھا سکیں اور انسانی فطرت اور مختلف احساسات ومشاعر کے بیان کرنے میں اپنی فنی پختگی کا مظاہرہ کرسکیں [illegible] خاص طور سے رنج وغم، یاس حرمان کا عنصر غالب ہو یا پھر ان کے سہارے لوگوں کی سنگدلی تنگ [illegible] اور بداخلاقی کے متعلق تقریر دلپذیر کرسکیں یا محبت کے لطف، حق [illegible] کی قیمت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔"[1]

میخائیل نعیمہ جبران کے جگری دوست اور ان کے بڑے قدردان ہیں اور جدید ادبا میں جبرانیات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے جبران کی مختلف تصانیف پر بڑے فاضلانہ مقدمے لکھے ہیں اور مذکورہ بالا اقتباس ان کے ایک مقدمے سے لیا گیا ہے جو انھوں نے مولفات جبران پر لکھا ہے نعیمہ نے اپنے دوست کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ جبران [illegible]

---

[1] مقدمہ میخائیل نعیمہ لمولفات جبران

[illegible] ہی، اجتماعی، دینی اور دنیوی مسائل پر کس انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اگر ہم [illegible] کی کتابوں کا مطالعہ بنظر غائر کریں تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ جبران اور منفلوطی جیسا کہ [illegible] ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ مسائل پر نظر ڈالنے کا کم و بیش وہی انداز ہے اور وہی اسلوب بیان وہی پند و نصیحت ہے اور وہی مبالغہ آرائی [illegible] جبران چونکہ شاعر بھی ہیں اور بہت اچھے مصور بھی اس لئے اپنی شاعری اور فن مصوری کے سہارے [illegible] بعض خیالات کو اور خاص طور سے [illegible] قسم کے خیالات کو بیان کرنے میں بڑا معجزنما انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں اور جو بھی مبالغہ بیان کرتے ہیں اس کی تعمیر [illegible] لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مغربی ادب اور مغربی تہذیب و تمدن سے جتنا [illegible] میں رچ بس جانے کا موقع جبران کو ملا ہے منفلوطی کو نہیں مل سکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبران کے یہاں منفلوطی کے مقابلہ میں وسعت نظر، گہرائی زور بیان اور اپنی بات پر یقین کامل کا عنصر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے بقول نعیمہ "ان کہانیوں میں ابدیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔" اگر چہ میرے نزدیک انھوں نے اپنی وسعت نظری کی بنا پر مشرق کی بعض قدار پر ایسی ضرب کاری لگائی [illegible] ہمارے معاشرہ کی روح مجروح ہو گئی ہے بلکہ عربی رسم و رواج اور عربی المعاملات اور بعض اخلاقی قدریں بھی بری طرح پامال ہو گئی ہیں۔ میرا اشارہ جبران کے اس خیال کی طرف ہے کہ اگر لڑکی سے بغیر پوچھے اس کی شادی کر دی جائے اور وہ اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہو تو پھر دین معاشرہ، سماج اور خاندان کی عزت آبرو کو ملیامیٹ کر کے ناجائز طور پر کسی دوسرے کے ساتھ بندھ جانے میں [illegible] حالانکہ اس کا صحیح حل اول تو مذہب نے بھی دیا ہے۔ پھر عدالتوں کے [illegible] کھلے ہیں کہ اس ظلم کے خلاف چارہ جوئی کی جائے۔ اب رہ گیا زبان کا [illegible] بلا شبہ بعض جگہ بہت حسین اور پرکیف ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی منفلوطی کی زبان زیادہ سلیس [illegible] دل آویز اور صرف و نحو اور اصول بلاغت کے اعتبار سے زیادہ صحیح و بلیغ ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ بقول [illegible] منفلوطی فطرتاً اور طبیعتاً ادیب پیدا ہوئے ہیں ان کا فن کسبی نہیں بلکہ موہوبی ہے۔ کیونکہ کسب سے اچھوتا اور ممتاز ادب نہیں پیدا ہو سکتا اور نہ ہی اچھوتا

اسلوب بیان۱ ۔ منفلوطی ازہر کے تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے کی زبان آج بھی بحیثیت قابل تقلید نمونہ مسلّم ہے ۔ جبران عربی زبان کی تعلیم باقاعدہ کہیں حاصل نہ کر سکے انہوں نے صرف چار سال تک لبنان بیروت الحکمت مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر بوسٹن واپس چلے گئے۲ ۔

ظاہر ہے چار سال کی تعلیم اور وہ بھی مدرسہ کے معیار پر عربی جیسی سحر بیکراں زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لئے کہاں کافی ہو سکتی ہے ۔ اور اس تعلیم کے ساتھ جب ادب کی زبان ... ہوا جس کی طرف احمد حسن الزیات نے اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"ہمارے لبنانی بھائیوں نے مصر میں اور امریکہ میں ادب عربی کو مغربی ادب سے روشناس کرایا لیکن اس مہم میں انھوں نے ایسے فن اور ایسی زبان کا مظاہرہ کیا جس سے عربی ادب اب تک نابلد تھا اگرچہ زبان اسلوب کے اعتبار سے اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے بڑی ناقص اور سقیم تھی اس لئے ہم نے اسے اسی طرح ناپسند کیا جس طرح مقامات کے اسالیب بیان اور بے معنی جملوں رکیک تراکیب اور تصنع کو۳ ۔"

یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ملتی ہیں جن سے منفلوطی کا قلم بالکل پاک ہے ۔ جبران کو بھی اپنی اس کمی کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ میری زبان میں غلطیاں دکھائی دیتی ہیں تو کیا خیالات وافکار میں تو میرا کوئی ہمسر نہیں اور پھر

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

جہاں تک دینی افکار و معتقدات کا تعلق ہے منفلوطی اور جبران دونوں نے ان کی تبلیغ کی ہے ... تبلیغ قصوں کے درمیان وعظ و نصیحت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ

۱۔ احمد حسن الزیات : وحی الرسالۃ

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے الدیوان مرتبہ محمود تیمور اور ابراہیم المازنی

۳۔ ... الزیات : وحی الرسالۃ

جبران نے ایسے موقعوں پر منفلوطی کے مقابلہ میں زیادہ ... سے اور زیادہ ...
ہے اور انداز ایسا ہے جس سے تصور ہوتا ہے کہ جبران نہیں بلکہ ایک پادری بول رہا ہے۔ منفلوطی نے
زیادہ تر اخلاقی قصیدوں پر جو سب قوموں کا ... سرمایہ ہیں زور دیا ہے لیکن جبران نے قوم ...
مذہب عیسوی کی تعلیمات اور انہیں اقدار کی تبلیغ کی ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ چیزیں محدود
... غیر مسعود ہو گئی ہیں اور وہ آج بھی اسی طرح نئی اور قابل قبول ہیں جس طرح منفلوطی کے زمانے
... مصیبت و پریشانی کی جتنی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی ہے اور
ان کے نتائج میں جتنے آدمیوں کو موت کی ابدی نیند سلادی ہے اتنی مبالغہ آمیز تصویر منفلوطی کے یہاں
... سے ان مظلوموں اور ستم رسیدوں کو قبر کی کال کوٹھری میں
... سے جبران نے یہ کام کیا ہے۔ سعد صائب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ
... ہے کہ زندگی میں اس قسم کے المیہ حادثات اتنی کثرت سے ہرگز نہیں پیش آتے
... ان ادیبوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی غریبوں کے سسک ...
... حادثی کا نشانہ بننے والوں کے خودکشی کرنے ... مسائل حل ...

... ادب کے ممتاز نقاد اور ادباء میں سے کسی نے بھی، اور خاص طور سے
... جبرانی ادب کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ زبان کی سطحیت
... اباحیت" کو ہر سنجیدہ طبقے نے ناپسند کیا جس کا احساس جبران کو بھی تھا اور وہ کبھی کبھی
... مذہب کے خلاف دبی زبان سے احتجاج بھی کرتے تھے لیکن ان کی مخالفت کرنے والوں میں ایسے جید
... تھے جن کے خلاف بولنے کی جرأت نہ وہ خود کر سکے ... اور نہ ان
کے حواری ...

سعد صائب ...

منفلوطی کی بھی مخالفت کی گئی اور بڑی شدت سے اور سب سے زیادہ ان کے خلاف ابراہیم المازنی نے جو اپنے زمانے کے استاد تھے اور جن کا طوطی ایک زمانہ میں مصر میں بولتا تھا لکھا ہے۔ لیکن ان کی مخالفت منفلوطی کی فنی خامیوں کی وجہ سے تھی [illegible] منفلوطی کی اکثر کہانیوں میں رونا دھونا [illegible] یہ طبیعت پسند نہ تھی۔ [illegible]

[illegible] پڑھنے والوں میں تخنث پیدا کرنا چاہتا ہے احساس فرحت ومیں نہیں [illegible] جیں [illegible] سکتی ہیں مصیبتوں کے سامنے [illegible] ہوئے مردانہ وار سینہ سپر ہو [illegible] حوادث کی شرر باری [illegible] اور چلتی ہوئی تلواروں کے سایہ میں زندگی کرنے کی خو پیدا کر سکے اور یہ چیز منفلوطی کی کہانیوں سے قوم کے جوانوں کو نہیں ملتا۔ جس سے ان میں بزدلی کم ہمتی اور [illegible] پیدا ہوتی ہے جو ساری قوم کی موت ہے۔[1]

رہ گیا اسلوب بیان کا معاملہ تو اس پر بھی انھوں نے بعض اعتراضات کئے ہیں لیکن ان اعتراضات کی نوعیت یہ ہے کہ مازنی کے خیال میں ایک خاص لفظ کی جگہ جسے منفلوطی نے استعمال کیا ہے فلاں لفظ زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔ جسے منفلوطی نے نہیں استعمال کیا۔ یا اس مقصد کے لئے فلاں قسم کی عبارت زیادہ موزوں تھی وغیرہ وغیرہ۔

مگر میرا خیال ہے کہ مازنی کے اکثر اعتراضات محض معاصرانہ چشمک کی وجہ سے [illegible] منفلوطی اس گروہ میں تھے جو مازنی اور ان کے ساتھیوں سے ادب کے میدان میں دست و گریباں رہتا تھا اور مصر کا یہ زمانہ ادبی چپقلشوں کے لئے بہت مشہور رہا ہے اور اس کو ہوا دینے میں حاکم طبقہ کا بھی [illegible] اس سے اس کو اپنے مفید مطلب ادیبوں کو حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی تھی۔

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: الدیوان مرتبہ محمود تیمور اور ابراہیم المازنی

امام مرتضیٰ نقوی

تلخیص اور اس کا فن

[illegible] سے بنا ہے جس کے معنی اصلی اور عمدہ حصہ چھانٹنا، انتخاب کرنا، تشریح کرنا، خلاصہ کرنا ہیں۔ ترکی دواوین کی زبان میں اس سے مراد وہ [illegible] میں اہم مسائل کا خلاصہ سلطان کی [illegible] میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہ افسر جو ان کاغذات کی تیاری اور سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے ذمہ دار تھے وہ وزیراعظم اور شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ لیکن [illegible] جو وہ مفہوم انگریزی لفظ Abstracting سے آیا ہے۔ جس کے معنی کسی ادبی شہ پارے کا ایک خاص طرز سے خلاصہ کرنا ہے

ایک انگریز [illegible] بے کرین کا قول ہے "کہ کچھ لوگ زیادہ اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ کم پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔"

[illegible] تلخیص کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا اور معاملہ تشریح طلب رہ جاتا ہے۔ پھر بھی یہ اشارہ ہے علم اور اشاعت و طباعت کی اس روز افزوں ترقی کی طرف جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ [illegible] ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ تلخیص کسی ادبی شہ پارے کے خلاصے کو کہتے ہیں۔ جہاں تک اس کی حیثیت [illegible] ہے کہ آج اس سائنسی دور میں جبکہ علم کے ہر گوشے میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں، رسائل اور مضامین شائع ہو رہے ہیں یہ پتہ لگانا انتہائی دشوار ہو گیا ہے کہ فلاں مضمون کہاں شائع ہوا۔ اور اس میں کیا کہا گیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مضمون یا مقالہ کسی ایسی زبان میں ہو جس کو اس فن سے متعلق لوگ نا آشنا [illegible] معمولی قابلیت [illegible] بعض اوقات

مضامین اتنے طویل ہوتے ہیں کہ معروف ذہن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مضمون کو پورا پڑھا جائے کبھی مضمون میں غیر معمولی اور بے جا تفصیل قاری کے لئے اکتاہٹ کا سبب بن جاتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے چاہے اس میں کیسی ہی کام کی باتیں ہوں۔

قارئین کی ان دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ تفصیل کو اجمال کا جامہ پہنایا جائے اور ملخص رسائل یعنی Abstracting Periodical کا اجراء عمل میں لایا جائے یہ ایک انوکھی چیز تھی لیکن نہایت جامع اور اپنے اندر افادیت کا پہلو لئے ہوئے۔ یہ کام سب سے پہلے جرمنی میں ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا۔ ان کی دیکھا دیکھی برطانیہ والوں نے بھی علم کیمیا پر ایک سہ ماہی مجلہ نکالا۔ جس میں علم کیمیا پر ان مضامین کی تلخیص کی جاتی تھی جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ مجلہ آج بھی وہاں شائع ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ کام نہایت تیزی سے ہو رہا ہے۔ سائنسی علوم خاص طور پر علم طبیعیات علم کیمیا اور علم حیوانات پر بڑے اچھے ملخص رسائل شائع ہو رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ امریکہ کا علم کیمیا پر وہ مشہور جریدہ ہے جس میں تقریباً پچھتر ہزار مضامین کی تلخیص ہر سال کی جاتی ہے۔

یونیسکو نے بھی اس کام میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اس نے سماجی علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات اور دوسرے شعبوں میں ملخص رسائل کے اجراء کا کام شروع کیا ہے۔ ہندوستان میں "انڈین نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر" اور پاکستان میں "پاکستان نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر" کے تحت یہ کام ہو رہا ہے۔ سائنسی موضوعات پر جو مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں وہاں ان کی تلخیص کی جاتی ہے۔

تلخیص دو طرح کی ہوتی ہے ایک اشاراتی اور دوسری معلوماتی۔ اشاراتی تلخیص اس کو کہتے ہیں جس میں قاری صرف عنوان سے ہی پتہ لگا لیتا ہے کہ مضمون اس کے کام کا ہے یا نہیں۔ یہ تلخیص صرف ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو اپنے فن میں کامل ہوتے ہیں۔ اور انھیں اس پر پورا عبور رہتا ہے۔ ان کی نظر وسیع ہوتی ہے اور وہ پورے پس منظر سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ صرف ایک نظر دیکھنے سے اس کی تہ تک پہونچ جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے معلوماتی تلخیص وہ ہوتی ہے جو سادہ اور عام فہم زبان میں کی گئی

مضمون کے ہر پہلو کو اس طرح بیان کر دیا جائے کہ کہیں جھول اور بے ربطی نہ رہے، مضمون کے سب اہم پہلو اور گوشے پر اجمالی طور سے روشنی پڑ سکے تاکہ ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ سکے۔

تلخیص کرنے میں سب سے پہلا اور بنیادی کام جس سے تلخیص کرنے والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے وہ مضمون کا عنوان، اس کو چاہئے کہ سب سے پہلے اس عنوان پر اچھی طرح غور کرے کہ آیا یہ اس مضمون سے مناسبت رکھتا بھی ہے یا نہیں، لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ مضمون کچھ اور ہو اور عنوان کچھ اور۔ تلخیص کرنے والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مضمون کے عنوان میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرے۔ اس کو چاہئے کہ [illegible] نقل کرے۔ اکثر مضامین میں عنوان کے بعد ذیلی عنوان بھی ہوتا ہے، اس سلسلے میں تلخیص کرنے والے کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ عنوان کافی ہے یا نہیں، اگر وہ کافی نہیں ہے تو ذیلی عنوان [illegible] سے عنوان کی پوری وضاحت ہو جائے گی، اگر مضمون کسی دوسری زبان میں ہے تو اپنی زبان میں ترجمہ کر دینا چاہئے۔

[illegible] کے مصنف کا نام، رسالے کا نام، تاریخ اشاعت، جلد نمبر، مضمون کے [illegible] نے کے صفحات نمبر دینے چاہئیں۔

[illegible] کرنے سے پہلے مضمون کو اچھی طرح پڑھ لینا چاہئے اور اس کی اصلی روح تک پہونچ جانا [illegible] تاکہ ذہن میں اس کا واضح تصور ہو سکے اور کوئی مبہم گوشہ باقی نہ رہے۔ تلخیص کتنی طویل ہوگی یہ پہلے [illegible] کرنا چاہئے کیونکہ ماہرین فن کے لئے تفصیل بے سود ہوگی۔ عام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے [illegible] بہت شرح کے ساتھ کی جائے تو وہ ان کے لئے مفید ہوگی۔ تلخیص کرتے [illegible] خیال رکھنا چاہئے۔ زبان ہی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے [illegible] اکثر عدم دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تلخیص کے لئے وہی زبان استعمال کی جائے جو [illegible] ہے بلکہ اس میں تلخیص کرنے والا اپنی زبان استعمال کر سکتا ہے، مگر اس کے لئے سب سے بنیادی چیز یہی ہے کہ وہ زبان ادبی ہو، عام فہم ہو۔ زیادہ دقیق زبان تلخیص میں میں پسند نہیں کی جاسکتی۔ زبان کا معاملہ اگرچہ بہت کچھ موضوع کے مواد سے تعلق رکھتا ہے۔ [illegible]

فلسفیانہ اور منطقی استدلال لئے ہوئے ہے تو زبان بھی اسی کی مناسبت سے استعمال کی جائے گی [illegible] زبان محض اس کے اصلی مضمون کی طرح فلسفیانہ انداز لئے ہوئے ہو بلکہ اس کے اندر ایک ایسا توازن ہو جس میں مضمون کی زبان اور تلخیص کرنے والے کی زبان دونوں کا حسین [illegible]

ایک خاص بات تلخیص کرنے والے کو اپنے ذہن میں یہ رکھنی چاہئے کہ وہ اس مضمون کو تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھے۔ اس کا کام تنقید کرنا نہیں۔ نہ وہ اپنا کوئی خیال ظاہر کر سکتا ہے، بلکہ اسے تو محض مضمون کا خلاصہ کر دینا ہے، اگر وہ اپنی راہ سے ذرا بھی ہٹتا ہے تو مضمون کی افادیت میں یقیناً کمی آجائے گی اور پھر وہ تلخیص نہیں رہے گی بلکہ تنقید ہو جائے گی۔ اس لئے تلخیص کرتے وقت صرف مضمون کے مصنف کے خیالات، مشاہدات اور تجربات کا ہی اظہار کرنا ہے جو اس نے اپنے مضمون میں کئے ہیں یا جو نظریات اس نے پیش کئے ہیں انھیں ہی اپنی تلخیص میں پیش کرنا ہے

اکثر لوگ اپنے مضامین میں مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جس سے خواہ مخواہ مضمون طویل ہو جاتا ہے۔ یا ایک بات کو کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ یا کبھی دوسروں کے مضامین کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں تلخیص کرتے وقت نظر انداز کر دینی چاہئیں۔ تلخیص مثالوں کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ایک بات کو کئی کئی جملوں میں ادا کرنے سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ یہی چند باتیں ہیں جو تلخیص کرتے وقت ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ ورنہ ان کے بغیر اچھی تلخیص وجود میں نہیں آسکتی۔

اردو میں تلخیص کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب تک کوئی ایسا جامع کام نہیں ہو سکا۔ حالانکہ اردو زبان میں جتنے رسائل نکلتے ہیں شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نکلتے ہوں۔ ان رسائل میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی ہر قسم کے اعلیٰ پایہ کے مضامین ہر ماہ آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب کو یکجا کرنے کے لئے کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ کیا کیا لکھا جا رہا ہے۔ اگر ایک شخص کسی موضوع پر تحقیق کر رہا ہے اور اس کے موضوع سے متعلق کہیں کچھ چھپتا ہے تو اسے علم بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب ادب میں انتشار کی وجہ ہے۔ اردو ادب میں پھیلاؤ ہے، وسعت ہے،

لیکن انتشار کے ساتھ، اردو ادب کا قیمتی سرمایہ بکھرا پڑا ہے، اسے ایک لڑی میں پرونے کی ضرورت [illegible] یہ ہر شخص کے امکان سے باہر [illegible] ہر رسالے پر نظر رکھے اور تلاش کرتا [illegible] کہ اس کے مقصد کی چیز کہاں مل سکتی [illegible] لئے ان تمام دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اردو میں ملخص رسائل کا اجراء ہونا چاہئے۔ جو محققین اور عام لوگوں کے لئے نہایت [illegible] رسائل میں جو مضامین نکلتے ہیں ان میں مختلف قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ [illegible] مذہبی، تحقیقی، ادبی، تاریخی وغیرہ۔ تلخیص کے رسائل کی تقسیم بھی اسی طرح ہونی چاہئے۔ کسی میں صرف تاریخی مضامین کی تلخیص ہو، کسی میں مذہبی کی اور کسی میں ادبی کی۔ یہ درجہ بندی تقسیم محققین کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوگی۔ اور انہیں یہ تلاش کرنا نہیں پڑے گا کہ فلاں مضمون کہاں مل سکتا ہے۔ یہ [illegible] طلبا کے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یادِ رفتگاں

ایک مخلص جامعی محمد یوسف صاحب کا انتقال

جامعہ کے ایک معزز گریجویٹ اور سابق کارکن، اور اردو زبان و ادب کے حوصلہ مند ناشر جناب محمد یوسف صاحب جامعی کا ۱۳ دسمبر کی صبح کو ساڑھے دس بجے دہلی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی عمر کوئی ۷۰ سال تھی۔

محمد یوسف صاحب جامعہ کے ان چند ممتاز طلبائے قدیم میں سے تھے جو اپنی مادرِ علمی کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور اردو کے ان چند خدمت گزار ناشروں میں سے تھے، جن کا نصب العین ہے کہ ہر حال میں

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

میں ۳۶ء میں جامعہ کالج میں داخل ہوا تو جامعہ کے مختلف اداروں میں جو نوجوان طلبائے قدیم کام کر رہے تھے، ان میں یوسف صاحب بھی تھے، ان کا تعلق مکتبہ جامعہ کی نشر و اشاعت سے تھا اور طلبائے کالج کی یونین انجمن اتحاد کے حیاتی رکن تھے۔ مجھے شروع ہی سے صحافت نگاری اور نشر و اشاعت سے دلچسپی تھی اور طلبا کی سرگرمیوں میں پابندی کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا، اس لیے موصوف سے بہت جلد میرے تعلقات قائم ہوگئے۔ بعد میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے مکتبہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف اور طباعت کے انچارج کی حیثیت سے کام شروع کیا، تو زمانہ طالب علمی کے یہ تعلقات اور گہرے اور استوار ہوگئے اور امتدادِ زمانے کے ساتھ ساتھ دوستی اور رفاقت کا یہ رشتہ خوشگوار

[illegible] استوار تر ہوتا گیا۔ تیس اکتیس برس کے اس طویل [illegible] شخصیت کے ہر پہلو کو دیکھنے [illegible] موقع ملا اور مجھے اعتراف ہے کہ وہ ہر معاملے میں کھرے اور [illegible] ثابت ہوئے۔ اس پر مشکل دور بھی [illegible] کا بھی، مگر وہ ہمیشہ [illegible] ساتھیوں کی رفاقت کو ہمیشہ یاد رکھا اور تا عمر حق دوستی اور حق رفاقت کو حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا۔

یوسف صاحب یوپی کے ایک تاریخی ضلع فیض آباد کے ایک دیہات کے متوسط گھرانے سے تعلق [illegible] جامعہ میں جب طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو بہت خستہ حال اور پریشان حال تھے مگر [illegible] عزم والا دے کے پکے، چنانچہ نہ صرف تعلیم مکمل کی بلکہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد [illegible] سوجھ بوجھ کی بنا پر بہت جلد اپنی ایک حیثیت بنالی اور پر خلوص جذبۂ خدمت کی بنا پر ان کا ایک وسیع [illegible] قائم ہوگیا۔ ان کے احباب میں ہر طبقے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل [illegible] اور سب لوگوں میں وہ یکساں طور پر مقبول تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار کی یہ عجیب خوبی تھی کہ ان [illegible] اور تعلق رکھنے والوں میں متضاد طبیعت اور رجحان کے لوگ تھے۔ ان میں ایک طرف [illegible] دوسری طرف ادیب اور سیاسی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے ۴۲ء کی قومی تحریک میں اچھا خاصا کام کیا، بعد میں بھی کانگریس کے بعض تعمیری کاموں میں شریک رہے۔ ساتھ ہی مسلم لیگ کے [illegible] ان کے اچھے تعلقات تھے۔ انھوں نے جب رسالہ شاہراہ اور مکتبہ شاہراہ کے ذریعہ اردو کی خدمت کا کام شروع کیا تو ان کے تمام تر مددگار ترقی پسند ادیب تھے، مگر ساتھ ہی ان ادیبوں سے بھی ان کے تعلقات [illegible] جو ترقی پسند نہیں تھے یا ترقی پسندوں کے سخت مخالف تھے اور اب جب ترقی پسندوں میں مارکسی اور غیر مارکسی کئی ٹولیاں بن گئی ہیں تو [illegible] ٹولیوں کے انتہا پسندوں سے بھی ان کے تعلقات قائم رہے، غرض ان کے حلقۂ احباب میں [illegible] کے لوگ ملیں گے اور خاص بات یہ ہے کہ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی فرد یا گروہ کو یوسف صاحب کے خلوص اور دوستی پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ متضاد عناصر مکتبہ شاہراہ کے محدود کمرے میں کبھی کبھی اکٹھا بھی ہو جاتے تھے۔ بحثیں بھی ہوتیں، تلخیاں بھی ہو جاتیں، مگر یوسف صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے مسکراتے رہتے، ہنستے رہتے، کوئی اپنی حدود سے آگے بڑھ جاتا یا کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتا تو تعلقات [illegible]

سے، کسی کو ڈانٹ دیتے، کسی کو خاموش کرتے، کسی کی خوشامد کرتے، مختصر یہ کہ ہر ایک کو خوش رکھنے کی کوشش [illegible]تے اور دوستوں کا حلقہ بدستور قائم رہتا۔

[illegible]یب نہیں تھے، مگر ادیب گر ضرور تھے۔ انھوں نے بہت سے ادیب پیدا کیے اور بہت سے ادیبوں کو شہرت دوام عطا کی۔ شاہراہ کے پہلے اڈیٹر جناب ساحر لدھیانوی ایک شاعر کی [illegible] بے شک مشہور و معروف تھے، مگر صحافت نگار اور ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت شاہراہ [کی] مرہونِ منت ہے۔ ان کے بعد جناب پرکاش پنڈت اڈیٹر مقرر ہوئے تو ہندی کے ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت جو بھی رہی ہو، مجھے اس کا علم نہیں، مگر اُس وقت اردو ادب میں ان کا کوئی مقام نہیں [تھا]۔ شاہراہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے سب سے پہلے وہ اردو ادب میں متعارف ہوئے اور خوشی کی بات [ہے کہ] ان کا اردو کے مستند ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے چوٹی کے ادیبوں کی تخلیقات منظرِ عام پر نہ آتیں، اگر مکتبۂ شاہراہ ان کی اشاعت کی ذمہ داری نہ لیتا۔ یوسف صاحب نے سال بھر کے بہترین ادب کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا اور ان مجموعوں کی وجہ سے اردو ادب میں نہایت مفید اضافہ ہوا۔ یوسف صاحب کتابوں کے علاوہ اور بھی کاروبار کرتے تھے، مگر نقد پیسوں کی تنگی ہمیشہ رہی لیکن پھر بھی کسی اچھی اور مفید کتاب کی اشاعت کا مسئلہ ان کے سامنے آتا تو ہمیشہ ہمدردی سے بات کرتے اور حالات اجازت دیں یا نہ دیں، مگر کسی ادیب کو مشکل ہی سے مایوس کرتے تھے۔ اردو کے ناشروں کا مجھے اچھا خاصا تجربہ ہے، مگر یوسف صاحب جیسا حوصلہ مند ناشر جو نقصانات کے خطرات میں بے محابا کود پڑے، مجھے نہیں ملا۔ آج کل اردو کتابوں کا کاروبار سراسر گھاٹے کا سودا ہے، اس کا اثر مکتبۂ شاہراہ پر بھی پڑا، پھر بھی پچھلے چند برسوں میں انھوں نے بہت اچھی اور معیاری کتابیں شائع کیں، جن سے مالی منفعت کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

یوسف صاحب کو جامعہ سے بڑی محبت تھی۔ ہر درسگاہ کے قدیم طلبا کو اپنی مادرِ علمی سے محبت ہوتی ہے۔ جامعہ کے قدیم طلبا کے بارے میں، میرا خیال ہے کہ ان کا جامعہ سے تعلق اور محبت اوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر یوسف صاحب کی محبت میں مجھے جو خلوص اور لگاؤ نظر آیا وہ بہت ہی قابلِ قدر

ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے مکتبہ جامعہ میں کام شروع کیا اور اپنے خلوص اور کارکردگی کا بہت اچھا ثبوت دیا اور مکتبہ کی قابل قدر خدمت کی۔ ۱۹۴۰ء میں جب مکتبہ کی مالی حالت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں کارکنان مکتبہ کا جلسہ منعقد ہوا اور اس کی حالت کو بہتر بنانے کی صورتوں پر غور کیا گیا تو اس کے علاوہ اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی کہ کارکنوں کی تعداد [illegible] کم کی جا سکے، کر دی جائے، مگر ظاہر ہے عملاً اس میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لیے جامعہ کے طلبائے قدیم نے، جو مکتبہ میں کام کرتے تھے، رضاکارانہ طور پر اپنے استعفے پیش کر دیے۔ ان لوگوں میں [illegible] محمد یوسف صاحب اور راقم الحروف تھا۔ علاء الدین خالد صاحب، جو اگرچہ جامعہ کے طلبائے قدیم میں نہیں تھے، مگر مکتبہ کے ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے، انھوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کر دیا [illegible] جامعہ کے کتب خانہ میں منتقل کر دی گئیں اور ان لوگوں نے اپنا الگ کاروبار شروع کیا۔ بدر الحسن صاحب اور خالد صاحب نے مل کر حالی پبلشنگ ہاؤس خرید لیا۔ قیام پاکستان کے بعد خالد صاحب کراچی [illegible] کاروبار شروع کیا اور اب ماشاء اللہ ان کا پاکستان کے مشہور اور بہت بڑے ناشروں [illegible] ہے۔ خالد صاحب کے چلے جانے کے بعد ان کی جگہ یوسف صاحب نے لے لی اور اردو زبان ادب کی خدمت میں لگ گئے۔ بعد میں حالی پبلشنگ ہاؤس سے الگ ہو کر مکتبہ شاہراہ کی بنیاد رکھی۔ مکتبہ شاہراہ [illegible] شاہراہ کی حیثیت اگرچہ نجی اور شخصی تھی اور یوسف صاحب کے پاس سرمایہ بھی بہت نہیں تھا لیکن پھر بھی [illegible] اردو ادب میں نئے رجحانات اور نئے اسلوب پیدا کرنے میں بڑی مفید اور [illegible] خدمت انجام دی ہے۔

جامعہ سے بے تعلق ہونے کے بعد بھی یوسف صاحب کی جامعہ سے دلچسپی اور اس کی خدمت کا جذبہ بدستور باقی رہا، بلکہ اگر میں یہ عرض کروں کہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے [illegible] انجام دی ہیں، ان میں ایک جیتی جاگتی یادگار طلبائے قدیم کی عمارت ہے۔ یہ عمارت ایک طویل عرصے تک مقروض تھی اور اس کی وجہ سے انجمن طلبائے قدیم کے تصرف میں نہیں تھی۔ دلی کے باہر جامعہ کے بہت سے ایسے قدیم طالب علم تھے جو آسانی سے یہ رقم ادا کر سکتے تھے، دلی کے طلبائے قدیم میں اگر کوئی ایک

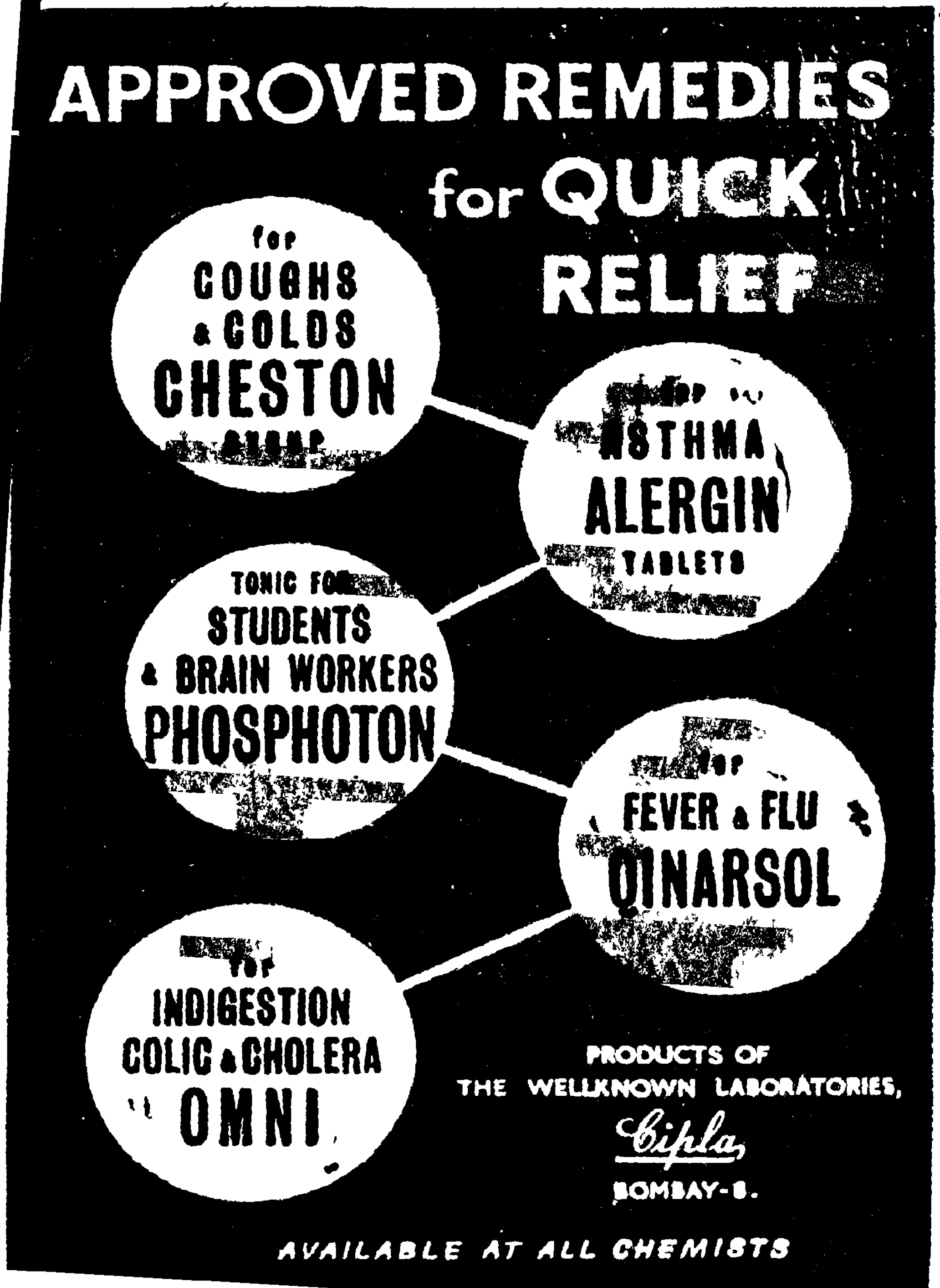
شخص ایسا نہیں تھا قرا تنی تعداد تو تھی ہی جو مل کرا سے ادا کر سکتے تھے، اگر یہ شرف صرف یوسف صاحب کو حاصل ہوا جنہوں نے یکہ و تنہا اس رقم کو ادا کر کے عمارت کو واگزار کرا دیا۔ ایسی مثالیں ایک دو نہیں بہت سی ہیں [illegible] درمے قدمے سخنے مدد کی۔ افسوس کہ ایسا جامعہ ہم [illegible] [illegible] مجھے اس کی خوشی ہے کہ وہ جامعہ نگر ہی میں آسودہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس نے جامعہ اور انجمن طلبائے قدیم کو یاد رکھا، ہم لوگ اس کو یاد رکھیں گے۔

تعزیت

انجمن طلبائے قدیم جامعہ کا ایک تعزیتی جلسہ جناب عبدالغفار مدہولی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا اور مرحوم یوسف صاحب کی خدمات اور ان کی سیرت کی مختلف خوبیوں اور اچھائیوں پر جناب سعید انصاری صاحب نے تقریر کی اور راقم الحروف نے وہ مضمون پڑھکر سنایا جو اوپر [illegible] ہے [illegible] منظور کی گئی، جس میں یوسف کی جامعہ ملیہ سے محبت، انجمن طلبائے قدیم سے گہرے تعلق اور اردو ادب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

جناب قاضی رشید احمد صاحب ہاشمی بھی یوسف صاحب کے زمانۂ ملازمت میں مکتبہ جامعہ میں بحیثیت خزانچی کے کام کرتے تھے۔ موصوف نے مرحوم پر ایک قطعہ کہا ہے [illegible] ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

یوسفِ بازارِ اردو اب کہاں ہیں گام زن [illegible]\
[illegible] راہ زندگی طے کر [illegible] زد [illegible]\
[illegible] کا دن ۱۳ ر دسمبر ایک، نو، چھ، سات سن\
دسواں روزہ ان کے سر پر [illegible] آیا کفن


APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
ALERGIN
TABLETS
TONIC FO
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
FEVER & FLU
QINARSOL
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY-8.
AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

جامعہ

فروری

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

فی پرچہ
پچاس پیسے

سالانہ چندہ
۵ روپے

بابت ماہ فروری ۱۹۷۸ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

کے مابین امیری اور غریبی کا یہ فرق بڑھتا جا رہا ہے، یہ صورت حال امن عالم کے لئے ایک بہت بڑا بہت بڑا ایٹم بم ہے۔

اقوام متحدہ کی دوسری عالمی تجارتی و ترقی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے یکم فروری کو صورت حال کی طرف خاص طور سے مندوبین کی توجہ مبذول کرائی اور کہا کہ جب تک امیر اور درمیان بڑھتے ہوئے فرق کو کم نہ کیا جائے گا، اس وقت تک دنیا میں امن و سکون نہیں ہو سکتا ... لوگ، امن کے خواہاں اور سکون کے متلاشی ہیں، کسی ملک میں جائیے اور کسی سے پوچھئے ... کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص جو صحیح طور پر سوچتا ہے یہ نہیں کہے گا کہ دنیا میں امیری اور ... بڑھتا رہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی بین الاقوامی برادری جس کی نمائندگی اس طرح ... میں ہوتی ہے، یہ طے کرے کہ خوشحال، ترقی یافتہ اور معاشی اعتبار سے طاقتور قوموں کی یہ ذمہ ... کو پچھڑے ہوئے اور ترقی پذیر ملکوں کی معاشی ترقی میں مدد دیں، خیال ہے کہ اس کانفرنس میں وہ اہم مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کیا جائے گا۔

ہمارے دیش میں آج ہر طرف سے یہی آواز آرہی ہے کہ زبان، مذہب، علاقائی مفاد ... پات، مقامی اور غیر مقامی کی تمیز ــــ غرض کسی معاملے میں تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں ... ورنہ ملک کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارے سماج میں مختلف ... کی بیماریاں زور پکڑ گئی ہیں، لیکن یہ کیا بات ہے کہ بتانے والے بتاتے ہیں کہ بیماریاں کیا کیا ہیں ... کہاں ہیں، اور سننے والا کوئی نظر نہیں آتا، کیا یہ صورت حال جسے ہم بےحسی سے تعبیر کر سکتے ہیں ... بیماری نہیں ہے جس میں پوری قوم مبتلا معلوم ہوتی ہے، بےحسی کی زندگی جانوروں کی زندگی ہو ... جانوروں کے لئے کسی اخلاقی قدر کی پابندی نہیں، اب ایسا تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم سب کے سب ... ہیں، لیکن بےحسی کی یہ زندگی، زندگی نہیں کہی جا سکتی، کچھ اور ہو سکتی ہے، ہمارا خیال ہے کہ دیش کی آ... ایک اخلاقی بحران سے دوچار ہے، یہ بحران ہو سکتا ہے کہ ابھی اور بڑھے اور حالات کی تاریکیا...

چاہئیں کہ طلوعِ آفتاب ناگزیر ہو جائے، پہلے بھی ایسا ہوا ہے، بحران اور اضطراب جب بہت بڑھا ہے تو
[illegible] اور وطن کی کوکھ سے کسی عظیم ہستی نے جنم لیا ہے اور اس عظیم ہستی نے ملک کے ضمیر کو بیدار کیا ہے
لئے انتشار اور اضطراب کے اس [illegible] ہونا چاہئے۔

[illegible] ادبی رسالہ 'گفتگو' علی سردار جعفری کی ادارت میں بڑے سلیقہ سے شائع ہوتا
[illegible] شارہ [illegible] اس وقت سامنے ہے، اس میں ایک پرانی بحث 'یہ بربریت کیوں؟' مرتّب کے [illegible]
[illegible] نوٹ کے ساتھ خواجہ احمد عباس صاحب کے قلم سے ہے۔ یہ بحث بڑی دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی
[illegible] اس بحث کی یہ تھی کہ آزادی اور تقسیم کے بعد شمالی ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر
[illegible] رامانند ساگر نے جب اپنا ناول "اور انسان مر گیا" لکھا تو اس پر خواجہ صاحب سے دیباچہ لکھوایا،
یہ دیباچہ ترقی پسندوں میں بحث کا موضوع بن گیا، جو واقف کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں جب
یہ ناول چھپا تھا عام طور پر اشتراکی ادیبوں کا موڈ کچھ اور تھا، اس لئے خواجہ صاحب کے اس دیباچے کی خوب خوب
دھجیاں اڑائی گئیں اور انھیں رجعت پرست، عوام دشمن اور سامراج دوست ایسے خطابوں سے نوازا
[illegible] نے تمام الزاموں کا جواب یعنی اپنی صفائی کا بیان اسی وقت قلمبند کر لیا تھا، مگر کسی وجہ
[illegible] اس وقت چھپ نہیں سکا، اب 'گفتگو' میں اُن کا وہ مضمون انیس سال بعد شائع ہوا ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ، جیسا کہ احمد عباس صاحب نے لکھا ہے، یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند ہوتے
[illegible] کمیونسٹ نظریات کو سو فیصدی قبول نہیں کیا تھا اور ان کے خیال میں ان پر عتاب کی یہی وجہ
[illegible] یہاں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا کسی ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی بندھے ٹکے سیاسی
[illegible] اور کیا کسی ادیب سے اس کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ادیب
[illegible] سے آزاد ہونا چاہئے، البتہ یہ ضرور ہونا چاہئے کہ اُس کی تحریروں سے ترقی، ذہنی روشنی،
[illegible] بیداری، انسان دوستی اور شریفانہ جذبات کو بڑھاوا ملے، ادب برائے انقلاب اور ادب

برائے زندگی میں بڑا فرق ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر انقلاب بہتر زندگی کا نقیب ہی ہو، ایسا بھی ہوا ہے کہ انقلابات بڑی نیک نیتی اور خوش آیند آرزوؤں کے ساتھ برپا کئے گئے لیکن وہی آگے چل کر انسانی آزادی اور مساوات کے حق میں سم قاتل بن گئے، مارکس نے انقلاب فرانس کا تجزیہ اسی طرح کے حقائق کی روشنی میں کیا تھا۔ پائدار ادب اپنی پوری گمبھیرتا کے ساتھ بہتر سماجی نظام کے لئے ذہنوں کو تیار کرتا ہے، پہلے سے ناقص اور مضر سماجی اور معاشی نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کے دل و دماغ کی تربیت بھی کرتا ہے کہ وہ نیکی اور بدی، حق اور ناحق، خودغرضی اور بے غرضی، انصاف اور ناانصافی، نفرت اور محبت کے بنیادی فرق کا احساس و ادراک کر سکے اور خود پہلے اپنے نفس سے جہاد کر لے تاکہ روحانی اور اخلاقی طور پر جہاد زندگی کے لئے تیار ہو سکے، دنیا کے بڑے ادیبوں نے جنھوں نے کلاسکی مرتبہ حاصل کر لیا ہے، انقلاب کا انتظار نہیں کیا بلکہ انھوں نے انقلاب، یا دوسرے لفظوں میں بہتر زندگی کے لئے، ذہن انسانی کو تیار کیا، ایسے تمام ادیب ترقی پسند تھے اور مہذب دنیا اُن کی خدمات کی معترف ہے۔

یہ بات خوشی کی ہے کہ ہمارے وہ ترقی پسند ادیب جو پہلے محض انقلاب کی باتیں کرتے تھے، اب ادب اور زندگی کے اس راز کو پا گئے ہیں اور بڑے سلیقے سے اس کی تشریح کرتے ہیں، ۱۹۴۸ء کی ”انقلاب بردوش فضا“ میں غالباً یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ترقی پسند ادیب کبیر داس کا نام لے اور رجعت پرستی کے الزام سے بچ جائے، لیکن آج یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ایک سینئر اور مشہور ترقی پسند ادیب اپنے موقف کی تائید کے لئے کبیر کی خالص متصوفانہ پکار کا سہارا لیتا ہے، اور انسانوں کی ذہنی و روحانی تبدیلی کو ضروری قرار دیتے ہوئے کبیر داس کے یہ الفاظ اعتماد اور یقین کے ساتھ دہراتا ہے: ”جسم و جان کے رن میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے، ہوس، غصہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہیں، صبر، قناعت اور صداقت کی بادشاہت میں شمشیر کا نام بلند ہو رہا ہے .... صداقت کے متلاشی کی جد و جہد بہت دشوار ہے، سورما کی لڑائی دو چار گھنٹے چلتی ہے ... لیکن صداقت کا متلاشی دن رات جنگ کرتا ہے، اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہتی ہے۔“

ضیاء الحسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(۱۷۱۲ ـــ ۱۷۷۸ء)

[illegible] سے متعلق متضاد رائیں بیان کی گئی ہیں، کوئی اُسے فلسفی کہتا ہے اور کوئی محض آوارہ منش اور منتشر المزاج شخص جس نے اپنے ذاتی مصائب کے ردعمل کے طور پر اپنے عہد کی ہر چیز کی نفی کی، ان دونوں رایوں میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے، اٹھارویں صدی میں 'فلسفی' کا لفظ جس مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا. اُس لحاظ سے تو اُسے فلسفی کہہ سکتے ہیں لیکن آج کے معیار پر اسے کسی طرح فلسفی نہیں کہا جا سکتا، پھر بھی اس نے جو کچھ لکھا اس بنیاد پر اُسے محض منتشر المزاج بھی نہیں کہا جا سکتا، اس کی تحریروں کا اثر ہوا اور اتنا اثر ہوا کہ اُس کا شمار انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کے ارکان ثلاثہ میں ہوتا ہے. اپنے خیالات وافکار کی بنا پر وہ بلاشبہ اپنے عہد کی ایک دور آفریں سماجی طاقت بن گیا تھا. اس کی تحریروں کے اثر سے جرمنی، فرانس اور انگلینڈ میں نئی سیاسی اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا.

ایک مرتبہ ایک مجلس میں انگریزی علم وادب کا غیر معمولی انسان اور انقلاب فرانس کا سب سے بہتر [illegible] کارلائل موجود تھا، لوگ فلسفیوں کی خیالی نقش آرائیوں پر بحث کر رہے تھے. ایک شخص [illegible] اجتماع ومعاشرت کے انقلابات کے نقشے ایک دل خوش کن تخیل سے زیادہ نہیں [illegible] سے زنی کی بھنک کارلائل کے کانوں میں پڑی، اس نے مجمع کو مخاطب

حضرات، کچھ عرصہ گذرا اس دنیا میں ایک شخص تھا، روسو، اس نے ایک کتاب لکھی تھی جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بہت سے آدمیوں نے اس کی ہنسی اڑائی، لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی جلد باندھنے کے لئے ان ہی لوگوں کے جسم کا چمڑا استعمال کیا گیا جنھوں نے اس کی ہنسی اڑائی تھی۔" قطع نظر اِس کے کہ اس واقعہ میں کتنی حقیقت ہے، اس سے روسو کی تحریروں کی اثر آفرینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اُس نے کیا کہا اور کیا لکھا یہ جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ اُس کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ اِس سے اُس خمیر کا پتہ چل جائے گا جس سے اس کا نظام فکر، اگر ہم اسے نظام فکر کہہ سکیں، تیار ہوا تھا۔

روسو ۱۷۱۲ء میں سوئستان کے شہر جنیوا میں پیدا ہوا، اُس کا باپ آئزک روسو ایک غریب گھڑی ساز تھا، بعد میں اس نے عورتوں کو ناچ سکھانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، اس کی ماں ایک شریف عورت تھی لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اس نیک خاتون کی آغوشِ محبت میں پرورش پائے، چنانچہ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ ماں کا انتقال ہو گیا، اُس کا باپ کیلونی چرچ کا ماننے والا تھا، اسی لئے اس مسلک پر اُس کی تعلیم بھی ہوئی، چھ سال کی عمر میں اُس نے پڑھنا شروع کیا، ساتھ ہی باپ اُسے افسانے اور خیالی قصے پڑھ کر سناتا۔ اس کا نانا ایک تعلیم یافتہ پادری تھا اور اُس کی ذاتی لائبریری میں تاریخ اور ادب کی اچھی کتابیں تھیں، اس نے "اعترافات" میں ایسی کئی اچھی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں پلوٹارک

۱۔ روسو نے اپنی زندگی کے حالات اپنی خود نوشت سوانح حیات "اعترافات" میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن اس نے بہت سی باتیں صحیح نہیں لکھی ہیں، اُسے اس بات میں لطف آتا تھا کہ اپنے آپ کو بڑا گنہگار ثابت کرے، لیکن خارجی شواہد بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معمولی نیکی اور اخلاق سے بھی عاری تھا اور اس سے وہ کبھی پریشان اور نادم نہیں ہوا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے دل میں بڑا سوز و گداز ہے، یہ اور بات ہے کہ اپنے بہترین دوستوں کو بھی وہ اپنی چھوٹی حرکتوں سے نہیں بخشتا تھا۔

کی 'مشاہیر کی سوانح حیات' کا خاص طور سے ذکر ہے، پلوٹارک اُسے بہت پسند تھا، اس کے سوانح نگار
جان مورلے نے لکھا ہے کہ اپنی عمر کے آخری دنوں میں بھی جب کہ اس نے مطالعہ تقریباً ترک کر دیا تھا وہ
پلوٹارک کو پڑھا کرتا تھا، اس نے کہا ہے کہ غالباً وہی ایک مصنف ہے جس سے اس نے ہمیشہ استفادہ کیا
ہے۔ لیکن باپ کے ساتھ موم بتی کی روشنی میں ناول اور افسانے پڑھنے کے سبب بچپن ہی سے اس میں
تخیل پرستی رچ بس گئی اور اس کی سیرت کا توازن بگڑ گیا، ابھی وہ دس سال ہی کا تھا کہ اس کا باپ
[illegible] کر فرار ہو گیا، ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اب اس کی
پرورش اور [illegible] پڑوسیوں کے ذمہ تھی، روسو کے ایک چچا تھے برنارڈ، انھوں نے
اُسے [illegible] کے ساتھ بوسی نام کے گاؤں میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کے پاس حصول تعلیم کے لئے
[illegible] سے زیادہ نہیں رہ سکا، جن حالات میں اس نے بوسی کو چھوڑا وہ اپنے
[illegible] اعترافات' میں اس نے اس کا ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار
کیا ہے ان سے اس کی جذباتی طبیعت کے ہیجان کا اندازہ ہوتا ہے، بوسی کے قیام کے دوران پادری
کی [illegible] اس پر کنگھا توڑنے کا الزام لگایا، حالانکہ اس کے کہنے کے مطابق وہ بے قصور تھا، اس
[illegible] سختیاں کی گئیں اور اس کی اطلاع اس کے چچا کو بھی کی گئی، لیکن اس نے برابر انکار کیا،
[illegible] ہے: "اس واقعہ پر تقریباً پچاس سال گذر گئے اور اب مجھے اس کا خطرہ بھی
نہیں رہا کہ میں اس کے لئے سزا کا مستحق ٹھہرایا جاؤں گا، اس کے باوجود میں خدا کے سامنے یہ بات کہتا
[illegible] میں بالکل بے قصور تھا، میں نے تو کنگھے کو چھوا تک نہ تھا، مجھے کچھ معلوم بھی نہیں تھا، مجھ سے یہ
پوچھنا کہ نقصان کیسے ہوا بیکار تھا، میں نہیں جانتا، میں سمجھ بھی نہیں سکتا، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ
اس سے میرا کوئی تعلق نہیں [illegible]۔ اب ذرا اس بچے کا تصور کیجئے جو شرمیلا اور فرمانبردار تھا لیکن
[illegible] جذبات رکھتا تھا، ایسا بچہ جو معقولیت اور شریفانہ اور منصفانہ برتاؤ کا عادی تھا، اور
جو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اُن لوگوں کے ہاتھوں ایسی خوفناک ناانصافی کا شکار ہوا تھا جن سے وہ محبت
کرتا تھا اور جن کے ساتھ [illegible] انتہائی ادب سے پیش آتا تھا ـــــ خیالات کا وہ ہیجان، جذبات

[illegible] اس کے دل، اس کے دماغ اور اس کی اخلاقی قدروں کی چھوٹی سی دنیا میں وہ انقلاب! اگر آپ کر سکیں تو اس تمام اندرونی خلفشار کا تصور کیجئے ـــــ اب جبکہ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں [illegible]، وہ لمحات مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے خواہ مجھے عمر خضر ہی کیوں نہ مل جائے، تشدد اور ناانصافی سے متعلق میرا وہ احساس اب بھی زندہ ہے، اس نے میری روح کو بری طرح متاثر کیا ہے اور [illegible] دل پر ایک غیر فانی نقش چھوڑا ہے، وہ احساس جو اس وقت صرف میری ذات سے متعلق تھا اب اتنا پختہ اور ذاتی مفاد سے اتنا بے تعلق ہو گیا ہے کہ اب جب کبھی میں کسی ناانصافی کو دیکھتا یا سنتا ہوں خواہ وہ کہیں ہو اور کوئی بھی اس کا شکار ہو میرے دل میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ـــــ جب کسی ظالم کی ستم رانیوں کے بارے میں پڑھتا ہوں یا کسی شیطان صفت پادری کی شاطرانہ وحشتناکیوں کا مطالعہ کرتا ہوں، تو میں اپنے آپ کو خوشی سے اس کے لئے تیار پاتا ہوں کہ جاؤں اور جا کر اس کے سینہ میں خنجر پیوست کر دوں، چاہے مجھے اس جرم کی پاداش میں سیکڑوں بار کیوں نہ مرنا پڑے۔"

اس واقعہ کے بعد اس کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور کچھ دنوں بعد اسے ایک سنگ تراش کے پاس کام سیکھنے کے لئے رکھا گیا، لیکن اس مرتبہ استاد سے اس کی نہیں بنی، سنگ تراش سخت آدمی تھا، اور اس کی سختی روسو کے مزاج کے تلون پر قابو نہ پا سکی، اس کا کہنا ہے کہ یہیں اس نے جھوٹ بولنا سیکھا، یہیں اس نے چوری سیکھی اور اسی کے یہاں اسے یہ معلوم ہوا کہ سستی اور کاہلی ایک نعمت ہے۔ سنگ تراش کے یہاں کام میں اس کا جی نہ لگتا تو وہ کتابیں پڑھتا جنھیں وہ کرایے پر ایک دوکان سے لاتا تھا، اس طرح اس کا مطالعہ جاری رہا، کبھی کبھی اسے اپنی ٹائی اور قمیص بیچ کر کتابوں کا کرایہ یا کھوئی ہوئی کتاب کی قیمت ادا کرنی پڑی، ایک سال سے کم مدت میں اس نے اس دوکان کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اب وہ اپنے سنگتراش معلم کی دوکان پر بیکار رہنے لگا کیونکہ یہ کام اس کی طبیعت کے مطابق نہیں تھا، اس وقت اس کی عمر سولہ سال کی ہو گی، اور اس کی ذہنی حالت یہ تھی کہ وہ زندگی سے بیزار تھا، ماحول سے متنفر، سوسائٹی کی ہنگامہ آرائیوں سے گریزاں، عزلت نشینی کا خواہاں، ذرا سی بات پر رو دینا اور بغیر کسی خاص صدمہ کے آہیں بھرنا یہ تھی اس کی ذہنی کیفیت، عمر کی یہ منزل وہ ہوتی ہے جب عام طور پر

لوگ زندگی کے لفظ سے بھی آشنا نہیں ہوتے، یہی عالم تھا کہ ایک دن جب وہ شہر کے باہر گیا اور [illegible]
میں اس قدر دیر کر دی کہ شہر کے دروازے بند ہو گئے تو اس نے شہر پناہ پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، وطن
کو الوداع کہا اور دنیا کی سیر کو نکل پڑا، نہ معلوم وہ کون سی گھڑی تھی کہ اس دن کے بعد پھر اسے کہیں

[illegible] اسے نکل کر وہ سوائے (Savoy) پہونچا اس حالت میں کہ اس کے پاس زندگی گذارنے
کا کوئی سامان نہ تھا، مجبور ہو کر وہ ایک کیتھولک پادری کے پاس پہونچتا ہے اور اس سے درخواست کرتا
ہے کہ اسے کیتھولک چرچ میں داخل کر لیا جائے۔ اس طرح اس نے اپنا آبائی مسلک ترک کر دیا، اس
[illegible] کہ تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں اس کی نیت میں اخلاص نہیں تھا۔ "میں یہ خیال اپنے ذہن سے
[illegible] مقدس کام جو میں کرنے والا تھا، دراصل ایک لٹیرے کا کام تھا" لیکن یہ بات اس
نے اس وقت کہی جب اس نے پھر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا تھا، بہرحال کیتھولک مذہب اختیار
کرنے کے بعد وہ ان سی کے چرچ میں بھیجدیا گیا، چرچ کی انچارج ایک خاتون مادام دے وران تھیں، ر
اس نے "اعترافات" میں مادام کے حسن، ذہانت اور مہذب طور طریقے کی بڑی تعریف کی ہے، اس نے
[illegible] میں نے انھیں دیکھا اور بس انھیں کا ہو گیا، میں نے سوچا کہ جس مذہب کی تبلیغ اتنی حسین شخصیت
کرتی ہوگی وہ مذہب یقیناً جنت کی بشارت دیتا ہوگا، کوئی نو دس سال وہ اس خاتون کے ساتھ
[illegible] سے آسودگی اور اطمینان سے گذرا، یہاں کے قیام کے دوران اسے ہر طرح کے
لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، عالم بھی اور فنکار بھی، معالج بھی اور بیمار بھی،
مذہبی اشخاص بھی اور لا مذہب بھی، اور اس نے ہر شخص سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا، یہیں اس نے دینیات
کا سبق پڑھے، موسیقی کا علم حاصل کیا اور لاطینی زبان میں دستگاہ بہم پہنچائی، سیاسی اور سماجی مسئلے
اس کی توجہ کا مرکز بنے اور اپنی بعض تصنیفوں کا ابتدائی خاکہ بھی اس نے یہیں اپنے ذہن میں جمایا ـــــ
اور آخر کار ایک دن مادام دے وران کی بے وفائیوں سے تنگ آ کر امید و بیم کی نئی جولانگاہ کی تلاش
میں [illegible] ہوا۔ اس کے بعد وہ تین چار سال تک ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہا، لیاں میں اس کا

قیام کچھ زیادہ رہا اور یہیں اُس نے پیرس جانے کا منصوبہ بنایا، اپنی بعض کتابیں فروخت کرکے زادِ سفر کا انتظام کیا اور دو چار تعارفی خطوط لے کر غالباً ۱۷۴۲ء میں اپنی کامیڈی نارسیس اور فنِ موسیقی پر ایک نوٹس کے [illegible] پیرس میں وارد ہوا۔

شروع میں پیرس میں اسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن رفتہ رفتہ لوگ اسے جاننے لگے، قیام پیرس کی ابتدائی منزل ہی میں اُس کے تعلقات ڈیڈرو سے ہو گئے اور اس کے وسیلے سے اس کے تعارف کا حلقہ وسیع ہوا، اسی زمانے میں اُس نے فرانسیسی اور اطالوی ادب کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا، ساتھ ہی اُس نے شطرنج کے کھیل میں بھی مہارت حاصل کرلی، اس سلسلے میں اس نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنی اس 'نئی حماقت' کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر کوئی شخص کسی فن میں پوری دستگاہ بہم پہونچا لے تو دنیا اس کو ضرور تلاش کرے گی، لہذا مجھے بھی کسی نہ کسی فن کا ماہر ہونا چاہئے تاکہ دنیا میری ضرورت بھی محسوس کرے اور مجھے تلاش کرے۔" مگر شطرنج سے پیٹ تو بھر نہیں سکتا تھا اس لئے گذر بسر کے لئے وہ موسیقی کے تختوں کی نقلیں کیا کرتا تھا، وہ آپرا کی موسیقی بھی مرتب کرتا تھا اور امیر گھرانوں کی عورتوں کو موسیقی بھی سکھاتا تھا، جب وہ ادبی حلقوں میں متعارف ہوا تو مادام ڈیوپاں نے جو طبقۂ اُمرا کی ایک حسین و جمیل اور علم و فن کی سرپرستی کی دعویدار خاتون تھیں، اُسے اپنا سکریٹری مقرر کرلیا۔ اسی زمانے میں ڈیڈرو نے اپنی قاموس (انسائیکلوپیڈیا) کے لئے اُس سے موسیقی کے مختلف موضوعوں پر مضمون لکھوائے اور یہی وہ زمانہ ہے جب ڈیڈرو کو ایک کتابچہ لکھنے کے جرم میں تین مہینے کے لئے وین سین کے جیل خانے بھیج دیا گیا، ایک دن وہ اپنے دوست سے ملنے وین سین جا رہا تھا، اُس کے ہاتھ میں لے مرکیور (Le Mercure) اخبار تھا، راستہ میں ایک درخت کے پیچھے دم ستانے کے لئے رُکا اور اخبار دیکھنے لگا، اس میں اُس نے پڑھا کہ دیژوں کی اکیڈیمی نے ایک انعامی مضمون کا اعلان کیا ہے، عنوان تھا "علوم و فنون کے احیاء سے اخلاق کو ترقی ہوئی ہے یا نہیں؟" اب وہ بیٹھ گیا اور اس پر غور کرنے لگا تو اُس کے دماغ میں افکار و خیالات کا ایک ہجوم امنڈ آیا، اپنے دل و دماغ کی اُس کیفیت کا حال اُس نے یوں قلمبند کیا ہے:

[illegible] پر نظر پڑتے ہی میری دنیا بدل گئی، اچانک کائنات مکمل کر میرے سامنے آگئی۔ [illegible] اگر وجدان کوئی چیز ہے تو اس کا احساس مجھے اسی لمحہ ہوا جب میری نظر ان الفاظ پر پڑی، میرا ذہن روشنی سے معمور ہو گیا، خیالات کا ایک سیلاب تھا کہ رکنے کا نام نہ لیتا تھا، یہ سیلاب اتنا تند اور ہنگامہ خیز تھا کہ وقتی طور پر میں ایک ایسے ہیجان میں مبتلا ہو گیا جسے میں بیان نہیں کر سکتا، مجھ پر خمار کی سی کیفیت طاری ہو گئی، میرا دل دھڑکنے لگا اور میں درخت [illegible] لیٹ گیا، کوئی آدھ گھنٹے بعد اس کیفیت کا نشہ جب اترا تو میں نے اپنے کوٹ [illegible] آنسوؤں سے تر پایا، یہ آنسو کب نکلے اس کی مجھے خبر بھی نہیں، میں نے اس درخت [illegible] محسوس کیا اگر میں اس کا چوتھائی حصہ بھی قلمبند کر سکتا تو میں کس خوبی اور صفائی [illegible] تو اپنے سماجی نظام کے متضاد اور متصادم عناصر کا بھانڈا پھوڑتا! کتنے زوردار انداز میں اپنے اداروں کی غلط کاریوں اور مضرت رسانیوں کا پردہ چاک کرتا! اور کتنی سادگی سے دنیا کو بتاتا کہ آدمی فطری طور پر نیک ہے اور یہ ہمارے ادارے ہیں جنہوں نے اسے بدطینت اور بدکار بنا دیا ہے۔"

[illegible] مقالہ لکھا اور مخالفت میں لکھا لیکن اسے پہلا انعام ملا، یہ ۱۷۴۹ء کا واقعہ ہے [illegible] شہرت کا دروازہ کھل گیا اور جلد ہی وہ اپنے زمانے کا ممتاز عالم تسلیم کر لیا گیا، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی زندگی کی مصیبتیں بھی ختم ہو گئیں۔

[illegible] زمانے میں وہ مادام دیوپاں کا سکریٹری تھا، اسے کچھ عرصہ کے لئے وینس میں فرانسیسی سفیر کے [illegible] کام کرنے کا موقع ملا، لیکن سفیر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور پیرس واپس [illegible] میں اس نے قیام کیا اس کی مالکہ آرلیاں کی رہنے والی تھی، وہ اپنی مدد کے [illegible] ایک لڑکی لائی تھی جس کا نام تھریسی تھا، تھریسی کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا لیکن بعد میں اس خاندان پر مصیبت آئی اور تھریسی کو مجبوراً پیرس آنا پڑا۔ روسو نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو اپنے دل میں اس کے لئے ایک کشش محسوس کی، پھر اسے اس کی مظلوم جوانی پر بھی ترس آیا [illegible]

دیکھا تھا کہ ہوٹل میں آنے والے اس کی معصومیت، سادگی اور مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں روسو اس سے اظہار ہمدردی کرتا اور تسلی تشفی دیتا، اس طرح دونوں ایک دوسرے سے قریب آئے اور عمر بھر ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا اور انھوں نے اس فیصلہ پر عمل بھی کیا اگرچہ انھوں نے شادی نہیں کی، تھریسی سے روسو کے پانچ بچے ہوئے لیکن ان میں سے کسی کی پرورش کا بوجھ اُس نے نہیں اٹھایا۔ سب کے سب فاؤنڈلنگ ہاسپٹل میں پلے بڑھے، آج تک کوئی یہ نہیں سمجھ سکا کہ تھریسی کی کس بات نے روسو کو متاثر کیا۔ وہ بالکل الھڑ تھی، ان پڑھ اور پیرس کے تمدن سے قطعاً نا آشنا، عجیب بات ہے کہ وہ تھوڑا بہت لکھ لیتی تھی لیکن پڑھنا اسے بالکل نہ آتا تھا، وہ گھڑی دیکھ کر ٹھیک وقت بھی نہیں بتا سکتی تھی، سال کے بارہ مہینوں کے نام بھی اسے یاد نہیں تھے، روپے پیسے کا حساب اس کے بس کا نہیں تھا، وہ اپنی بات سمجھانے کے لئے مناسب الفاظ بھی استعمال نہیں کرسکتی تھی، اس کی ماں لالچی اور پیسہ کھینچنے والی عورت تھی، لیکن ان سب کے باوجود روسو نے اسے اپنی شریک حیات بناکر رکھا۔

ڈیژون اکیڈمی نے جس مقالے پر روسو کو انعام دیا تھا، جب وہ شائع ہوا تو علمی دنیا میں ایک انقلاب آگیا، پرانی قدروں کے حامیوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنالیا، اس میں وہ لوگ بھی تھے جن میں اس کی اہلیت نہیں تھی کہ اس گراں قدر علمی مقالے پر تنقید کرسکیں اور وہ لوگ بھی جو علمی و ادبی حلقوں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، اس میں شہزادے بھی تھے، بادشاہ بھی تھے اور کلیسائی اقتدار کے محافظ بھی، لیکن روسو ان میں سے کسی سے خائف نہیں ہوا اور یہ ثابت کردیا کہ ایک معمولی شہری بھی اپنے موقف پر جما رہ سکتا ہے۔ اس مقالے اور اس سے زیادہ اس کی جرارت نے اہل پیرس کو اس کی طرف متوجہ کیا اور ملاقاتیوں کا ایک تانتا بندھ گیا، تحفے تحائف بھی آنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ اس صورت حال سے گھبرا گیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ "یہ کوئی آسان کام نہیں کہ اس دنیا میں آدمی آزادی اور غریبی پر قناعت کرکے سکھ سے رہ سکے، میں اپنے آپ میں منہمک رہنا چاہتا تھا لیکن لوگ اسے بھی پسند نہیں کرتے تھے، وہ میرا وقت خراب کرتے تھے اور اس کے لئے ہزار بہانے ڈھونڈتے تھے، میں

محسوس کیا کہ وہ مجھے جلد ہی ایک تماشا بنا دیں گے، میرے نزدیک اس سے بڑھ کر بے رحم اور تباہ کن غلامی اور کوئی نہیں، اس لئے میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں کسی کا لحاظ کئے بغیر چھوٹے بڑے تمام ہدیے واپس کردوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحفے تحائف کی بارش شروع ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میری مزاحمتی صلاحیتوں پر قابو پانا چاہتے تھے، لیکن جب انھیں مایوسی ہوئی تو پھر وہ میرے انکار کو نمود و نمائش اور غرور و نخوت سے تعبیر کرنے لگے۔

[illegible] میں روسو نے Devin du village ایک غنائی تمثیل لکھی، اس تمثیل کا منظر عام پر آنا تھا کہ سارے پیرس میں اس کی دھوم مچ گئی، لیکن یہ شہرت اُس کے لئے مصیبت بن گئی، دوسرے ادیب اور تمثیل نگار اس سے حسد کرنے اور اس کے خلاف سازشوں کا جال بننے لگے، اس کی یہ تمثیل شاہی دربار میں بھی اسٹیج کی گئی اور بہت پسند کی گئی، خاص طور سے میوزک کی فنکارانہ ترتیب نے ناظرین کا دل [illegible] اس موقع پر خود موجود تھا۔ اُسی دن اُسے یہ پیغام ملا کہ اُسے کل گیارہ بجے بادشاہ کے [illegible] ہونا ہے، پیغام دینے والے نے یہ بھی کہا کہ بادشاہ غالبًا اس کے لئے وظیفہ کا اعلان کریں گے، روسو نے تمام رات آنے والی اِس آزمائش کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ بادشاہ کے سامنے نہیں جائے گا، پیرس کا خوشامد پسند طبقہ اس کی اس حرکت پر حیران و ششدر رہ گیا، دشمنوں نے اُسے مغرور و خود بیں قرار دیا اور دوستوں نے اسے احمق کہا، حتیٰ کہ ڈیڈرو بھی اُس کی اس حرکت کی عظمت کو نہ سمجھ سکا۔

۱۷۵۳ء میں دیژون اکیڈیمی کی طرف سے ایک اور انعامی مضمون کا اعلان کیا گیا جس کا عنوان تھا "انسانوں میں عدم مساوات کی ابتدا" بلاشبہ عنوان اہم اور علمی تھا اور اٹھارویں صدی کے جاگیردارانہ

[illegible] نے اپنی کتاب میں اِسے معمولی واقعہ کے طور پر ذکر کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے روسو کے بیان کو مبالغہ تصور کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ چونکہ روسو جسمانی طور پر کمزور واقع ہوا تھا اور وہ بادشاہ کے حضور دماغ اور جسم کی ہیجانی کیفیات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے اس نے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔

استبداد کے عہد میں اکیڈیمی نے اس کا اعلان کرکے بڑی جرأت اور ترقی پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ روسو نے [illegible] مقالہ لکھا اور اگرچہ اس دفعہ اس کو پہلا انعام نہیں مل سکا لیکن بعد میں جب [illegible] نے چھاپا تو اسے بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی،

روسو نے اپنا یہ مضمون والٹیر کو بھیجا جس نے اُسے اپنے خاص انداز میں جواب لکھا۔

"نسل انسانی کے خلاف مجھے تمہاری نئی کتاب ملی۔ میں اس کے لئے تمہارا ممنون ہوں، ہم سب کو احمق بنانے کے لئے اس سے پہلے اس طرح کی ذہانت اور چابکدستی کسی اور نے نہیں دکھائی تھی، تمہاری کتاب پڑھنے سے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے کہ چاروں ہاتھ پیر پر چلا جائے، لیکن اب جبکہ ساٹھ برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا، میں نے یہ عادت چھوڑ دی ہے، اس بات سے کہ میں اسے دوبارہ شروع نہیں کرسکتا۔ مجھے کسی قدر دکھ ہوتا ہے، نہ تو مجھ میں اتنی سکت ہے کہ میں کینیڈا کے وحشیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں کیونکہ وہ بیماریاں جو مجھے لاحق ہیں اُن کے علاج کے لئے ضروری ہے کہ میں کسی یورپین ڈاکٹر کو تلاش کروں، اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس علاقہ میں جنگ ہو رہی ہے اور ہمارے اعمال نے جو مثال قائم کی ہے اُس سے وحشی بھی اتنے ہی پست ہو گئے ہیں جتنے کہ ہم ہیں۔"

اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ بعد میں روسو اور والٹیر کے اختلافات بہت بڑھ گئے، تعجب اس پر ہونا چاہئے کہ اس سے پہلے دونوں میں جھگڑا کیوں نہیں ہوا۔

۱۷۵۴ء میں جب اس کے وطن جنیوا تک اس کی شہرت پہونچی تو اُسے جنیوا آنے کی دعوت دی گئی، روسو نے اس دعوت کو منظور کیا اور تھریسی کو ساتھ لے کر اپنے وطن پہونچا جہاں لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اس شہر میں اس کا گھر تھا، بیالیس سال پہلے وہ یہیں پیدا ہوا تھا، یہیں اس نے اپنے باپ کی گود میں بیٹھ کر پڑھنا لکھنا سیکھا تھا اور یہیں کی خاک اور آب و ہوا سے اس کے جمہوریت پسند شعور کا خمیر تیار ہوا تھا، اب جب اس نے ایک بار پھر اس سرزمین پر قدم رکھا تو یہاں کی جمہوری اسپرٹ نے اس کے دل کو امنگوں سے معمور کر دیا، وطن کی محبت نے اپنا رنگ دکھایا اور اُسے شرم دلائی کہ

وہ اپنے وطن کا شہری نہیں ہو سکتا محض اس لیے کہ اس نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ دیا تھا، یہ احساسِ ندامت اتنا قوی ثابت ہوا کہ اس نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار اور جنیوا میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا، روسو جیسے مزاج کے شخص کے نزدیک یہ بات بڑی عجیب و غریب تھی کہ ایک مذہب کے ماننے والے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر اس مذہب کی مختلف شکلیں بنالیں اور ہر گروہ اپنی بنائی ہوئی شکل ہی کو سچے مذہب سے تعبیر کرے، اس کا خیال تھا کہ عیسائیت پر اُن لوگوں نے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اختلافات کے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں، اس لئے ہر ملک کے ساورن (مقتدر اعلیٰ) کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ وہ تمام شہریوں کو پرستش کا ایک ہی طریقہ متعین کر دے اور پھر ہر شہری کو چاہیئے کہ وہ قانون کے آگے سر جھکا دے، جنیوا میں چار مہینے قیام کر کے وہ پیرس واپس آیا اور چونکہ وہ بعض اسباب کی بنا پر فوراً پیرس کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، اس نے حسب معمول اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، اس وقت "عدم مساوات" پر اس کا مقالہ ہالینڈ میں چھپ رہا تھا اور وہ اس کے پروف پڑھنے میں منہمک تھا، اس مقالے کا انتساب اس نے جنیوا کی "ری پبلک" کے نام کیا تھا، اُسے اندیشہ تھا کہ وہاں کی کونسل اس انتساب سے اچھا اثر نہیں لے گی، اس لئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مستقل قیام کی غرض سے جنیوا جانے سے پہلے اس کا انتظار کرے کہ جنیوا کا ردعمل اس انتساب کے بارے میں کیا ہوتا ہے، روسو کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ والٹیر نے جنیوا کے قریب مکان بنا کر مستقل قیام کا انتظام کر لیا تھا اس نے جنیوا میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ بدل دیا۔

۱۷۵۶ء میں مادام دے پینے نے جو روسو کی بڑی معتقد تھیں پیرس سے کچھ فاصلے پر موں موں رانسی کے جنگل میں اس کے لئے ایک گوشۂ تنہائی کا انتظام کر دیا، مادام اس کی طبیعت سے بخوبی واقف تھیں اور چند روز پہلے جب وہ ان کے ساتھ پیرس سے باہر تفریح کے لئے گیا تھا، تو اس نے ایک مکان کو جسے "خانقاہ" (L'Ermitage) کہتے تھے، بہت پسند کیا تھا اور کہا تھا کہ "یہ مقام میرے لئے بہترین پناہ گاہ ہے" مادام نے ضروری انتظام کر کے یہ مکان اُسے ہدیۃً پیش کر دیا، اور وہ وہاں منتقل ہو گیا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد جب مادام سے اُس کے معاملات

بگڑ گئے تو اُس نے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا مکان کرایے پر لے لیا جہاں وہ تقریباً پانچ سال

[illegible] سون رانسی کے جنگل میں اُس نے جو مدت گذاری وہ تصنیفی و تخلیقی اعتبار سے بڑی اہم

[illegible] رہی، اس جنگل میں اُسے فطرت کا قرب، سکون اور بے فکری حاصل تھی، اسی زمانے میں اس

[illegible] مشہور کتابیں "اُمیل" (Emile)، "لانوول ایلوائیس" (La Novella Heloise)

[illegible] کنترات سوشیال" (Le Contrat Sociale) لکھیں، "امیل" میں اُس نے فطری

اصولوں کے مطابق تعلیم کے موضوع پر لکھا ہے، اس کتاب پر اس کی کوئی گرفت نہ ہوتی اگر اس میں

[illegible]، جیسا کہ وہ سمجھا تھا، فطری مذہب کے اصولوں پر خیال آرائی نہ کی ہوتی، معاہدۂ عمرانی (لے کنترات

سوشیال) اس سے زیادہ باغیانہ تھی کہ اس میں جمہوریت کی تبلیغ تھی اور بادشاہوں کے خدا داد حق فرمانروائی

سے انکار کیا گیا تھا۔ ان دونوں کتابوں سے اُسے اور شہرت ملی لیکن سیاست اور مذہب کے اجارہ دار

اور حکمراں طبقہ، سب نے روسو کے خلاف محاذ بنا لیا[1]، اور اسے فرانس کی سرزمین چھوڑنی پڑی، جینیوا

[illegible] نہیں جا سکتا تھا، برن نے پناہ دینے سے انکار کر دیا، آخرکار پروشیا کے بادشاہ فریڈرک اعظم

کو اس پر ترس آیا اور اُس نے اُسے جرمنی کے اُس علاقے میں آ جانے کی دعوت دی جو اُس کی قلمرو میں

شامل تھا، یہاں وہ موٹیرلس نامی گاؤں میں قیام پذیر ہو گیا، اس گاؤں میں وہ تقریباً تین سال رہا، لیکن

۱۷۶۵ء میں اُسے انگلینڈ بھاگنا پڑا، انگلینڈ میں شروع شروع میں معاملات ٹھیک رہے، اس کی قدر

کی گئی اور جارج سوم نے اس کی پنشن مقرر کر دی، برک سے وہ تقریباً روز ملتا لیکن جلد ہی دونوں میں

ناچاقی ہو گئی، ہیوم سے بھی اس کی دوستی تھی لیکن اب چونکہ روسو کو ہر طرف دشمن ہی نظر آتے تھے

اس لئے ہیوم پر بھی اسے شبہ ہونے لگا اور اس طرح دونوں کے اختلافات بڑھتے گئے، غرض کہ اس

۱۔ جینیوا کی کونسل نے فرمان صادر کیا کہ دونوں کتابیں جلادی جائیں اور اگر روسو جینیوا آئے تو فوراً گرفتار

کر لیا جائے۔ فرانس کی حکومت نے بھی اس کی گرفتاری کے احکامات صادر کئے۔ سوربان اور پیرس کی پارلیمنٹ

نے "امیل" پر پابندی لگادی۔

کی اپنی روشنی طبع اس کے لئے بلا بن گئی، اس کے انقلابی خیالات نے یورپ کے سارے اہل کلیسا اور اہل فکر کو اس کا مخالف بنا دیا تھا، اُسے کہیں چین نہ ملا، جہاں جاتا تھا وہیں مردود و مقہور ٹھہرتا تھا، آخر سات آٹھ سال کی جہاں گردی کے بعد وہ پھر پیرس واپس آگیا اور ایک بوسیدہ مکان میں ایک کمرہ کرایے پہ لے کر زندگی کے دن گذارنے لگا، آخر کے یہ چند سال اس پر بڑے سخت گذرے، ان دنوں میں اُس نے اپنی مشہور تصنیف "اعترافات" (Confessions) مرتب کی اور ایک رسالہ لکھا جس کا نام تھا "تنہا گھومنے والے کی اُدھیڑ بُن" (Reveries du Promeneur Solitaire) - یہ دونوں کتابیں اُس کے مرنے کے بعد شائع ہوئیں[1] - اس کی وفات مفلوک الحالی کی حالت میں ۱۷۷۸ء میں ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ حالات سے تنگ آکر اُس نے خودکشی کر لی تھی۔

(باقی)

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، فرانسیسی ادب ، انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۶۲ء ، صفحہ ۲۳۹

رَوش صدّیقی

مسندِ گل

غلغلۂ خیال کو ہوش میں کوئی لائے کیوں
شعلۂ طور ہی سہی ہم سے نظر ملائے کیوں

ہم سے کچھ اور ہی کہا، ان سے کچھ اور کہدیا
بادِ صبا یہ کیا کیا، تو نے یہ گل کھلائے کیوں

قیس کا حاصلِ جنوں، ناقہ و محمل و حجاب
لیلیٔ شہد آشنا، خلوتِ دل میں آئے کیوں

عقل حریصِ خار و خس صورتِ شعلۂ ہوس
دولتِ سوزِ جاوداں عقل کے ہاتھ آئے کیوں

گردشِ مہر و ماہ بھی گردشِ جام بن گئی
صبح نہ لڑکھڑائے کیوں، شام نہ جھوم جائے کیوں

طالبِ جلوۂ بہار دشت طلب ہے خارزار
وقت کسی کی راہ میں مسندِ گل بچھائے کیوں

حشر میں حسن سے رَوش شکوۂ روبرو غلط
روزِ ازل کی بات ہے آج ہی یاد آئے کیوں

طیب انصاری

تنقید پر ایک نظر

[illegible] کو میں اردو تنقید کا حرف آغاز تو نہیں لیکن اردو کے تنقیدی سرمایہ میں اس کی حیثیت نقش اولیں کی ضرور ہے۔ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں فن تنقید پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو آج سے ۴۲ سال قبل [illegible] قلمبند کی گئی تھی۔ اس لئے "روح تنقید" پر تنقید اس کو اپنے زمانہ میں رکھکر کیجئے تو اپنے وقت کا [illegible] ہے اور "ایک ادب آشنا دل کی صدائے احتجاج بھی جو اردو ادب کے اس فقدان کا نتیجہ ہے جو ہماری زبان کے فاضل انشا پردازوں اور بزرگوں کی توجہ کا بے حد منتظر رہا ہے"، لیکن اگر آپ اس کو موجودہ کسوٹی پر رکھکر جانچنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں "روح تنقید" میں مختلف خامیاں نظر آئیں گی۔

"روح تنقید" کے نقادوں کا رویہ دوسرے قسم کا رہا ہے اس وجہ سے بہت کم نقاد "روح تنقید" کے ساتھ انصاف کر پائے ہیں۔ "یوم زور" (۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء) کے اس موقع پر میرے لئے یہ بڑی الجھن ہے کہ میں "روح تنقید" پر نظر ڈالوں تو کس انداز سے ـــــ انداز نظر بانکا بھی ہوتا ہے اور ترچھا بھی۔ کلیم الدین احمد نے بھی اردو شاعری اور اردو تنقید پر نظر ڈالی ہے لیکن بیشتر ارباب ادب ان کی اس نظر کو ترچھی نظر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میرے خیال میں نقاد کو اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ کوئی اس سے خوش ہوتا ہے یا خفا وہی بات کہنا چاہئے جسے وہ اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہو۔ پچھلے برس میرے ایک دوست نے دوران لکچر اساتذہ صاحبان سے میری نوک جھونک کے بارے میں کہا تھا کہ "تم اساتذہ ہی پر تنقید کرنے کی کوشش کرتے ہو" میں یہ کیسے بتاؤں کہ میری یہ جرات رندانہ اساتذہ صاحبان ہی کی دین ہے۔ آپ کسی حق بات کو پا جائیں اور اس حق بات کو کہنے کی جرات سے محروم ہوں تو آپ کا یہ علم بے مصرف ہے اور استاد کی دی ہوئی تعلیم بھی بے معنی۔ اسی خیال کے پیش نظر میں ان نقادوں کو برا بھلا نہیں کہتا جو "روح تنقید"

مغربی تنقید سے متعارف ہوئے اور جب ان کا یہ تعارف گہرے ربط کی صورت اختیار کر گیا تب انھیں "روح تنقید" کم مایہ نظر آئی۔ استاد کو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے کہ اس کی عطا کردہ بصارت نے طالب علم میں بصیرت بھی پیدا کر دی ہے۔ افلاطون کو اس بات پر ناز تھا کہ اس کے شاگردوں میں ارسطو جیسا ذہین طالب علم بھی موجود ہے۔ لیکن افلاطون [illegible] رعونیت کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اس نے اپنی لکھی ہوئی کتابوں اور پیش کیئے گیئے نظریوں میں کوئی تبدیلی کی۔ یہی حال ڈاکٹر زور کا بھی ہے۔ زور مرحوم نے "روح تنقید" کے ذریعہ اردو تنقید کے طالب علموں کو فن تنقید سے متعارف کرایا۔ کل کے یہی طالب علم آج نقاد بن گئے اور انھیں روح تنقید میں بہت ساری کوتاہیاں نظر آئیں۔ زور ان تنقیدوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ تھے تو افلاطون مزاج کے آدمی ـــــ ان ساری تنقیدوں کو پی گئے۔ اور اپنی کتاب کو دوبارہ لکھنا گوارہ نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ اس کتاب کے بعد شائع ہونے والی متعدد بلند پایہ کتابوں کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ان میں سے بیشتر کتابوں میں غیر ضروری معلومات شرح و بسط سے درج ہیں جو روح تنقید میں پیش کیئے گئے ہیں .... یہی وجہ ہے کہ روح تنقید کی قدر و منزلت امتداد ایام کے باوجود اب تک قائم ہے۔"

ڈاکٹر زور عظیم نقاد تھے۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا کیونکہ ایسی باتیں صرف شاعری میں پنپ سکتی ہیں غالب کی محبوبہ ایک ڈومنی تھی لیکن غالب کی شاعری کا مطالعہ کیجئے، ایسا لگتا ہے غالب کی یہ ڈومنی جنت کی کوئی حور تھی۔ ! غالب کی شاعری میں ڈومنی ایک حسین تصور ہے لیکن وہ حقیقت کی دنیا میں بدصورت مشہور تھی۔ شاعری میں تو ایسا مبالغہ ممکن ہے لیکن سنجیدہ تحریروں میں اس کی گنجائش نہیں خصوصاً تنقید کا فن تو دودھ سے پانی کو جدا کرنے کا فن ہے۔ یہاں وہی سب کچھ ہوگا جو درحقیقت ہے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر زور کو عظیم نقاد کہنا اپنی آبرو کھونا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر زور نے کبھی بھی اپنے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اور اگر "تنقیدی مقالات" کے پیش نظر انھیں نقاد مان بھی لیا جائے تو یہ ایسی ہی بات ہو گی جیسے میر اپنی تذکرہ نگاری کی وجہ سے نقاد کہلاتے ہیں۔ میر نے نکات الشعراء میں قدیم و جدید شعراء

کا تذکرہ کیا تھا۔ ان کی شاعری پر تنقید کوئی مقصد نہیں تھا لیکن زور نے اردو میں تنقید اور مغربی تنقید کی طرف شعوری طور پر توجہ دی ہے [illegible] مغربی تنقید سے استفادہ کیا ہے لیکن حالی کے تعلق سے ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مغربی تنقید سے پوری طرح واقف تھے۔ زور نے پہلی مرتبہ مغربی تنقید کو پڑھا اور ان نظریات [illegible] میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ "روح تنقید" اردو ادب میں فن تنقید پر پہلی کتاب [illegible] پہلی کتاب ہوتی ہے ـــــ بولتا قاعدہ !! بولتا قاعدہ میں غالب کے اشعار اور اقبال کی فکر کی تلاش بے معنی ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہے۔ لیکن اس سے "بولتا قاعدہ" کی بنیادی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ غالب اور اقبال نے بھی کبھی بولتا قاعدہ پڑھا تھا اور آپ اور ہم بھی بولتا قاعدہ ہی کی مدد سے ادب کے [illegible] تک پہنچ پائے ہیں۔ "روح تنقید" کی تاریخ اردو تنقید میں وہی اہمیت ہے جو "بولتا قاعدہ" کی ہے ـــــ بنیادی اور اہم !!

زور کا تنقیدی سرمایہ دو کتابوں پر مشتمل ہے ایک تو یہی "روح تنقید" دوسری "تنقیدی مقالات"۔ "روح تنقید" کے پیش کردہ اصولوں کا اردو کی ادبی پیداوار پر انطباق کیا گیا ہے۔ گویا یہ حصہ نظری ہے اور وہ عملی ـــــ "روح تنقید" تو نظری حصہ ہے لیکن اس میں زور کہیں بھی نقاد نظر نہیں آتے۔ ان کا اپنا کوئی تنقیدی نظریہ اس وقت تک تھا بھی نہیں اور اگر یہ بھی کوئی نظریہ ہو سکتا کہ ادب کو فنون لطیفہ کی شاخ سمجھیں تو یقیناً زور اسی نظریہ کے حامی ہیں لیکن پچھلے چند سالوں کی بحثوں کے بعد ادب کو فنون لطیفہ سمجھنا اور اس دعوی کو پیش کرنا کسی لطیفہ گوئی کی محفل میں تو ممکن ہے لیکن ادبی محفلوں میں ایسی باتیں قابل اعتنا نہیں ہو سکتیں ـــــ "روح تنقید" بجائے خود کوئی تنقیدی نظریہ کی حامل تصنیف نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس [illegible] اصول و تاریخ تنقید کو پیش کیا ہے۔ اصل کتاب کے آغاز سے قبل ہی اردو میں تنقید نگاری کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ سر سید، حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خاں، عبد الماجد، بجنوری اور دیگر نقادوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور پھر کتاب کا حصۂ اول آپ کو تنقید اور ادب کی تعریف سے متعارف کراتا ہے۔ ادب کی پیدائش، ادب کی تقسیم، تنقید کا مقصد اور تنقید نگاری کے فرائض و اصول سے متعلق مختلف نقادوں کے خیالات کو اس حصہ میں پیش کیا گیا ہے۔ حصۂ دوم تنقید کے ارتقاء سے متعلق ہے۔ روم کے نقادوں کا ذکر

کیاگیا ہے۔ درمیانی زمانہ کے نقاد پٹر اکسلاور ٹائنٹے کے افکار کے علاوہ فرانسیسی ادب [illegible] کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈرائڈن، اڈیسن، پوپ، جانسن، کولرج، ورڈزورتھ اور میتھو آرنلڈ کے تنقیدی نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز سے لے کر خاتمہ تک کہیں بھی زور اپنے نظریے کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ شروع سے آخر تک یا تو مفسر ہیں یا مبصر۔ ایک ایسا مبصر جو کرکٹ [illegible] آواز کے ساتھ بلندی سے تعریف و تحسین کا اظہار تو کرتا ہے لیکن [illegible] بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دیتا۔

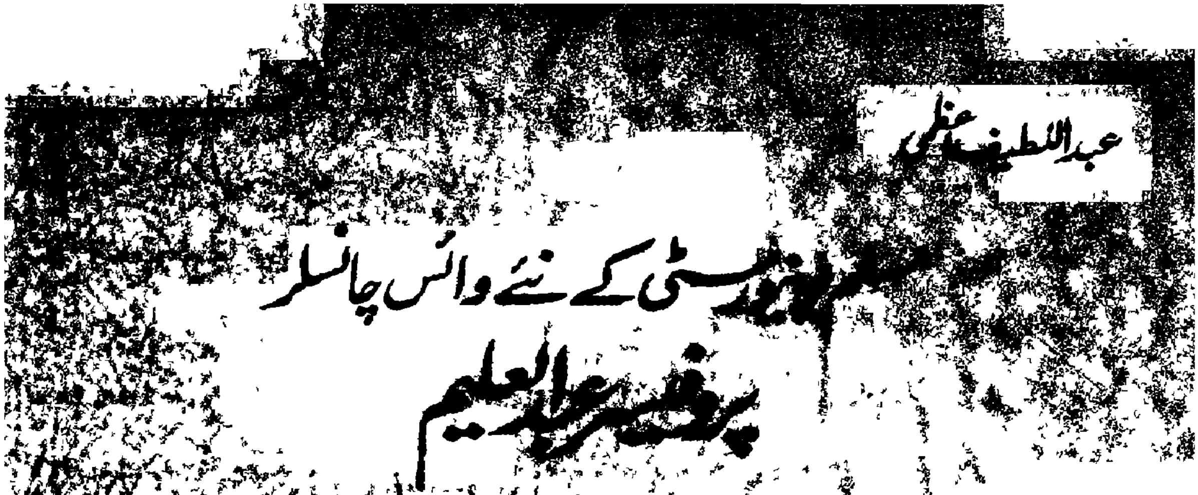
جدید اردو تنقید اتنی وقیع نہیں ہے جتنا کہ اس کو ۱۸۵۷ء کے بعد ہونا چاہئے تھا۔ مقدمہ میں حالی نے مغربی اثرات کو قبول کیا ہے اور حالی سے لے کر زور تک کے ادیبوں کے یہاں ان ہی رجحانات کے رد و قبول کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران بہت سے تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے۔ اثر، مہدی، نیاز، آجد، عبدالرحمٰن بجنوری اور مولوی عبدالحق کے یہاں تنقیدی شعور پختگی کے مراحل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان میں سے بعضوں نے مبسوط مقالے بھی فن تنقید سے متعلق لکھے ہیں لیکن کہیں بھی پیروئی مغربی مکمل طور پر موجود نہیں۔ مغربی افکار و خیالات بجنوری کے یہاں زیادہ ہیں لیکن روح تنقید ہماری تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں کہیں زیادہ تفصیل سے مغربی افکار کو پیش کیا گیا ہے۔ گو مختلف مغربی نقادوں کا انفرادی جائزہ بے حد مختصر معلوم ہوتا ہے لیکن مغربی ادب میں تنقید کی کہانی طویل ہے اور نقادوں کی تعداد بھی بے شمار۔ ظاہر ہے چھوٹی سی کتاب میں بہت کم نقادوں کو جگہ دی جا سکتی تھی۔ اور جن نقادوں کو روح تنقید میں جگہ ملی ہے وہ اپنی ذات میں ایک اسکول تھے۔ ہر زبان کے ادب کے طالب علموں کو ان سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر زور نے مختصر لیکن جامع انداز میں ان نقادوں کے خیالات کو پیش کیا ہے اس کی وجہ سے تنقید کے طالب علموں کو بغیر کسی درمیانی واسطہ کے راست ان نقادوں کے خیالات کو پیش کیا ہے اس کی وجہ سے تنقید کے طالب علموں کو بغیر کسی درمیانی واسطہ کے راست ان نقادوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے، جس وقت روح تنقید لکھی گئی اس وقت کا تقاضہ بھی یہی تھا مگر آج اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ زور کو روح تنقید لکھنے کے بجائے کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہئے تھا، عجیب سا لگتا ہے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد تو ہم مغربی

ادب سے کہیں زیادہ قریب ہو گئے لیکن روح تنقید کے بعد اردو تنقید کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر "روح تنقید" سے زیادہ قریب ہیں۔ عبادت بریلوی کی تصنیف "اردو تنقید کا ارتقاء" ہو یا کلیم الدین احمد کی "اردو تنقید پر ایک نظر" ــــ دونوں نقادوں نے مغربی افکار کی روشنی میں اردو تنقید کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلیم الدین نے روح تنقید کو "پیروی مغربی" کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور ان کے خیال میں پیروی مغربی کا نتیجہ قابل اطمینان نہیں۔ اب جبکہ "اردو تنقید پر ایک نظر" ہمارے پیش نظر ہے ہم اس کے مطالعہ کے بعد خود کلیم الدین کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ پیروی مغربی صرف قابل اطمینان ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک زہرناک بھی بن گئی۔ کلیم نے جس انداز کو اپنایا ہے وہ زہر کا حکم رکھتا ہے۔ اردو تنقید میں انہوں نے جس انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کو اردو کا کوئی بھی ادیب، شاعر یا نقاد معاف نہیں کر سکتا۔ انگریزی ادب کے نشہ میں چور وہ ساری باتیں کہہ گئے ہیں جن کے اظہار کے لئے کوئی بھی سنجیدہ ادیب یا شاعر تکلف محسوس کرے گا۔ بہتر تھا کہ کلیم بھی زور ہی کی طرح مغربی نقادوں کو اپنے طور پر پیش کر کے چپ ہو رہتے۔ اس کی وجہ سے کم از کم ان کا ہذیان ظاہر نہ ہونے پاتا۔ عبادت نے روح تنقید پر مناسب اعتراض کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روح تنقید میں پیش کئے ہوئے خیالات میں گہرائی، اپج اور غور و فکر کی کمی ہے۔ اردو تنقید کا ارتقا ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی۔ لیکن روح تنقید اور اردو تنقید کا ارتقاء، ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ عبادت نے روح تنقید سے حاصل شدہ معلومات میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا حالانکہ روح تنقید ایک طالب علم کی کوششوں کا حاصل تھی اور اردو تنقید کا ارتقا ایک ریسرچ اسکالر کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۴ء تک ہماری تنقید رینگتی رہی ہے۔ اور وہ اب بھی رینگ رہی ہے۔ اردو تنقید پر مکمل اور جامع تصنیف کی کمی کا احساس آج ہم سبھوں کو ہے۔ بہتر ہوتا کہ جدید نقاد اس جانب توجہ دیتے۔ بے حد افسوس کی بات ہے کہ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد سے آج تک کوئی ایسی تصنیف سامنے نہیں آئی ہے جسے ہم مقدمہ سے بہتر قرار دیتے۔

روح تنقید کے بیشتر نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اپنے کسی تنقیدی نظریہ کو

[illegible] ڈاکٹر زور بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو ادب کو فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ سمجھتے ہیں اس کے ساتھ اپنے نظریہ پر اصرار نہ کرنا ہی زور کی بزرگی کے بھرم کو قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ میں [illegible] کوئی نقاد ایسا بھی ہے جس نے اپنے طور پر کوئی نظریہ پیش کیا ہو۔ سبھی نقاد [illegible] نظریے اردو میں پیش کیے گئے ہیں وہ مغربی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے مشرقی فضا میں [illegible] ان کی آبیاری ممکن نہ ہوسکی۔ میں ادبی نظریہ یا ادبی عقیدہ کو مغرب و مشرق کے خانوں میں بانٹنے کا [illegible] ہوں، میرا ایقان تو انسانی وحدت پر ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی نظریہ چونکہ صرف مغربی ہے اس لئے وہ محدود ہے وہ انسانی زندگی پر کسی بھی طرح محیط نہیں ہوسکتا اس لئے وہ مشرق میں پنپ نہیں سکتا۔ یہی کچھ حال مشرقی افکار و اذکار کا ہے۔ دراصل ہمیں تنقید کے لئے ایک ایسے عقیدہ کو بنیاد بنانا ہوگا جو ہمہ گیر بھی ہو اور ابدی بھی۔ اور یہ نظریہ کسی عالمگیر نظریۂ حیات کا رہینِ منت ہوسکتا ہے۔ [illegible] حیات کو معراج کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ایک اعلیٰ و ارفع عقیدہ کو اختیار کرنے کے لئے ہمیں قصۂ جدید و قدیم میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ صداقتیں نئی بھی ہوسکتی ہیں اور ہزارہا سال پرانی بھی۔ سورج کی روشنی پر سال و ماہ نظر انداز نہیں ہوا کرتے۔ اس وجہ سے انسانیت کی ارتقاء کے لئے اس نظریہ کو اختیار کرلینا چاہئے جو انسانی وحدت اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور جس کی وجہ سے دنیا دارالامن بن جاتی ہے۔ میں تنقید کی نظریاتی بحث میں نہیں جاؤں گا۔ یہ بات کسی اور محفل میں بھی ہوسکتی ہے۔ دراصل یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر زور پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔ ہ واقعی ڈاکٹر زور کوئی نظریہ رکھتے بھی تھے یا نہیں، روحِ تنقید کے پیشِ نظر پھر میں وہی بات کہوں گا کہ یہاں وہ مفسر ہیں یا مبصر — نقاد نہیں ہیں۔ تاہم میں اپنی بات کو دہراؤں گا کہ ڈاکٹر زور ا [illegible] کو فنونِ لطیفہ کی شاخ سمجھتے ہیں یہی بات [illegible] نے بھی کہی ہے۔ لیکن انہوں نے اس نظریہ کا اظہار واضح طور پر نہیں کیا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ خود ان نقادوں کے یہاں تنقید کا کوئی اپنا نظریہ بھی ہے ؟ سوائے اس کے کہ ان لوگوں نے جگالی [illegible] ہے۔ مارکسی نظریہ کے علمبردار ہوں یا لسانی اصولوں کے حاملین، یا پھر وہ لوگ جو روحانیت میں اپنا ایقان رکھتے ہیں۔ ان سبھوں کی حیثیت ان بازاری چھوکروں کی [illegible] ایک جلوس کو جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے

پیچھے ہو لیتے ہیں اور جلوس والوں کے ساتھ ... لگ تے ... یہ بھی نہیں
جانتے کہ یہ جلوس کہاں سے نکلا ہے اور کہاں ... ہے ؟ ظاہر ہے زور اس جلوس میں شریک تو نہیں ہو سکتے
تھے البتہ بعد کو انھوں نے ... کے ذریعہ اردو ادب میں
محفوظ کر دیا۔ ... کسی تخلیقی تنقید کی تو نہیں ہے بلکہ اس ٹیپ ریکارڈ کی سی ہے جس میں منظر
... کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ویسے ... تنقید ڈاکٹر زور کی شہکار تصنیف
... کی عظمت میں فرق آجائے۔ لیکن یہ اپنے وقت اور موضوع کی وجہ سے آج
... ۔ دراصل "روح تنقید" ہے تو بڑھیا کے چراغ کی طرح ۔۔۔ کم مایہ اور کم بساط ...
جس کی ... کی سیاہی میں راہوں کو اجاگر کیا۔ ادب و تنقید کی پر پیچ راہوں میں جبکہ چاروں طرف
... "روح تنقید" کا چراغ جلایا۔ اور اس چراغ کی روشنی میں جانے کتنے مسافر
... بڑھیا تو اب اپنی جھونپڑی میں موجود نہیں لیکن چراغ آج بھی سر راہ روشن ہے
... ب بھی اندھیروں میں گم ہے اس وجہ سے اس چراغ کی اہمیت باقی ہے اور جب تک
... چراغ یوں ہی جلتا رہے گا۔



عبداللطیف اعظمی

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

پروفیسر عبدالعلیم

مسلم یونیورسٹی کے ایک سینیر پروفیسر جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے وائس چانسلر ہونے کا جب اعلان کیا گیا تو لوگوں کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ چار حضرات کا جو پینل حکومت ہند کو بھیجا گیا تھا اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا نام آخر میں تھا، اس کے علاوہ تینوں بزرگوں کے مقابلے میں کم عمر بھی ہیں اور زیادہ معروف بھی نہیں۔ دوسرے دلی یونیورسٹی کے علاوہ جہاں کچھ ہی عرصہ ہوا اس کے ایک سینیر پروفیسر ڈاکٹر گنگولی صاحب کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے، ورنہ عام طور پر ابھی یہ روایت قائم نہیں ہوئی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا سربراہ خود اس کے کسی استاد کو بنایا جائے۔ اس طرح کی تجاویز تعلیمی حلقوں میں ضرور ہیں کہ صرف انھیں لوگوں کو وائس چانسلر مقرر کیا جائے جو تعلیمی میدان میں معروف کار رہیں لیکن جو لوگ ایسی رائے رکھتے ہیں ان کا بھی خیال ہے کہ ایک یونیورسٹی کا پروفیسر دوسری یونیورسٹی میں مقرر کیا جائے تاکہ وہ مقامی اثرات سے آزاد ہو۔ دلی یونیورسٹی کی جس مثال کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی پوری طرح مسلم یونیورسٹی کے نئے انتخابات پر صادق نہیں آتی۔ ایک تو دلی یونیورسٹی میں اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے مسلم یونیورسٹی میں دوسرے ڈاکٹر گنگولی وہاں کے پرو وائس چانسلر تھے۔ ان حالات میں جب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے نام کا اعلان ہوا تو حیرت ہونی ہی چاہیئے تھی۔ خوشی اس لئے کہ ان کے نام پر ہر خیال کے لوگوں کو عام طور پر اتفاق ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خود یونیورسٹی کے لوگ اس تقرر پر خوش اور مطمئن ہیں۔ جب حکومت کے سامنے پینل زیر غور تھا اور آخر میں یہ مشہور تھا کہ ڈاکٹر علیم صاحب کے علاوہ کوئی امیدوار میدان [illegible] رہ گیا ہے تو اس [illegible] میں میں علی گڑھ گیا تھا اور مختلف حلقوں کی رائیں معلوم کرنے کا موقع ملا تھا۔ یونیورسٹی کے اندرونی حالات کے

پیش نظر، جن سے لوگ ناواقف نہیں ہیں، مجھے تعجب ہوا کہ یہیں جس سے بھی علاوہ ان کے نام پر مطمئن [illegible]
خوش تھا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں اور معارف کی نظر میں [illegible]
کمیونسٹ ہیں، مگر حیرت تھی کہ وہ لوگ بھی [illegible] اہم خیال سمجھا جاتا ہے، اس تقرر سے متفق
تھے۔ بات یہ ہے کہ شعبۂ عربی کے صدر، ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر اور مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ کے رکن کی
[illegible] داری اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس کی وجہ سے وہ [illegible]
مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کم گو ہیں، مختلف فیہ مسائل میں، چاہے وہ مذہبی
[illegible] سیاسی ہوں، خواہ دخل نہیں دیتے، مزاج میں شگفتگی اور گفتگو میں نرمی ہے، مسائل کے تصفیہ میں [illegible]
سے زیادہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں اور علمی مسائل میں معروضی انداز ان کی خصوصیات میں داخل ہے
وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے، جہاں تک میرا خیال ہے، ان کا تقرر عمل میں آیا ہے اور ان کی ان ہی خصوصیات
کی وجہ سے ان کے اس تقرر کا ہر حلقہ میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔

[illegible] ہندوستان کا پہلا ایسا ادارہ ہے، جس میں شروع سے شیخ الجامعہ اساتذہ ہی میں سے مقرر کئے
جاتے ہیں، اس کی وجہ سے جامعہ ان مسائل سے اب تک محفوظ رہی ہے، جن سے دوسری یونیورسٹیاں دوچار ہیں۔
[illegible] باوجود جامعہ کی اہم روایات اور قدیم خصوصیات بڑی حد تک باقی ہیں تو اس کا اہم سبب
یہ ہے کہ یہاں ایسے لوگ وائس چانسلر مقرر نہیں کئے گئے جو باہر کے ہوں یا تعلیم سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو۔ اب
مسلم یونیورسٹی میں بھی ایک ایسا شخص وائس چانسلر مقرر ہوا ہے، جس کی عمر تعلیم کی خدمت میں بسر ہوئی ہے اور
جو ایک طویل عرصے سے یونیورسٹی کی خدمت میں مشغول ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ
[illegible] قدیم طالب علم ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے، جس میں اسلامی تہذیب
[illegible] میں تضاد نہیں سمجھا جاتا، جہاں طالب علم کو چاہے وہ کسی مذہب اور علاقے سے تعلق
[illegible]، ایک اکائی سمجھا جاتا ہے اور جہاں چھوٹی وفاداریوں پر بڑی وفاداریوں کو قربان نہیں کیا جاتا۔
اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے چند برسوں سے مسلم یونیورسٹی بڑے نازک دور سے گذر رہی ہے۔ اس سے
قبل ایک ایسے ہی نازک دور میں جامعہ کے وائس چانسلر اور مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین

[illegible] جس ... چانسلر مقرر ہوئے تھے [illegible] رہا تھی۔ انھوں

نے صرف یہ کہ مسلم یونیورسٹی کو تباہ ہونے سے بچا لیا بلکہ اس کو ترقی دے کر ہندوستان کی ممتاز یونیورسٹیوں کی

[illegible] ڈاکٹر علیم صاحب جن حالات میں اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں، اس [illegible]

نہیں کہ ان حالات سے بڑی حد تک مختلف ہیں، مگر نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے قریب قریب ویسے ہی ہیں

جیسے ذاکر صاحب کے تقرر کے وقت تھے، فرق اس قدر ہے کہ اس وقت اتر پردیش کی حکومت کو کچھ شبہات تھے

[illegible] یونیورسٹی کو خطرہ ریاستی حکومت سے تھا۔ اس وقت شبہات مسلمانوں کو ہیں اور خطرہ ان کی بے اعتمادی

اور غلط فہمیوں سے ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کے بارے میں

جو خدشات اور غلط فہمیاں ہیں وہ صحیح ہیں، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا

اور ان کا اعتماد حاصل کرنا بہت ضروری اور مقدم ترین کام ہے۔ یہ کام یقیناً بہت مشکل ہے، ایک طرف

مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنا، دوسری طرف ان میں بدلے ہوئے حالات کا احساس پیدا کرنا اور نئے

ماحول میں انھیں نئے انداز سے سوچنے کی دعوت دینا ایک دوسرے کی ضد ہیں، مگر ان ہی متضاد فضا اور ماحول

میں مطابقت پیدا کرنے پر کامیابی کا انحصار ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ موجودہ حالات کا تقاضا ہے، ورنہ اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ

مسلم یونیورسٹی میں صحیح تعلیمی فضا پیدا کی جائے، اس کے طالب علموں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ انھیں

دوسری یونیورسٹیوں کی طرف دیکھنے اور ان کی غلط مثالوں کو دلیل راہ بنانے کے بجائے، ہندوستانی مسلمانوں

کی عزت اور وقار کی خاطر نظم و ضبط کا بہترین ثبوت دینا ہے اور اپنی خاطر اور اپنے مستقبل کی خاطر تعلیمی معیار

کو بلند سے بلند تر کرنا ہے۔ ملک کی ایک اقلیت کی حیثیت سے وہ اقلیت کے خدشات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے

ہیں، اس لیے مسلم یونیورسٹی کی اقلیت کے ساتھ ان کا سلوک اور رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ مثال کے طور پر

بیان کیا جاسکے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب جس ادارے کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں، وہ سر سید کی یادگار ہے۔

سر سید نے نہایت مشکل دور میں تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ شروع شروع میں ان کی قوم نے

ان کی باتوں کو سننے سے انکار کر دیا اور ان کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس وقت بھی وائس چانسلر کی راہ خطرات سے پر ہے، لیکن سرسید کی میراث کو اگر تباہی سے بچانا ہے اور بدلے ہوئے حالات میں ملک کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مفید بنانا ہے تو حکومت اور اکثریت کے شبہات کو بھی دور کرنا ہوگا اور قوم کی مخالفت کو بھی جھیلنا ہوگا اور ان دونوں مشکلات کے باوجود صحیح راہ پر قائم رہنا اصلی اور حقیقی کامیابی ہے۔ ہم [illegible] یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ان دونوں مشکل راہوں سے کامیابی کے ساتھ گذر جائیں گے اور مسلم یونیورسٹی میں ایسی صالح روایت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوں گے جو یونیورسٹی کے نام کو روشن کرنے کا باعث ہوگی اور وہاں سے جو طالب علم نکلیں گے وہ سچے مسلمان اور سچے ہندو اور سکھ ہوتے ہوئے سچے ہندوستانی ثابت ہوں گے۔

صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اس وقت صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد جب علی گڑھ تشریف لائے تھے تو فرمایا تھا:

"ہندوستانی تدبر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست اور قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا اہم ہے اور کیسا دلکش کام، یہ مختلف تمدنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام، جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کا نمونہ ہو۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی مشترک میراث بنا دینا کہ سب ہمارے ہی گم شدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کر کے سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صالح و رنگین بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور نادر موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟"

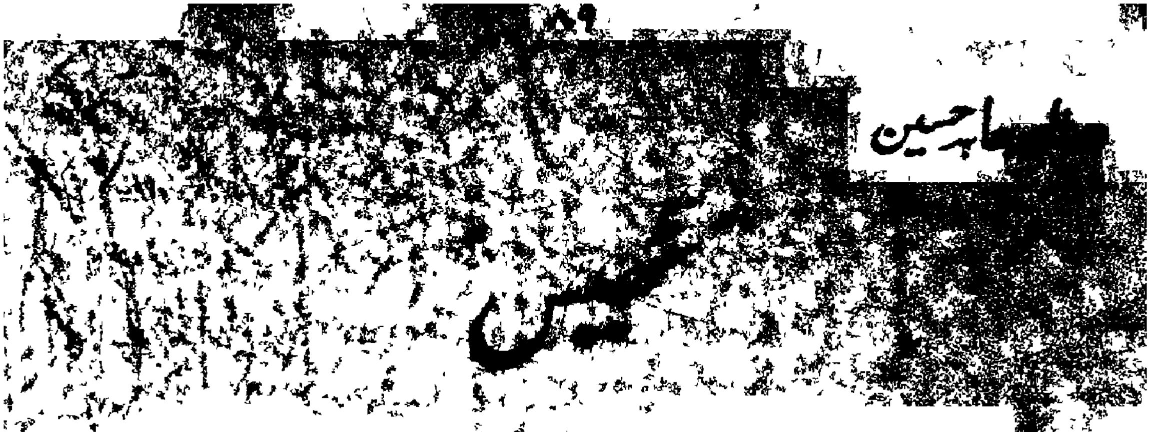
ذاکر صاحب نے مزید فرمایا تھا :

"جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ ... سوچے گا، علی گڑھ ہندوستانی زندگی کے مختلف ... کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں ... کا مقام اور ہندوستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر، ہاں اس پر، بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ علی گڑھ قومی زندگی کو مالا مال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے گا اور مجھے بھروسہ ہے کہ ہماری قوم بھی اس کے کام کی قدر کرنے میں بخل نہ کرے گی۔"

(تعلیمی خطبات صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۷)

ڈاکٹر سید عبدالعلیم صاحب کے پیش رو وائس چانسلر اور ہم سب کے مخدوم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے علی گڑھ سے جن توقعات کا اظہار کیا تھا، امید ہے کہ یونیورسٹی کے اس نئے دور میں، اگر وہ سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر، پوری ہوں گی، کم از کم نئے دور اور نئے رجحان کی گہری اور مضبوط بنیاد تو ضرور ہی پڑ جائے گی۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں علی گڑھ کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور ان حالات میں ان کا رویہ اور رجحان کیا ہو؟، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی گڑھ والوں کو، جن میں ارباب حل و عقد، اساتذہ اور طلبہ سبھی شامل ہیں، شاید اس کا صحیح احساس نہیں ہے۔ اگر راہ اور سمت مقرر ہو جائے اور لوگ اس پر ایک مرتبہ چل پڑیں تو پھر کوئی پریشانی نہ ہوگی، نہ تو ذہنی اور نہ ظاہری۔ رہیں قوم کی علی گڑھ کے بارے میں پریشانیاں اور اس کے خدشات تو قوم کو علی گڑھ کی رہنمائی نہیں کرنی ہے۔ علی گڑھ کو قوم کی رہنمائی کرنی ہے، سرسید کی طرح جم کر، پورے عزم و استقلال کے ساتھ تمام مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود، دشواریوں کا ہی نام زندگی ہے، کشاکش حیات اگر نہ ہو تو زندگی بے مزہ اور سونی سونی محسوس ہوگی

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے



میں اسے بچپن سے جانتا تھا جب وہ چھوٹی سی الھڑ لڑکی تھی جو بال بکھرائے، اقبال کے شعر گنگناتی، [illegible] دوڑتی بھاگتی پھرتی تھی، تب بھی میری اس کی دوستی تھی اور آج جب وہ بہت بڑی فن کار بن [illegible] وں میں ویسی ہی بے تکلفی تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی جس میں علم و مذہب [illegible] مدت سے چلی آتی تھی اور بزرگوں سے یہی ورثہ اس نے بھی پایا تھا۔ [illegible] اسے بے حد شوق تھا۔ بے سمجھے بھی اقبال، غالب، حالی، نذیر احمد اور پریم چند [illegible] مذاق اڑاتے تو آنکھوں میں بھرے آنسو پی کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اقبال کا یہ شعر وہ اپنی چھوٹی سی سریلی آواز میں لہک لہک کر گایا کرتی تھی ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میں ہنس کر اس سے اس شعر کا مطلب پوچھتا اور اس کی اماں بھرائی آواز میں کہتیں "میری بچی — تو ابھی کیا جانے کہ یہ خودی کیا چیز ہے —" تو وہ حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگتی اور میں سر جھکا لیتا کہ جانتا تھا کہ صبر و قناعت، خودداری و عالی ظرفی کی اس دیوی نے شوہر کی وفات کے بعد کیسی کیسی کٹھنائیاں جھیلیں [illegible] بچوں کی پرورش اور تعلیم میں کسی قریبی سے قریبی عزیز کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ انھیں [illegible] وقار اور عزتِ نفس کا بڑا پاس تھا۔ بیٹی کو اپنے مرحوم باپ سے بڑی عقیدت تھی، وہ انھیں فرشتوں سے افضل اور عام انسانوں سے بلند کوئی ہستی سمجھتی جنھیں اس نے دیکھا تو نہ تھا مگر ان کے علم و ادب کے خزانے کو پڑھا تھا اور بہت کچھ سنا تھا۔ بھائی بڑے تھے اور تعلیم کی خاطر ماں سے دور رہتے تھے۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ماں کی دوست اور مشیر بھی

بن گئی تھی۔ آج اس دیوی کی وفات کے برسوں بعد بھی جب ان کا ذکر آتا اس کے چہرے پر عقیدت کا وہ [illegible] رنگ اور آنکھوں میں محبت کے آنسوؤں کی دمک پیدا ہو جاتی۔ آج بھی ماں اس کے خیالوں اور [illegible] تھی۔۔۔۔ خودداری وقناعت کچھ اسے ماں کی تربیت، کچھ باپ سے ورثے میں ملی تھی اور [illegible] کی صحبت سے حاصل کی تھی۔۔۔۔ اور ان سب کا ملا جلا اثر یہ تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور خوددار تھی جس کا لازمی نتیجہ نازک مزاجی تھی۔ قناعت اور جفاکشی اس کی سیرت کے جوہر تھے۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور کٹھنائی میں بھی اس کی آنکھوں میں چاہے آنسو ہوں مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی آپ دیکھ سکتے تھے۔

میری اور اس کی عمر میں بارہ پندرہ برس کا فرق ہوتے ہوئے بھی بہت دوستی تھی۔ جب اس چھوٹی سی لڑکی کی کہانیوں اور شعروں کا لوگ مذاق اڑاتے تب بھی میں بڑی سنجیدگی سے ان پر بحث مباحثہ کرتا [illegible] دیتا اور کبھی کبھار اصلاح بھی۔ وہیں سے ہماری دوستی شروع ہوئی۔ آج وہ بہت سی کتابوں کی مصنف اور ملک کی مانی ہوئی ادیب تھی مگر جب ہم دونوں ملتے تو اسی طرح میں اس کی چیزوں کا مذاق اڑاتا، وہ مجھ سے جھگڑتی، میرا مذاق اڑاتی، میں اس کو چھیڑتا اور پھر ہم دونوں خود اپنے پر اور ایک دوسرے پر فقرے کس کر ہنستے۔۔۔۔ ملاقات بہت کم ہوتی مگر جب ہوتی تو اسی فضا میں۔

بہت دن بعد میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنے چھوٹے سے گھر کے سامنے رنگ برنگے پھولوں اور پتوں کے درمیان بید کی کرسی پر نیم دراز تھی اور گود میں کھلی ہوئی کتاب پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور پپوٹوں کی سرخی چغلی کھا رہی تھی کہ وہ روتی رہی ہے اور چہرہ بھرا بھرا اور [illegible] ہوئے تھے۔۔۔۔ الہٰی۔۔۔۔ آج وہ کس سے لڑی ہے؟

میں نے پاس بیٹھ کر چائے کی فرمائش کی۔ وہ اٹھی۔ چائے بنا کر لائی اور ہم دونوں چائے [illegible]۔ آسمان پر بادل گھر آئے تھے، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، دلّی کی سڑی گرمی نے اس [illegible] بڑے خوشگوار موسم کا روپ دھار لیا تھا۔ دور سے کوئل کی شیریں آواز کانوں میں جیسے رس گھول

...ے بہت موزوں"

...آئیڈیل"

...ٹنگ پر سوئی ہو ۔۔۔ یا کسی سے لڑی ہو ۔۔۔ آج کل تو وہ بھی موجود نہیں
جن سے ...تم اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہو۔"
...کے لئے یہ چہلیں اس وقت رہنے دیجئے" اس نے بیزاری سے کہا

...؟"

"اُف ۔۔۔ یہ دنیا والے کتنے بے درد ہوتے ہیں"

"تعریف کا شکریہ" میں نے جھکتے ہوئے کہا "ورنہ ہم کس قابل ہیں۔"

"آپ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ایک فنکار کا دل کتنا حساس ہوتا ہے ...."

"...بیچارے دنیا والوں کو گالیاں دی جا رہی ہیں" میں نے آج کل کے لوگوں کی زبان میں "ملامت" کو "گالی" جان کر کہا کہ وہ نیچے ٹوکے اور بگڑے مگر وہاں تو حال ہی اور تھا....

"یہ میری ... میرے بزرگوں اور میرے ساتھی کی ہتک ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"...، ان کی ہتک کرنے کی کس کی مجال ہے ۔۔۔ ساری دنیا اُن کی عزت کرتی ہے"

"...ری دنیا !! دنیا نے تو ہمیشہ فن کاروں کو رلایا، غریبوں کو ستایا ہے ۔۔۔ وہ جن میں اقبال کے مرد فقیر کا جلوہ نظر آتا ہے، جو خودی، خودداری، جفاکشی، خدمت اور محبت کی تفسیر ...خدمت ...کا لیا ہے ۔۔۔ وہ ہر ایک کی ہتک کر سکتے ہیں۔" وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ میں جانتا

تھا ان دونوں میں گہری دوستی، رفاقت اور قربت ہے ـــــ ایک جان دو قالب میاں بیوی شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان دونوں کو میں اسی زمرے میں شمار کرتا تھا ـــــ سوچا کسی نے شاید ان کی تحقیر کی ہے جس سے وہ اتنی برہم ہے مگر وہ بات مکمل کر نہیں بتا رہی تھی۔

"دولت کی یہ ہمت کہ وہ فن کی تحقیر کرے ـــــ" اس کی آواز میں جلال تھا۔ اس کی نازک مزاجی اور حساس طبیعت کو میں جانتا تھا۔ چھوٹی سی کوئی بات اس کی راتوں کی نیند اڑانے کو کافی ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا یہ اثر مذاق کی باتوں میں دل سے دور کر دوں۔ ہنس کر میں نے کہا "دولت نے ہمیشہ علم اور فن کی سرپرستی کی ہے۔"

"فن کا ہمیشہ دولت سے بلند مقام رہا ہے ـــــ اور علم کا مقام تو ان دونوں سے بلند تر ہے میری نگاہ میں ـــــ دولت ان کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کر سکتی ہے مگر خرید نہیں سکتی ـــــ سرپرستی ـــــ اُنھ ـــــ"

میں نے پھر چھیڑا ـــــ اس چھیڑنے میں میرے خیالات کا عکس بھی تھا تھوڑا سا ـــــ "مگر ہم نے تو بڑے بڑے فن کاروں، بڑے بڑے صاحبانِ علم کو دولت کے سامنے جھکتے دیکھا ہے۔"

"بس بس بس ـــــ اگر ایسا ہوا ہے۔ ہوتا ہے ـــــ تو یہ بات شرم ناک ہے، روح فرسا ہے علم اور فن کی تحقیر ہے ـــــ اس سماج اور معاشرے کی ذلت ہے جہاں فن اور علم کو خریدا اور بیچا جائے میں تو جب ایسی کوئی بات سنتی یا پڑھتی ہوں تو لرز جاتی ہوں۔ کیا گزرتی ہوگی ان حساس، خوددار فن کاروں پر جنھیں مجبور ہو کر دولت کے سامنے جھکنا یا اس سے مانگنا پڑتا ہوگا" وہ سچ مچ کانپ رہی تھی۔

"تم غرور اور خود پرستی کو خودداری اور قناعت کہتی ہو، مگر ہر ایک ایسا نہیں سمجھتا۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ کیا واقعی میں اسے خود پرست اور انانیت پرست سمجھتا ہوں یا محض چھیڑ رہا ہوں۔ پھر وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔ ایک اداس دلکش مسکراہٹ جو اس کی شخصیت کا جزو تھی۔

"فن کار سبھی حساس، خوددار اور انانیت پرست ہوتے ہیں میرے دوست ـــــ مگر آپ

[illegible]ک یہ کیا جانیں ۔۔ اقبال کے وہ شعر تو آپ نے کاہے کو پڑھے ہوں گے

"[illegible] کون سے شعر؟"

"[illegible] انہوں نے ایک بڑی پیش کش کو ٹھکرا کر کہے تھے ۔ اس وقت جب ان کو روپے کی [illegible]

مجھے [illegible] لگا کہ اسے چھیڑنے میں اب لطف آ رہا تھا ۔۔ "میں نے تو نہیں پڑھے۔"

"تو اب سنئے۔" اور وہ آہستہ آہستہ اقبال کے یہ شعر پڑھنے لگی ۔۔ [illegible] کرنے کے لئے مجھے اس کی طرف اور زیادہ جھکنا پڑا۔

تھا یہ فرمان الہی کہ شکوہ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش — کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکاۃ

پھر وہ چپ ہو کر کسی سوچ میں کھو گئی۔ میں نے خاموشی کو توڑا۔

"آپ نے بھی کسی نہ کسی کا احسان اٹھایا ہی تھا۔"

وہ تڑپ اٹھی۔ "وہ مدد یا خیرات نہ تھی۔ دوستانہ پیش کش تھی۔ نذرانہ تھا۔ علم و فن کی بارگاہ میں ایک قدردان کا ۔ اور شاید یہ آپ بھول گئے کہ وہ بھی انہوں نے ایک بڑا کام انجام دینے کے معاوضے کے طور پر قبول کیا تھا۔"

"اور وہ تمہارے غالب صاحب جو ہر کسی سے مدد مانگا کرتے تھے۔"

ایسا لگا جیسے کسی نے دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔

"[illegible] آپ؟ یوں کیوں سوچتے ہیں۔؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی تھی کہ جس عظیم فنکار کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگائے جانے چاہئے تھے ۔۔ آج جسے ہم اپنی قوم کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں، وہ کتنا مجبور، بے بس اور پریشان حال تھا کہ اپنی گزر بسر کے لئے دیسی رئیسوں اور ریذیڈ

حاکموں سے بھیک مانگتا تھا۔ کیا کرب گذرتا ہو گا اس پر۔ اُف۔ مگر یہ دنیا تو مردہ پرست ہے۔ آج کس کو ... طالب ہے۔ اور تب ۔۔ !"

"... سمجھتی ہو کہ فن کار کو بھی دولت کی ضرورت ہے۔ آپ سے معاوضہ لے خاطر خواہ ... لینا تم بھی برا نہیں سمجھتیں مگر۔"

"مگر کیا؟"

"مگر خلوص سے کی گئی پیش کش کو تم یا تمہارے اقبال ہتک کیوں سمجھتے ہیں؟"

"یہ اپنا اپنا مزاج ہے دوست۔"

"تم مجھے ایک ہی آدمی کا نام بتا دو جس نے پاس آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیا ہو، شہرت اور حکومت ... سے منہ موڑا ہو...... یا ..."

"مجھے اس کے لئے بہت دور نہ جانا پڑے گا۔ ایسے آدمی کو دیکھنا ہو تو میرے ساتھی کو دیکھ لو۔ مگر نہیں تمھیں ان کی یہ صفات کہاں نظر آئیں گی ۔۔۔ تم انھیں کیا جانو۔"

"میں تم سے پہلے سے انھیں جانتا ہوں۔" میں نے کچھ ندامت سے کہا

"نہیں جانتے۔ اور جانتے ہو تو پہچانتے نہیں۔ ورنہ یہ نہ کہتے کہ ایسا ایک آدمی ہی دکھا دو۔ ایک کیا بہت سے ہوں گے۔ پر میں ایک ہی کو جانتی ہوں۔ جس نے جوانی میں دیس کی خدمت کا جو عہد کیا، علم و ادب کی دیوی سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا۔ آج تک وہ پوری وفاداری، دل کی آمادگی کے ساتھ اسے نباہ رہا ہے!۔ اور اس نے بھی ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ علم و ادب کے لئے زندگیاں نچھاور کی ہیں۔ مگر شاید ان کی طرح نہیں ۔۔ زندگی میں کیسے کیسے سخت وقت گزر گئے۔ کیسے کیسے مقام آئے جب ہر ایک کا پاؤں ڈگ سکتا تھا۔ مگر وہ کٹھنائیاں جھیلتے رہے، مگر جس راستے کو اپنایا تھا اس سے قدم نہ ہٹایا۔ مگر خاموش اور بے غرض خدمت کسے نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت میں وہ چکا چوند کرنے والی بجلیاں ... ہیں نا؟" اس کے لہجے میں درد تھا، شکایت تھی مگر ساتھ ہی ناز تھا۔ غرور تھا!

"میری عزیز۔ جب تم ان کی تعریف کرتی ہو تو لگتا ہے اپنے منہ میاں مٹھو بن رہی ہو۔ اپنی ہی تعریف کر رہی ہو۔"

میں۔ میں ان تک کہاں پہنچ سکتی ہوں ۔ میں ان کی زندگی میں آئی تو میں نے دیکھا میں ایک اونچے پہاڑ کے سامنے کھڑی ہوں جس کی چوٹی پر وہ اپنی ادیب ہیں ۔ لیکن دل کو ان تک کیسے پہنچوں گی۔ کیسے اس عزت اور محبت کی حقدار بنوں گی جو بے مانگے مجھے مل رہی ہے ۔ بڑی کڑی منزلیں تھیں، کٹھن مرحلے تھے ۔ جو میں نے طے کئے ہیں آن تک پہنچنے کے لئے

"اس میں کیا شک ہے ۔ اور لوگ نہ جانیں پر میں جانتا ہوں ۔"

"[illegible] نہیں جانتے ۔ دوسرے سمجھ بھی کہاں سکتے ہیں ان محرومیوں کو جو میرا دل محسوس کرتا تھا۔ دنیا کی آسائشیں، اپنی طرف کھینچتی تھیں اور آن کے آدرش اپنی اور۔ لیکن میں ہر سکھ اور عیش سے منہ موڑ کر [illegible] تک پہنچنے کی جدوجہد میں لگی رہی۔ ہاں ہاں تمناؤں کے کانٹے دل میں چبھتے رہے، آرزو [illegible] رہی، کٹھنائیوں کی خاردار جھاڑیاں دامن پکڑتی رہیں۔ آرام و آسائش کی زندگی دور سے جلوے دکھا کر للچاتی رہی۔ مگر سب سے دامن بچاتی، اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا، قدم سے قدم ملائے چلتی رہی، تلووں کے کانٹے چنتی، پھولوں سے دامن بھرتی ...۔" اب وہ مجھ سے نہیں خود اپنے سے مخاطب تھی۔

"میرا دوست مجھے سہارا دیتا رہا، جب لڑکھڑائی اس نے سنبھال لیا، جب دل برداشتہ ہوئی اس نے ہمت بڑھائی ۔ میں نے دولت سے حاصل شدہ عیش و مسرت کی جگہ فن سے ملنے والی راحت کو تلاش کیا ہے جس نے مجھے غریبی میں بھی خوش رہنا سکھا دیا۔ احساس کمتری اور نفسیاتی بیماریوں کے چنگل سے بچا لیا ۔ میرا جسم اکثر بیماریوں اور مصیبتوں سے ہار مان گیا۔ مگر میرا ارادہ، دماغ اور ذہن نہ جسمانی بیماریوں سے مغلوب ہوا نہ ذہنی امراض کا شکار بن سکا ۔ میں نہ دولت سے مرعوب ہوئی نہ حکومت و اقتدار سے مغلوب ۔ خود بینی اور حسد کی مہلک بیماریوں سے بہت دور ہیں اپنے مرد فقیر کی محبت اور دوستی پر [illegible] اپنے فن پر قانع اور مسرور ہوں ۔ میرے پاس تو وہ دولت ہے جس سے بڑے بڑے صاحبانِ دولت [illegible] صاحبانِ اقتدار محروم ہیں، دوست ۔ محنت میں جو راحت ملتی ہے، اپنے فن میں [illegible] مسرت اور اس کو کاغذ پر منتقل کر کے جو بے پناہ خوشی حاصل ہوتی ہے اسے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے ۔" اس کی آواز اب سرگوشی کی حد تک دھیمی ہو چکی تھی۔ میں دیر تک خاموش بیٹھا اس کے چہرے

...شاید بھول چکی تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں

"ایک بات پوچھوں برا نہ ماننا" آج تک میں نے کبھی اس کی پروا نہ کی تھی کہ وہ میری کسی بات کا برا مان سکتی ہے مگر آج واقعی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں وہ مجھ سے بھی خفا نہ ہو جائے۔ اُف یہ فن کار کتنے نازک مزاج ہوتے ہیں ـــــ یا بنتے ہیں۔ کون جانے۔

ــــــ آہستہ سے اس نے جواب دیا۔

"فن کی عظمت پیسہ کمانے سے کم نہیں ہو جاتی ـــــ یہ تم بھی مانتی ہو ـــ آخر تم لوگ بھی تو اپنے علم و فن کا معاوضہ لیتے ہو، تم لوگ بھی پیسے سے بے نیاز نہیں۔"

"پیسے سے بے نیاز کون ہو سکتا ہے؟ ہم بھی نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اس دنیا میں زندہ رہنا ہے، اپنی ضرورتیں پوری کرنی ہیں.... لیکن اصولوں کو قربان کر کے، آدرشوں کو چھوڑ کر پیسہ کی پوجا یا غلامی کو بےشک ہم نے برا جانا ہے۔ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے محنت سے جو پیسہ ملتا ہے وہ ہمارے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔ ہم اس سے صرف اپنی زندگی کی ضروریات ہی پوری نہیں کرتے بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں، وہ ننھی ننھی تمنائیں بھی پوری کی جاتی ہیں جن سے زندگی میں رس اور نکھار پیدا ہوتا ہے، حسن اور دلکشی ابھرتی ہے ـــ ہم پیسہ کماتے ہیں کہ کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے، ہم اپنے فرائض ادا کر سکیں، دوسروں کی مدد کر سکیں کہ اس سے ہمیں سکون ملتا ہے لیکن ضرورت سے زیادہ پیسہ اگر کبھی ہو ـــ تو شاید میری روح کچل جائے ـــــ اس کا بار میں برداشت نہ کر سکوں، شاید تم اور تم جیسے لوگ اس پر یقین نہ کرو ـــــ پر مجھے زیادہ روپیہ کا تصور بھی دہلا دیتا ہے!"

میں جل گیا ـــ انسان کیسے کیسے دھوکے دیتا ہے اپنے آپ کو ـــ اس نے عمر بھر دکھ اٹھائے اور یہ سمجھتی رہی کہ بڑے سکھ سے ہے ـــ لوگ اُسے ہمیشہ اس کی حیثیت سے زیادہ پیسے والا سمجھتے رہے ـــــ دوسرے لوگ مہنگائی کا، پیسہ کی کمی کا، اخراجات کی زیادتی کا رونا روتے، عورتیں شکایتوں کے طومار باندھتیں اور وہ بیٹھی مسکرایا اور ان سے ہمدردی کیا کرتی! جیسے خود اسے کوئی اس قسم کی مشکل درپیش ہی نہیں ـــــ

"تم نے عمر بھر دھوکے کھائے میری دوست ـــــ اپنی محرومی اور مشکلوں کو قناعت، ایثار اور عالی ظرفی سمجھ کر دل ہی دل میں ناز کرتی رہیں ـــ اپنی غریبی کو سادگی اور استغنا کا نام دیتی ـــ اور غور کرنا بھول گئیں کہ تم نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں اور اشکار بھی ہوئے ـــ تمہارے اور دوست اور ساتھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر تم نے اپنے شوہر سے کبھی یہ نہ کہا کہ وہ ان بڑے بڑے عہدوں کو کیوں ٹھکراتا ہے۔ کیوں تمھیں غریبی اور کم مائگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آخر انھیں کیا حق تھا کہ ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی کو ان مشکلوں میں پھنسائے رکھیں عمر بھر ـــ" جو باتیں آج تک میں نے نہ کہی تھیں جانے کیسے آج میرے منہ سے نکل گئیں ـــ اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا جس میں حقارت تھی ملامت تھی شکایت تھی۔

"میں کم مایہ ہوں؟ مفلس ہوں؟ جس کی جھولی قدرت نے اپنی بے بہا نعمتوں سے بھر رکھی ہے، جسے فن کی دولت ملی ہے؟ جسے سچی محبت کا انمول موتی میسر ہے؟ جسے قناعت، خودداری اور ہر دل عزیزی کے جواہر نصیب ہیں وہ غریب ہے؟ نہیں ـــ تم سمجھ نہیں سکتے ـــ کوئی بھی کچھ نہیں سکتا ـــ میں سمجھانا چاہتی بھی نہیں ـــ مگر میرے احساسات پر تم تو ضرب نہ لگاؤ ـــ پہلی ہی چوٹ کی ٹیسیں ابھی تک اٹھ رہی ہیں ـ" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"عزیز دوست تم تو سچ مچ ناراض ہو گئیں۔ تم جانتی ہو، مذاق میں یا شاید تمہاری محبت میں یہ باتیں منہ سے نکل گئیں ـــ لیکن آخر بات کیا ہے؟ تم اتنی دل برداشتہ کیوں ہو؟ اگر مجبوراً کسی کا احسان لینا پڑا ہے تو کیا بات ہے ـــ تم بدلہ اتارنے میں بڑی تیز ہو ـــ اتار دینا بدلہ یا قرضہ ـــ" میری کچھ عقل کام نہیں کر رہی تھی ـــ یہی خیال آیا کہ کسی سے اس نے کچھ مانگا یا لیا ہے اور کوئی دل شکن بات قرض دینے والے نے کہہ دی ہے۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ جب میرے دوست کے ساتھی، عزیز اور دوست لمبی لمبی کاروں میں گھومتے ہیں اور وہ پیدل اور بسوں میں پھرتا ہے تو مجھے ذلت کا احساس ہوتا ہے؟ جب وہ دولت و حکومت و اقتدار کی گدیاں سنبھالے شہرت کی بلندیوں پر پہنچے ہوئے ہیں تو مجھے ان پر رشک آتا ہے اور اپنے شوہر سے دل ہی دل میں گلہ پیدا ہوتا ہے؟ ـــ نہیں میرے دوست نہیں ـــ وہ آج بڑے آدمی ہوتے، پیسہ والے، کہیں کے وزیر، سفیر، تو کیا میرے دل میں ان کی ایسی ہی عقیدت و محبت ہوتی ـــ؟ ان کو میں اپنے دل کے اس اونچے سنگھاسن پر بٹھا سکتی؟ اور میں کیا ـــ شاید اور لوگوں کے دل میں بھی ان کی وہ گہری

عزت اور قدر نہ ہوتی جو آ[illegible] آہ اسی مرد فقیر کی ساتھی کی تحقیر کیا جو وہ اس کی تحقیر نہیں ہے؟" اس احساس سے جیسے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں تو آج تک تم [illegible] تھیں۔ اپنے شوہر کی برائی کرنے اور شعر[illegible] کی تو تمہاری عادت تھی ہی نہیں۔ تم تو خود[illegible] بکتی ہو، تعریف سے گھبراتی [illegible] اٹھتی ہو ـــــ آج یہ کیسی الٹی گنگا بہہ رہی ہے ـــــ تم تو میرے ساتھ مل کر اپنا اور [illegible] مرد فقیر تک کا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتی تھیں ـــــ مگر آج ـــــ آج ـــــ"

[illegible] نے میری بات کاٹ دی۔

"آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے ـــــ آج پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سب دل بہلاوے ہیں ـــــ [illegible] کے دوچار لوگوں کو چھوڑ کر، لوگ نہ علم کی قدر و قیمت جانتے ہیں نہ فن کا احترام کرنا ـــــ آج میں نے پوری طرح سمجھا ہے کہ جن بیچارے فن کاروں کو دولت کے سامنے جھکنا پڑتا ہوگا ان پر کیا گزر جاتی ہوگی، آج مجھے پہلی بار اس دولت کا اندازہ ہوا جو قدرت نے ہمیں بخشی ہے۔ کتنی بڑی دولت جس نے ہمیں کم ظرفوں کے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کیا ـــــ شاید سچی عقیدت سے آج ہی میرا سر اپنے معبود کے سامنے جھکا ہے ـــــ"

"تو پھر اس قدر تلملائی ہوئی کیوں ہو؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم میری جگہ ہوتے تو اور زیادہ تلملاتے ـــــ ہاں ہاں میں معاوضہ لیتی ہوں کبھی کبھی اپنی کہانیوں اور مضمونوں کا ـــــ کتابوں کی رائلٹی بھی لیتی ہوں۔ مگر خیرات نہیں ـــــ میں نے فن کو کبھی فروخت نہیں کیا ـــــ دوستوں، عزیزوں، پڑوسیوں، مداحوں کی فرمائش اور اصرار پر کتنے جلسوں، محفلوں اور مجلسوں میں تقریریں کی ہیں، مضمون پڑھے ہیں، نظمیں سنائی ہیں، کہانیاں پڑھی ہیں...."

"جانتا ہوں بھئی جانتا ہوں کہ آج تم ہماری بہت بڑی، بہت مشہور، بہت محبوب فن کار ہو ـــــ"

"بہت بڑی، بہت مشہور تو نہیں ـــــ ہاں کسی حد تک محبوب ضرور ہوں ـــــ ہاں میرے دوست، مجھے اپنے فن کا بڑا انمول معاوضہ ملتا ہے ـــــ جو صرف ایک محبوب فن کار ہی کو مل سکتا ہے ـــــ قدر دانوں اور چاہنے والوں کی محبت اور عقیدت ـــــ معاوضہ کی صرف یہ دولت ہے جو میں نے سر جھکا کر قبول کی ہے مگر دل میں مسرت اور سر میں غرور کا جذبہ بھی ابھرا ہے ـــــ اس سے میری عزت نفس پر چوٹ نہیں پڑتی اس کو غذا ملتی ہے اور اور بہتر ـــــ اور بہتر لکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے ـــــ ان قدر دانوں اور چاہنے والوں کے لئے۔"

"تم آخر ہو آکیا؟"

"کچھ نہیں ــــ ایک عزیز کے اصرار پر ان کے ایک ... ہاں کی ایک محفل میں شرکت کی تھی۔"

"کون لوگ ہیں؟ کیا پڑھا تھا تم نے ... کیا کیا انھوں ...؟" میں نے بے چین ہو کر سوالوں کی بوچھار کر ڈالی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ــــ بہرحال میں وہاں گئی ــــ بہت بڑا مجمع تھا، سب نے میری ... ــــ بہت سے لوگ، جن میں سے اکثر کو میں جانتی پہچانتی بھی نہ تھی، میرے پاس آئے ... ــــ ... بہت خوش، بہت نازاں اپنے گھر واپس آ گئی۔ صاحب خانہ دونوں بہت مصروف تھے، وہ خود میرا شکریہ ادا نہ کر سکے مگر مجھے یہ پیام ملا کہ وہ دونوں کسی دن میرے گھر آکر شکریہ ادا کریں گے ــــ میں نے اس کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی ــــ دولت مندوں کے ... مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔ ... عزیز کی فرمائش پر وہاں گئی تھی۔ کچھ پاس دوستی کا تھا، کچھ عقیدے کی لگن تھی ــــ ورنہ تم جانتے ہو میں دولت مندوں سے گھبراتی ہوں...."

"پھر ــــ پھر لگار کمی ہے؟ کیا میں کہانی کہہ رہی ہوں" وہ بھڑک اٹھی۔ میں چپ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد پھر اس نے بات شروع کی مگر لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

"پھر فن کار کا شکریہ ادا کیا گیا ــــ ایک دوسری صورت میں جس کا وہ اس غریب کو مستحق سمجھتے تھے ــــ پھر ــــ دولت نے فن کی تحقیر کی ــــ روپیہ نے عقیدت کو خریدنا چاہا ــــ نمود و نمائش نے خلوص کا منہ چڑایا، پھر ــــ سیر قلندر کو شکوہ پرویز کی رشوت پیش کی گئی ــــ مگر ــــ میرے دوست ... کے اس اونچے مقام پر نہیں پہنچ سکی ــــ کبھی نہیں پہنچ سکتی جہاں ہر تلخ شیریں بن جاتا ... میرے لئے تلخ ہے اور رہے گی ــــ" میں چپ چاپ بیٹھا اس کی طرف دیکھ ...

"... کے نوٹوں کی شکل میں شکریہ اور تعریف نہ پہلے میں نے قبول کی تھی نہ اب کر سکتی ... میرے ... باتوں کو خود آنے کی فرصت نہ تھی ــــ اور روپیہ دے کر وہ میرے احسان کا بدلہ اتار رہے تھے ــــ پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی ــــ" اس کا چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں آنسوؤں نے غیر معمولی چمک پیدا کر دی تھی۔ میں نے مذاق میں کہا

"لے لیتیں ــــ ہم بھی آدھے کے حصہ دار بن جاتے ــــ خوب چیزیں خریدتے ــــ سیر ..."

"نہیں نہیں — یہ نہ کہو — میں مذاق میں بھی یہ نہیں سن سکتی ۔ دولت کبھی میری خودداری، میری نفس نہیں خرید سکتی — کبھی نہیں —"

"[illegible] اسے ذلت یا ہتک نہیں سمجھا جاتا — شاعر، واعظ، مقرر، اکثر معاوضہ لیتے ہیں، کیا اس سے ان کی ذلت ہوتی ہے ۔"

"نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں — مگر ان کی بات اور ہے — وہ ایک قاعدہ ہے —"

"ان لوگوں کا مقصد ہرگز تمہاری ہتک کرنا نہ ہوگا — وہ — وہ کسی طرح تمہاری مدد کرنا چاہتے ہوں گے — احسان اتارنا چاہتے ہوں گے —"

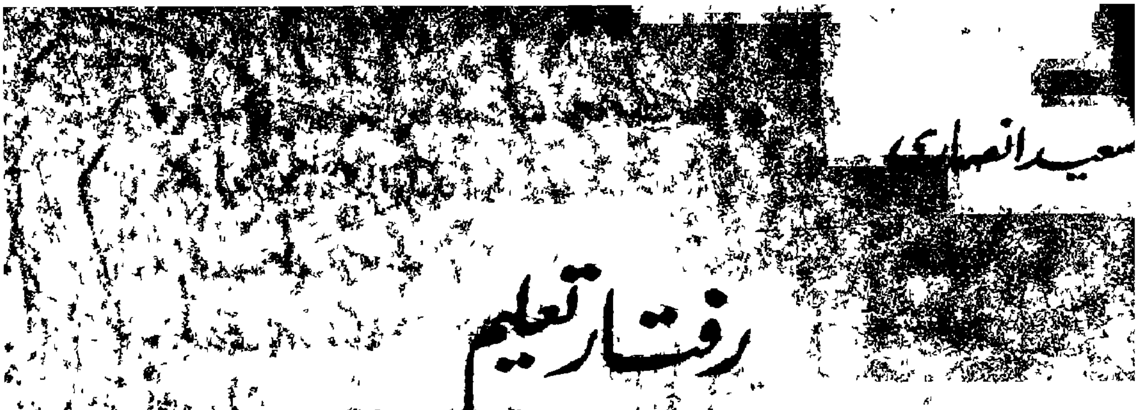
"مدد — احسان" اس نے طنز سے کہا "مدد تو میں صرف اپنی آپ کرتی ہوں — اور احسان صرف خدا کا اٹھاتی ہوں — ویسے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو — ان کا مقصد میری انسلٹ کرنا نہ تھا۔ مگر — اس کی جرأت انہیں اس لئے ہوئی نہ کہ وہ مجھے جانتے ہیں، نہ میرے خاندان کو، نہ میرے ساتھی کے رتبہ سے واقف ہیں وہ — سوچتی ہوں جب ان کو میرے انکار کی خبر ملی ہوگی تو — تو میرے "محسنوں" کو غصہ آیا ہوگا — حیرت ہوئی ہوگی — رحم بھی آیا ہو شاید ایسے مغرور فن کار پر ہنسی بھی آتی ہوگی ۔"

"ہاں بھئی، ہر کوئی اتنا حساس کہاں ہوتا ہے کہ دوسرے کے جذبات کو سمجھ سکے ۔"

"وہ بیچارے کیا جان سکتے ہیں خوددار انسان کے جذبات ؟ وہ غریب سمجھ ہی کہاں سکتے ہیں کہ کوئی کم حیثیت روپیہ کو ٹھکرا بھی سکتا ہے — روپیہ — جو ان دولت مندوں کا خدا ہے — اور فن کار کے پیروں کی خاک —" اس نے زور سے زمین پر ٹھوکر ماری ۔ دو تین کنکر اچٹ کر دور جا پڑے ۔

میں اپنے آنسو چھپانے کی کوشش بڑی دیر سے کر رہا تھا مگر اب ناکام ہو چکا تھا۔ آنسو جن میں عقیدت تھی، محبت تھی، مسرت تھی — میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلے اپنی بھیگی آنکھوں سے لگائے اور پھر ان کو چوم لیا ۔ آج وہ میری چھوٹی سی شاگرد مجھے اپنے سے بہت بڑی — بہت بڑی معلوم ہو رہی تھی ۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ساری تلخی، بیزاری اور غصہ جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ آنکھوں میں غرور و مسرت کی چمک اور ہونٹوں پر وہی اداس دلکش مسکراہٹ کھل اٹھی — بادل چھٹ گئے۔ آفتاب پھر نکل آیا ۔



سعید انصاری

رفتار تعلیم

طلبا کے مسائل اور ان کے اسباب:

شری بیر سنگھ، اسسٹنٹ پروفیسر پوسٹ گریجویٹ بیسک ٹریننگ کالج، گوالیار نے طلبا سے متعلق مسائل کی ایک تحقیقات [illegible] انھوں نے ۸۵ زیر تربیت استادوں سے اس عنوان پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا: [illegible] حل کرنے کی میں نے کوشش کی۔" یہ سب ایسے استاد تھے جو مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں [illegible] پڑھانے کا کام کر چکے تھے اور یہ سب کے سب مختلف درجہ کے اسکولوں سے متعلق تھے مثلاً ان میں [illegible] اسکول کے تھے، ۳۵ مڈل اسکولوں کے۔ ۲۲ ہائر سکینڈری اسکولوں کے اور ۵ انٹرمیڈیٹ [illegible] میں ہر منزل کے طلبا شامل تھے۔ مندرجہ بالا مقالوں میں ان کے جوابات حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیے گئے:

۱۔ طلبا کے مسائل کے اہم اسباب اور کتنے فیصد طلبا میں یہ اسباب پائے گئے۔؟

۲۔ [illegible] پیشہ کی بنیاد پر کتنے فیصد اسباب تھے؟

[illegible] اسباب کی بنیاد پر یہ مسائل پیدا ہوئے اور ان میں فیصد طلبا کی تعداد:

۱۔ باپ کا انتقال ہو گیا ہے:	۲۲ فیصد
[illegible] بچہ اپنے باپ ماں کا اکیلا بچہ ہے:	۲۲ فیصد
[illegible] ابھی اسکول یا جماعت میں نیا آیا ہے:	۲۰ فیصد
[illegible]۔ والدین بچہ کی دلچسپیوں اور ان کی مادی ضرورتوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے ہیں	۱۴ فیصد

[illegible]دین یا سرپرست بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں — ۱۲ فیصد

[illegible] پر والدین کی نگرانی کی کمی — ۱۲ فیصد

۔ خراب بچوں کی صحبت — ۱۲ فیصد

[illegible]لازمت یا کاروبار کی وجہ سے والدین کا کسی اور جگہ قیام — [illegible] فیصد

۔ بچہ کا شہری مدرسہ سے دیہی مدرسہ یا دیہی سے شہری مدرسہ میں تبادلہ — [illegible] فیصد

۔ والدین یا سرپرست کی ہمت افزائی — ۸ فیصد

۔ بچہ کی ماں کا انتقال — ۸ فیصد

[illegible]۔ بچہ کی امتحان میں دو سال کی مسلسل ناکامی — ۸ فیصد

اس تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ نکلا کہ

۱۔ کمسن بچے کے مسائل کے لئے کوئی ایک سبب نہیں بلکہ بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔

۲۔ ۸۰ فیصد سے زیادہ اسباب گھر کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ تقریباً ۴۵ فیصدی اسباب گھر سے باہر کی زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں، ۲۵ فیصدی مدرسہ کے حالات کی بنیاد پر اور ۸ فیصدی پڑھانے والے استادوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ ۸ فیصد اسباب بچہ کے گرد و پیش کے مجموعی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۵۔ تقریباً ۶۰ فیصدی بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے والدین یا تو تجارتی کاروبار یا کھیتی باڑی کے کاموں میں معروف ہوتے ہیں۔

ایک گاؤں کے مدرسہ کی رفتار تعلیم:

گلومب، مہاراشٹر کے ضلع ستارا میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۶۰ تھی۔ اس گاؤں کی آبادی میں دو بڑی جاتیاں رہتی ہیں: ایک مراٹھے جن کی تعداد کوئی ۸۰ فیصد ہے اور دوسرے مہار جو اچھوت جاتی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی آبادی ۱۰ فیصد ہے۔ بقیہ ۱۰ فیصد میں دوسری جاتیاں ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش کاشتکاری اور مزدوری ہے۔ آبادی کا

ایک حصہ بمبئی شہر میں جاکر کام کرتا ہے ۔

اس گاؤں میں تعلیم کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ لارڈ رپن کے زمانہ [illegible] ۱۸ تک ہندوستان کے گورنر جنرل تھے ۔ یہاں سب سے پہلے ضلع لوکل بورڈ اور میونسپلٹیاں قائم ہوئیں، جن میں ہندوستانیوں کو بشمول دوسرے اختیارات کے ابتدائی تعلیم بھی دی گئی ا[illegible] سلسلے میں غالباً سب سے پہلا پرائمری اسکول اس گاؤں میں ۱۸۸۶ء [illegible] سے پہلے بھی پرانے طرز کے ابتدائی مدرسے رہے ہوں، جس وقت یہ مدرسہ قائم ہوا، اس وقت پرائمری اسکول میں ۷ جماعتیں تھیں: ایک انفنٹ کلاس اور بقیہ ۱ سے ۶ تک ابتدائی جماعتیں [illegible] اضافہ ۱۹۰۱-۲ء میں ہوا اور اس طرح کل آٹھ جماعتوں کا یہ ایک ابتدائی مدرسہ بن گیا۔ مدرسہ کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں طلبا کی تعداد نہ تو کچھ بہت زیادہ تھی اور نہ تعلیم کی حالت بہت [illegible] بھی آس پاس کے ایسے دیہاتوں سے بچے آتے تھے جہاں کوئی مدرسہ [illegible]

[illegible] کے سالوں میں جب لوگوں کے اندر تعلیم کا احساس پیدا ہوا اور گوکھلے نے لازمی اور مفت تعلیم کا [illegible] اسمبلی میں پیش کرکے ایک ہلچل پیدا کردی، پھر بھی اس اسکول کی عددی اور تعلیمی حالت میں کوئی خاص [illegible] یہ کیفیت ۱۹۲۰ء تک جاری رہی بلکہ حالت اور بدتر ہوگئی ۔ ۱۹۲۱ء میں مونٹیگ چیمسفرڈ [illegible] اور ان کی رو سے تعلیم ایک صوبائی محکمہ بن گیا اور ۱۹۲۲ء میں ایک بڑا جامع پرائمری ایجوکیشن ایکٹ [illegible] پاس ہوا، جس سے سارا ضلع اور آس پاس کے علاقوں میں تعلیم کا پھیلاؤ تو ہوا، پھر بھی لازمی تعلیم کا نفاذ ستارا کے دیہاتی علاقوں میں اب بھی نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۷ء سے البتہ حکومت کی پالیسی میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ گلومب کے اس اسکول میں بھی ایک سے دو استاد ہو گئے اور بچوں کی تعداد [illegible] ہو گیا۔ خاص طور سے اچھوت جاتی بچے بھی کافی تعداد میں آنے لگے ۔ اچھوت بچوں کا داخلہ یوں تو ۱۸۹۲ء [illegible] شروع ہو گیا تھا، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور ۱۹۳۰ء تک وہ عام بچوں سے بالکل الگ تھلگ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ علیحدگی کم تو ہو گئی لیکن ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے سے پہلے بالکل ختم نہ

[illegible] اسکول کی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب انگیز سال معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس کے بعد سے کا دور [illegible]

والوں کی صحیح دلچسپی اسکول سے شروع ہوئی ہے جنھوں نے اسکول کے لئے ۵۶۵ ۱ مربع فٹ زمین کے صحن والے ۵ کروں کی ایک عمارت بنوائی اور ۱۰۲۸ مربع فیٹ زمین برآمدوں کے لئے چھوڑی۔ اس کے بعد سے استادوں، بچوں اور جماعتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ۱۹۳۴-۳۵ء میں گورنر بمبئی نے اس اسکول کا معائنہ کیا، جس کے لئے گاوں والوں نے کئی سڑکیں بنوائیں جس سے اس گاؤں کا دوسرے گاووں سے تعلق قائم ہوگیا۔ اور اب اس اسکول میں چھ جماعتیں ہوگئیں اور استادوں کی تعداد ۴ اور بچوں کی ۱۵۱ ہوگئی۔

۱۹۳۵ء کے بعد سے اسکول کی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں ساتویں جماعت کا اور اضافہ ہوا اور اس طرح یہ ایک مکمل پرائمری اسکول بن گیا۔ اب تک ساتویں جماعت کے ختم پر بچوں کو آخری امتحان کے لئے باہر جانا پڑتا تھا اب اسی اسکول میں اس کا انتظام ہو گیا۔ اسکول کے استادوں میں بھی یہ عجیب بات تھی کہ ایک برہمن تھا، دوسرا مراہٹہ، تیسرا مسلمان اور چوتھا عیسائی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو گلومب کا رہنے والا ہو۔ سب آس پاس کے علاقوں سے آتے تھے۔

یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی رفتار تعلیم پیش کی گئی ہے جس نے بہ حیثیت مجموعی یہاں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اسی مدرسہ کی بدولت نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے بھی پڑھے لکھے بن گئے، مردوں کے سوا عورتیں بھی خاص تعلیم یافتہ نظر آنے لگیں۔ بستی کے باہمی تعلقات پر بھی نہایت خوشگوار اثر پڑا ہے اور لوگوں کے عام طرز زندگی میں بھی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔

ماہنامہ جامعہ کی روانگی میں تاخیر

ماہنامہ جامعہ کی تجدید رجسٹری میں، بعض قانونی دشواریوں کی وجہ سے تاخیر ہوئی، جس کی وجہ سے اکتوبر سے جنوری تک کے شماروں کی روانگی میں باقاعدگی نہیں برتی جا سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تجدید ہوگئی ہے اور آئندہ سے حسب معمول، رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں خریداروں کو مل جایا کرے گا۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

ذاکر حسین

مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

ناشر: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۵، قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

عرصہ سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی علمی، تعلیمی، ادبی، ثقافتی اور انتظامی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہو اور ان کی ابتدائی زندگی کے نقوش بھی ابھارے گئے ہوں۔ جناب عبداللطیف اعظمی جو ذاکر صاحب کے نہایت مخلص ارادت مند ہیں اور پہلے بھی ان کے تعلیمی خطبات کو مرتب کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے تیار ہو گئے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت پر جو کچھ بھی لکھا گیا تھا وہ ان کی نظر میں تھا مگر دسترس میں نہیں۔ یہ تمام مضامین مختلف رسائل کے صفحات [illegible] تھے، انھیں تلاش کر کے یکجا کرنے کے بعد انتخاب کا کام محنت طلب ہونے کے علاوہ نظر طلب [illegible] فاصلہ کی وجہ سے کہیں کہیں مبہم تھے اور تشریح طلب۔ ان تمام فرائض سے کتاب کے مرتب کو عہدہ برا ہونا پڑا ہے۔ عبداللطیف صاحب کے حواشی بہت سارے مقامات پر انتہائی حقیقت کشا ہیں اور ذاکر صاحب کی شخصیت کے بہت سے گوشوں کو روشن کرتے ہیں۔ یہ کتاب مرتب کی محنت، توجہ [illegible] کی غماز ہے۔ مرتب نے ہر مضمون سے پہلے مضمون نگار کا ذاکر صاحب سے تعلق واضح کرنے کی خاطر تشریحی نوٹ لکھے ہیں جن سے ان مضامین کی افادیت پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کا انتساب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام کیا گیا ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں ذاکر صاحب نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے اور اسے اپنے دل کا

کو تپش اور شبوں کے گداز سے آشنا کیا ہے۔ یہ انتساب مرتب کے اس ادارے سے تعلق اور فیض یابی کا بھی اظہار ہے۔

[illegible] مرتب نے ہی ذاکر صاحب کے کچھ خاندانی حالات بھی لکھے ہیں جن سے اس تہذیبی ماحول کا احساس ہوتا ہے جس نے ان کی شخصیت کو ایک طرح کی شریف کج کلہی اور البیلے پن سے آشنا کیا ہے۔ اسلامیہ اسکول اٹاوہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیمی زندگی کے بہت سے معنی خیز نقوش پروفیسر حبیب الرحمن نے جو ذاکر صاحب کے ہم سبق تھے، بڑی ہی چابکدستی سے ابھارے ہیں اور ان کی زندگی کے تشکیلی مراحل کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنے مخصوص سنجیدہ، علمی اور تجزیاتی انداز میں تقریباً ان تمام عناصر کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ عابد صاحب نے ان آدرشوں اور قدروں کا بھی تجزیہ کیا ہے جن کی تخلیق خود ذاکر صاحب ہیں اور جن کی ترویج کے لئے وہ کوشاں بھی رہے ہیں۔ میری نظر میں یہ واحد مضمون ہے جس میں وہ خیرہ نگاہی نہیں جس کے بہت سے مضمون نگار شکار ہو گئے ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت انتہائی دلپیکر اور اثر انگیز ہے، ان کے سامنے عموماً لوگوں کو اپنی کوتاہیٔ قد کا احساس ہونے لگتا ہے اور اکثر لوگ یوں محسوس کرتے ہیں گویا وہ سطح زمین سے قطب مینار کو دیکھ رہے ہوں اور ان کا سر چکرا رہا ہو۔ ان کی شخصیت پر لکھنے والے اکثر مقالہ نگار اسی کیفیت کا شکار محسوس ہوتے ہیں۔ کسی کی بھی شخصیت پر 'پیر پرستی' اور 'مرید بندی' کے موڈ میں لکھنے والے موضوع کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ اس کام میں لکھنے والے کے اندر 'قرب آفریں معروضیت' ہونی چاہیے ورنہ حالی کی حیات جاوید جیسا کارنامہ جنم لے گا۔ عابد حسین صاحب کے مقالے میں ایک خاص معروضی انداز ہے جس کی وجہ سے ان کا مقالہ اس مجموعے کا بہترین مقالہ بن گیا ہے اور ذاکر صاحب کی شخصیت کی معتبر کلید۔ پروفیسر محمد مجیب نے ذاکر صاحب کا قلمی چہرہ انتہائی جاندار اور شگفتہ انداز میں لکھا ہے صرف چند رنگوں کی مدد سے انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کے خارجی اور باطنی خد و خال نمایاں کیے ہیں اور اس خوشگوار معمے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جس سے ان کی شخصیت عبارت ہے۔ موصوف نے کتنے پتے کی بات کہی ہے:

"میں ذاکر حسین صاحب کو ۲۳ء سے جانتا ہوں اور بائیس برس ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ ان

[illegible] ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں ان سے ملتا نہیں ہوں، مگر میں کیا کرتا، تصویر کو بہت قریب [illegible]
[illegible] کچھ پیچھے ہٹ کر اور اس طرح کہ روشنی تصویر پر پڑ [illegible]
شخصیت کو بھی کچھ ایسے ہی دور رہ کر، پیچھے ہٹ کر دیکھنا چاہئے۔ لیکن ہماری قومی عادت ہے کہ
[illegible] سے اتنا ہی زیادہ گھیرتے اور قریب سے دیکھتے ہیں۔"

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس سے ہر شخصیت نگار کو واقف ہونا چاہئے اگر وہ کامیابی کا خواہاں ہے۔ اس مجموعے میں [illegible] مقالہ نگاروں نے "قریب سے دیکھنے" کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں ایک طرح کی [illegible] ہے۔ جس نے جتنی بھی اور جس قدر بھی معروضیت پیدا کی ہے اتنا ہی کامیاب ہوا ہے [illegible] صدیقی صاحب کا مضمون اپنے تیکھے پن اور شاداب و شگفتہ انداز نگارش کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے [illegible] شکایت کروں وہ ذاکر صاحب پر، جو ایک زمانے سے ان کے مرشد ہیں، ایسے ہی لکھتے اور اسی [illegible] کے ساتھ۔ خواجہ غلام السیدین کا مقالہ تفصیلی اور بھرپور ہے مگر اس میں مجھے پرشکوہ اقبالیاتی [illegible] ارزانی کھٹکتی ہے۔ ہم لفظوں اور اصطلاحات کے اسراف سے گریز کرکے بھی کسی کی عظمت کی تصویر کشی [illegible]

[illegible] کتاب میں جہاں ایک طرف ایسے مقالے ہیں جن سے ذاکر صاحب کی تعلیمی اور قومی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے وہیں دوسری طرف کچھ ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں ان کی ادبی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کا اپنا ایک مخصوص انداز اور لب و لہجہ ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے، مگر عام طور پر بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے کہ ذاکر صاحب کے اندر [illegible] خصوصیت [illegible] سے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ان کی فعال اور پرسوز شخصیت کا اعجاز ہے یہ کہنا مبالغہ ہے کہ ان کے اسلوب کے کئی رنگ ہیں اور مختلف انداز۔ ان کا صرف ایک انداز ہے جس میں جملوں کی تیز رفتاری ہے، جذبہ اور ایک طرح کا خطیبانہ خروش۔ یہ انداز افلاطون کی ریاست کے ترجمے میں بھی ہے اور تعلیمی خطبات [illegible] انداز سے بولتے ہیں اسی انداز میں لکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کو بولتے سنا ہے انہیں [illegible] سیماب کس تیزی سے متحرک رہتا ہے۔ اس اضطراب کے پیچھے ان کی اپنی شخصیت

ہے جو تیز رفتار جملوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے خواہ وہ لکھ رہے ہوں یا بول رہے ہوں۔ ان کے تحریری لفظوں (WRITTEN WORDS) میں بھی تقریری لفظوں (SPOKEN WORDS) کا آہنگ ہوتا ہے۔ ان دونوں کی قربت ان کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مجھے ان کی تحریریں پڑھ کر اکثر یہ محسوس ہوا ہے گویا وہ لفظوں کو لکھنے کے ساتھ سنتے بھی ہیں یہ ایک ایسی خوبی یا خصوصیت ہے جو بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مجھے اکثر اقبال کی شاعری کا آہنگ ہے اس کی شوکت محسوس ہوئی ہے، بالخصوص ان کے خطبات میں۔ خطیبانہ انداز میں ایک خامی یہ ہوتی ہے کہ لکھنے والا مرتبہ انداز میں دوسروں کو مخاطب کرتا ہے۔ برتری کا یہ احساس بولنے یا لکھنے والے کے قدوقامت کو خواہ کتنا ہی بالا کیوں نہ بناتا ہو مگر نثر اس سے بری طرح متاثر ہوتی ہے اور مختلف حالات میں اثر انگیزی سے محروم۔ ذاکر صاحب کی تحریروں کی خطابت صرف اس وجہ سے خوشگوار ہے کہ ان میں نہ کہیں برتری کا احساس ہے اور نہ خشونت کا۔ وہ پوری شدت کے ساتھ سامع یا قاری کے احساس کو چھوتے یا اس سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کا احساس ان کے خیال کی طرح واضح اور شفاف ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں شوکت ہے مگر ابہام نہیں۔ مشہور انگریزی نقاد لوکس LUCAS نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ابہام شعر یا شعری نثر کو طوفان ابر ورعد یا ابر آلود قلۂ کوہ کی طرح ایک پراسرار وسعت بخش دے تو بخش دے، لیکن میرے خیال میں نثر تو اس وقت بہترین ہوتی ہے جب وہ موسم بہار کے دنوں کی فضا کی طرح شفاف ہو۔ یہ شفاف فضا ان کی اکثر نثری تحریروں میں موجود ہے اور متوجہ کرتی ہے۔

ذاکر صاحب کے اسلوب یا ادبی مرتبہ و مقام پر اس کتاب میں جو بھی مضامین شامل ہیں وہ غیر تشفی بخش ہیں ان میں نام اور کام کا تذکرہ ہے اور بس۔ ان کے اسلوب یا ان کی انفرادیت کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ آل احمد سرور صاحب سے اس کام کی امید تھی مگر انھوں نے بھی سرسری انداز میں بعض خصوصیات کی طرف صرف اشارے کئے ہیں۔ پروفیسر محمد سرور کا مقالہ بہت پہلے لکھا گیا تھا جب اچھی نثر یا نثری اسلوب کی ہمارے یہاں معیار بندی نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے آج یہ مضمون انتہائی تشنہ اور بے رنگ محسوس ہوتا ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری کا مضمون تعلیمی نقطۂ نظر سے ان کہانیوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی ایک اچھی اور کامیاب کوشش ہے جو ذاکر صاحب نے ایک زمانے میں بچوں کے لئے لکھی تھیں۔ ہمارے ادبی ناقدوں کو چاہئے کہ وہ ذاکر صاحب کے اسلوب

کا بھرپور اور تفصیلی تجزیہ کریں۔ اعظمی صاحب نے اس کتاب میں ذاکر صاحب کی نثر کے مختلف [illegible] ہیں جن سے [illegible] مزاج کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں ذاکر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر جو کچھ آج تک لکھا گیا ہے انتخاب کر کے پیش کر دیا گیا ہے ـــــ اور وہ بھی بڑے سلیقے سے۔ اس گراں بہا کام کے لئے جناب عبداللطیف اعظمی ہماری طرف سے خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے یہ کتاب خاصے اہتمام اور خوش [illegible] شائع کی ہے۔

گفت و شنید

مرتب: ظفر ادیب

[illegible]: قصر اردو، اردو بازار، دلی ۶ قیمت: چھ روپے

[illegible] اردو کے جانے پہچانے صحافی ہیں۔ "گفت و شنید" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ [illegible] مضامین کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جدید ادبی منظر [illegible] کے نقوش ابھار دے۔ اس جائزے میں تجریدی رنگ پیدا ہو جانے کے خطرے سے بچنے کی خاطر ظفر ادیب صاحب نے زبان و ادب کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے [illegible] ادیبوں کو منتخب کر لیا ہے اور پھر ان کی خدمات کے منہج یا سمت کی نشاندہی کی ہے اور یہ کام کچھ اس طرح انجام دیا ہے کہ اردو ادب کے تخلیقی سفر کی مختلف منزلوں یا مرحلوں کا قاری کو [illegible] ہے اور وہ اس رنگارنگی اور تنوع سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے جو آج کے اردو ادب کی [illegible] ہے۔ غالباً مصنف کی غایت بھی یہی ہے۔ ویسے اس طرح کے جائزوں میں کچھ خطرے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جن لوگوں کو مصنف نمائندگی کا درجہ دیتا ہے وہ بہت سے [illegible] نہ ہوں۔ میرے خیال میں اس طرح کا اختلاف اس جائزے میں بھی ممکن ہے۔ جائزے کے نظری ہونے کی صورت میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں [illegible] کے لئے ضروری ہے کہ خود جائزہ لینے والا ادبی اقدار کے کسی نہ کسی نظام

ماننے والا ہو اور وہ ادبی کارناموں کو انھیں معیاروں کی روشنی میں پرکھے۔ ظفر ادیب صاحب کی خوبی یا خامی یہی ہے کہ انھوں نے طے شدہ معیاروں یا مفروضوں کے بغیر یہ مضامین لکھے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین کا لہجہ کہیں بھی ازعانی نہیں ہے۔ وہ ادیبوں کو انھیں کے معیاروں پر پرکھتے ہیں اور اس طرح تضیۂ زمین بر سر زمین کا انداز ان کے تقریباً سبھی مضامین میں محسوس ہوتا ہے۔ ادبی معیاروں کے اخذ کرنے کا انھوں نے طریقہ یہ رکھا ہے کہ پہلے وہ ادیب کی مختلف تحریروں سے اس کے نقطۂ نظر کا تعین کرتے ہیں پھر اسی نقطۂ نظر کو بنیاد بنا کر اس اور کے جملہ ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تشریحی تنقید میں داخلی شہادت پر اسی طرح بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ میری نظر میں گفت و شنید تشریحی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ آج کی عالمی تنقید نگاری میں سب سے غالب رجحان یا رویہ یہی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ تشریحی تنقید اعلیٰ تنقید ہے یا اسفل۔ اس مجموعے میں ممتاز شیریں قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی پر اچھے مضامین شامل ہیں۔ غالباً ظفر ادیب صاحب کو شعری ادب سے زیادہ افسانوی ادب سے دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوی ادب سے متعلق ان کے مضامین شعری ادب سے متعلق مضامین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تشفی بخش ہیں اور یوں بھی احسان دانش اور ساحر لدھیانوی کو جدید شاعری کی نمائندگی کا اعزاز بخشنا کم از کم ۱۹۶۸ء میں اعلیٰ تربیت یافتہ ذوق کا ثبوت نہیں ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔

دکنی رباعیاں

مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

قیمت: چھ روپے ، ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ جعفر ہمارے ادبی اور تحقیقی حلقے میں خاصی معروف و ممتاز ہیں۔ ادبی تحقیق کے رمز شناس ان کے کارناموں کی داد دیتے رہے ہیں۔ جس رفتار سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی توجہ اور کتنی لگن سے علمی کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اب تک شائع

ہو چکی ہیں۔ ماسٹر رام چندر، فن جماد اور فن کی جانچ، ان کی وہ کتابیں ہیں جو ادبی اور علمی حلقوں سے لیا
اعتراف کرا چکی ہیں ... دکنی رباعیاں' لے کر سامنے آئی ہیں۔ دراصل یہ دکنی رباعیوں کا مجموعہ ہے
... دکنی شعراء کی تقریباً وہ تمام رباعیاں شامل ہیں جو انھیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان رباعیوں
... انھوں نے کتنی محنت کی ہے اس کا اندازہ ان سوانحی نوٹوں سے کیا جا سکتا ہے
... کتنے نسخے اور کتنی بیاضیں تھیں جو ان کی نظر سے گزریں، تب کہیں
جا کر ... ہے۔

... میں ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے رباعی کے فن اور اس کے ارتقا کے بارے
... معلومات افزا مقالہ لکھا ہے، اس مقالے میں رباعی، اس کی قسموں اور معنوی تبدیلیوں
... معنی و ربط سے بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے اس ادبی روایت کی بھی نشاندہی
کی ہے جس سے دکنی رباعیوں کو لسانی لطافت اور معنوی تہ داری ملی ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے یہ ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج رباعیوں میں جو جمالیاتی موضوعات پیش کئے جا رہے ہیں یا آج اس کے فن
میں جو شادابی آئی ہے وہ دکنی رباعیوں کی مرہون منت ہے مجھے اس بات کا علم تو نہیں ہے پھر بھی میں
یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوش، فراق اور دوسرے رباعی گو شعراء نے رباعی گوئی سے پہلے دکنی شعراء
کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد بھی وہ دکنی رباعیاں نہ پڑھیں
اور اپنی تخلیقی اپج کی بنیاد پر رباعیاں لکھتے رہیں۔ دراصل، یہ ہماری قومی کمزوری ہے کہ ہم اپنے موضوعات
سے کچھ اتنا مبالغہ آمیز تعلق پیدا کر لیتے ہیں کہ معروضیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ فراق کی شرنگار رس کی
رباعیوں میں ... سیدہ جعفر صاحبہ کو عریانیت اور جسمانیت کا احساس ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ
شکایت کا ... ہے۔ ادب میں 'عریانیت' کی آج تک تعریف نہیں ہو سکی ہے۔ اسی وجہ سے وہ تمام
مقدمے جو عریانیت کی بنیاد پر چلائے گئے، ناکام رہے، میرے خیال میں ادب یا کسی بھی ادبی تخلیق کو کسی
بندھے ٹکے اخلاقی معیار پر پرکھنا بدمذاقی سے کہیں زیادہ بدتوفیقی ہے۔ اور رہی جسمانیت کی بات تو وہ
فراق کی ... اردو شاعری میں روح تھی، جذبہ تھا مگر جسم نہیں تھا۔ یہ کمی تھی جسے فراق نے پورا کیا۔
ہم بیزار ہونے کے بجائے شکر گزار ہونا چاہئے فراق صاحب کا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے محققین
میں اتنی صلاحیت نہیں پیدا ہو سکی ہے کہ وہ VALUE JUDGEMENT دے سکیں،
... سے کام لینا چاہیے۔

(انور صدیقی)

Regd. No. D - 768 February, 1968

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد [illegible]	بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: میال پریس دہلی

شذرات

[illegible] الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوا تھا، اس کے بعد ہر سال اُن کی یاد میں جلسے ہوتے ہیں اور تقریریں کی جاتی ہیں، امسال ۲۲ فروری کو اُن کی دسویں برسی منائی گئی، یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رہے گا، ایک رسم کے طور پر ایک ڈرامہ بن کر، مگر کیا اس سے مولانا مرحوم کی روح کو سکون [illegible] کہ جیسے جب وہ زندہ تھے تو تنہا تھے، بالکل اسی طرح مرنے کے بعد اُن کے [illegible] اداس، بے یار و مددگار، یوسف بے کارواں بن کر صحرا صحرا، بستی بستی پھر رہے ہیں، اور کوئی [illegible] نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے مولانا کو بھلا دیا ہے، اُن کے افکار و خیالات کو بھلا دیا [illegible] روایتی مزاج نے اُن کے نام کے ساتھ ایک مبہم، بے جان اور بے نام عقیدت [illegible]، اور وہ بھی ہم میں ایسے کتنے ہیں اور آنے والی نسلوں میں کتنے رہ جائیں گے،

[illegible]ت جواہر لال نہرو نے جامع مسجد کے جوار میں اُن کی آخری آرام گاہ کا انتظام کیا۔ خیال تھا کہ یہی جگہ مناسب ہے کہ مسلمان ہر روز نہیں تو کم از کم جمعہ جمعہ، عیدین اور جمعۃ الوداع کے موقعوں پر مولانا کے مزار [illegible] گے، لیکن آج جو منظر یہاں دیکھنے میں آتا ہے وہ بڑا دلخراش اور حوصلہ شکن ہے [illegible] مولانا عمر بھر غریب الدیار رہے، آج بھی وہی غربت کا عالم ہے، کس سے کہیے اور [illegible]

[illegible] ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور تصنیفی کارناموں پر تحقیق کی جائے گی، اُن کی کتابیں چھپیں

گی، اُن کے نام پر اکیڈمیاں اور اسٹڈی فورم قائم ہوں گے، اور یہ سب باتیں اس وقت کسی نہ کسی شکل میں ہو رہی ہیں، یہ بھی غنیمت ہے، لیکن ان کے خیالات و افکار کے ساتھ کتنا اعتنا برتا جا رہا ہے، یہ دیکھنے کی چیز ہے مولانا ہند و مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے، آج یہ اتحاد تو دور کی بات رہی، خود ملک کا اتحاد خطرہ میں ہے، مسز اندرا گاندھی نے بڑی جرأت سے ۲۲ فروری کو دہلی میں اس کا اعتراف کیا کہ ہم نے مولانا اور اُن کی باتوں کو بھلا دیا جس ملک کی یہ حالت ہے"، ہم نے خود وہ چراغ گل کر دیا جسے مولانا نے جلایا تھا۔ مولانا، ذہنی جمود، روایت پرستی، تنگ نظری اور منفی عصبیت کے شدید مخالف تھے، مذہب کے بارے میں یہ تمام عیوب مسلمانوں کو عہد وسطی کی میراث کے طور پر ملے تھے، کہیں کہیں انھوں نے اس صورت کو ایک لفظ یعنی "غفلت" سے تعبیر کیا ہے، انھوں نے اس غفلت سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی، بہت بولے، بہت کچھ لکھا عمر بھر بولتے اور لکھتے رہے، لیکن کیا نتیجہ نکلا ؟ مسلمانوں کو مذہب سے اور عقیدے کا تعلق تو ہے، ذہن کا کوئی تعلق نہیں، ذہن پر وہی عہد وسطی کے موٹے قفل لگے ہوئے ہیں اور صورت یہ ہے کہ دین اور دنیا دونوں کے دروازے بند ہیں، خدا اپنی مشیت کی تکمیل مختلف طریقوں سے کرتا ہے، مذہب اور مذہبی تجربے کے وسیلے سے اس مشیت کی ایک جھلک، خواہ وہ کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو، دیکھی جا سکتی ہے، اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں اِس بات کو اس طرح کہا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن میرے خیال میں یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مذہب سے تعلق میں عقیدے، جذبے اور ذہن، تینوں کا ایک خوشگوار امتزاج شامل ہو کہ اس طرح جو فکر صحیح بنے گا وہ کبھی عمل صالح سے عاری نہیں ہوگا ، اور ہم جانتے ہیں کہ فکر و عمل کے اس اتحاد سے خود مسلمانوں نے کیسے کیسے انقلاب برپا کئے ہیں اور تہذیب و تمدن کو کیا کچھ نہیں دیا ہے،

مولانا آزاد میں اجتہادِ فکر اور جرأت عمل تھی، یہی وصف وہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں دیکھنا

چاہتے تھے، یہی خوبی وہ چاہتے تھے کہ علماء میں بھی ہو، لیکن جدید [illegible] قسم کے پڑھے لکھے مسلمانوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُن کی باتوں [illegible] اعتنا نہیں سمجھا، جدید تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ اُن کے سیاسی خیالات کو پسند نہیں کرتا تھا، اور طبقۂ علماء میں شاید ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جو ان کے مذہبی خیالات سے اتفاق کرتا ہو۔ مولانا نے اپنے مذہبی خیالات کے اظہار میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن اس احتیاط کے باوجود "تمہید" کی ایک معمولی رمق بھی قابل قبول نہیں سمجھی گئی، برصغیر ہند و پاک کے کروڑوں مسلمانوں کا اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو سکتا ہے،

[illegible] اور سیکولرزم کے حامی تھے، اُن کے خیال میں ہندوستان کی نجات، ایک بڑے اور باوقار ملک کی حیثیت سے جمہوری اور سیکولر اصولوں کی پیروی ہی میں ہے، لیکن خود آج اُن کے ہموطن، بلکہ [illegible] جماعت کے با اثر افراد جس کے وہ تمام عمر رکن رکین رہے، ان اصولوں پر دیانتداری کے ساتھ کہاں تک عمل پیرا ہیں، کیا [illegible] اپنے ہیروز کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں ؟ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا [illegible] آج انھیں یا اُن جیسے دوسرے مرحوم قومی رہنماؤں کو خلوص کے ساتھ اپنا ہیرو مانتی ہے ؟

[illegible] آزاد ملک کی تقسیم کے شدید مخالف تھے، گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے بھی جب تقسیم کو مان لیا تو بھی وہ انکاری ہی رہے، کیونکہ وہ اصولاً اسے مُضر اور مہلک سمجھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ اِس کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اُن تمام سیاسی اور اخلاقی قدروں کے گلے پر چھری پھیری جائے جن کے لئے ملک نے مصیبتیں جھیلی تھیں اور قربانیاں دی تھیں، لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا، مولانا پھر آدمیوں کے جنگل [illegible] گئے ــــ تنہا، غریب الدیار، سناٹے کی آواز ــــ اور آج بھی جب کبھی مجھے جامع مسجد کے علاقے میں آدمیوں کے ہجوم سے گذر کر مولانا کے مزار پر جانے کی توفیق ہوتی ہے تو تنہائی سرگوشیاں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے "میں مولانا کے لئے تھی اور مولانا میرے لئے"،

مولانا ابوالکلام آزاد نے علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

تفاوت ست میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

عرصہ کے بعد، امسال جے پرکاش نرائن نے یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے جو

باتیں کہی ہیں اُن سے مولانا کی وہ بات، نئے سیاق و سباق کے ساتھ، ایک بار پھر تازہ ہو گئی، اس وقت ملک میں [illegible] اور اختلاف کی طاقتیں زور پکڑ گئی ہیں، بھائی بھائی کا دشمن اور انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے، ان حالات میں جمہوریت، سیکولرزم اور تمام شریفانہ اصولوں کو خطرہ لاحق ہے، اکثر [illegible] ہوتا ہے کہ امید اور حوصلے کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں، لیکن آدمی میں اگر ہمت اور دوربینی ہو تو دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنائی دے گی، اسی طرف، اپنے مخصوص لب و لہجہ میں، جے پرکاش نرائن نے علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کی توجہ مبذول کرائی ہے، دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان اگر ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ نئے ہندوستان میں، خصوصاً آج کے حالات میں، علی گڑھ جمہوریت، سیکولرزم اور قومی یکجہتی کا ایک مستحکم ستون بن سکتا ہے، علی گڑھ اگر ہمت، روشن ضمیری اور استقلال و استقامت سے کام لے تو مسلمان اس ملک کی آبرو بن سکتے ہیں، یہ امکانات اس یونیورسٹی کے لئے کھلنے والے دروازے کا حکم رکھتے ہیں اور عین اس عالم میں کہ جب اس کے نونہالوں کو بظاہر اپنے لئے تمام دروازے بند ہوتے ہوئے نظر آرہے ہوں۔

شری جے پرکاش نرائن نے کہا کہ "اس یونیورسٹی اور اس کے عظیم بانی نے کس طرح ماضی کے اندھیرے اور ظلمت پسندی کی چہار دیواریوں کو توڑنے کے لئے انقلابی رول ادا کیا ہے"۔ بالکل اسی طرح آج بھی جب ملک میں 'نور و ظلمت' کی آویزش شباب پر ہے، یہ یونیورسٹی انقلابی رول ادا کر سکتی ہے، بشرطیکہ یہاں کے تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے اپنے حصار، اپنی "خود پرستی اور خود آسودگی" کی غیر حقیقی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئیں اور اس میدان کارزار میں کود پڑیں جہاں سیکولر جمہوریت اور ایسے سماجی نظام کی جنگ لڑی جا رہی ہے جو معاشی خوشحالی کی ضامن ہو گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہے، بے شک یہ کام مشکل ہے، لیکن مسلم یونیورسٹی کا کام ہمیشہ مشکل ہی رہا ہے، سرسید مرحوم نے جن حالات میں کام کیا وہ کچھ کم مشکل نہیں تھے، اصلاح و تجدید کے جو نقشے انھوں نے پیش کئے اُن کی شدید مخالفت کی گئی، لیکن آخرکار وہ ایک 'طرح نو' ڈالنے میں کامیاب ہو گئے، کچھ اسی طرح کا کام علی گڑھ والوں کو آج کرنا ہے، پہلے اپنے ذہن کو جمود، اپنے دل کو خوف اور اپنی طبیعت کو اضمحلال سے پاک کرنا ہے اور پھر وہ مضبوط قدم اٹھانا ہے جس سے جمہوری اور سیکولر طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوں اور ملک ترقی و اصلاح کی طرف بڑھے، پسِ اپنی زنجیریں توڑنی ہیں جبھی ظلمت پسندی کے دوسرے قیدیوں کی رہائی کا سامان ہو گا۔

[illegible] حسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(١٧١٢ء — ١٧٧٨ء)

(٢)

روسو کا پہلا قابل قدر علمی کارنامہ، جیسا کہ اس کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے، اس کا وہ مقالہ [illegible] میں ڈیژون اکیڈیمی کے انعامی مقابلے کے لئے لکھا تھا اور جس کا عنوان تھا "کیا علوم وفنون کے احیا سے اخلاق کو ترقی ہوئی ہے یا نہیں" اس مقالے میں اُس نے جو موقف اختیار کیا وہ عنوان کی مخالفت میں تھا اور اسی لئے اس کا چرچا بھی بہت ہوا۔ اپنے عہد کے رائج طور طریقے اور علمی معیار سے ہٹ کر اُس نے اس موضوع پر اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کی اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا کہ "جس قدر ہمارے علوم وفنون درجۂ کمال کی طرف بڑھے اسی قدر ہمارے اخلاق بگڑتے گئے [illegible] کسی طرح ہمیں یہ نہیں باور کرلینا چاہئے کہ وہ علوم وفنون اور تہذیب و تمدن [illegible] ہاں جب وہ اپنے گردوپیش کی دنیا میں عالموں کی خوشامد، عیش پرست اُمرا کی [illegible] ذاتی، مہذب انسانوں کی ریاکاری اور مذہبی گروہ کی دنیاداری اور چالاکی [illegible] دیکھتا تھا تو اس کے ردمالذی ذہن میں اس انسان کی تصویر ابھرتی تھی جو سادہ [illegible] تہذیب وتمدن سے ناآشنا تھا، قوموں کی تاریخ میں ایسی واضح مثالیں بھی موجود تھیں کہ وحشی قبائل نے عظیم الشان سلطنتوں اور تہذیبوں کو تباہ وبرباد کردیا تھا۔ اس کے سامنے ایتھنز کی مثال بھی تھی جسے اپنی شاعری، خطابت، علم وفلسفہ، فن اور مہارت فن

پرناز تھا لیکن انھیں چیزوں نے اہلِ ایتھنز کو اخلاقی طور پر کمزور کر دیا تھا اور اتنا کمزور کر دیا تھا کہ سقراط کا عارفانہ "اعترافِ کم آگاہی" بھی انھیں زوال سے نہ بچا سکا۔

[illegible] کی زندگی حسرت و آرزو اور دکھ درد کی کہانی تھی، پیرس کی متمدن آبادی میں ہر طرف ظاہری شان و شوکت کے جلوے نظر آئے لیکن اس شان و شوکت کے لبادے کے نیچے اُ[illegible] نہیں سچی شرافت اور پاکیزہ اخلاق نہیں ملا، غالباً یہی وجہ ہے کہ اس مقالے میں اس کا لب و لہجہ شکایت کا ہے، ایک جگہ وہ کہتا ہے" ان انسانوں کے لئے جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں کیسی خوشی کی بات ہوتی اگر ہمارا ظاہر و باطن ایک ہوتا، ہمارے معاشرتی آداب ہمارے دلوں کے ترجمان اور ہمارے طور طریقے نیکی کے پشتیبان ہوتے، وہ کلیے جنھیں ہم مانتے ہیں ہمارے کردار کی اساس ہوتے اور سچے علم اور عالم میں کوئی دائمی رشتہ ہوتا، لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اتنی ساری خوبیاں ایک جگہ ملیں، شان و شوکت کی ایسی گہما گہمی میں نیکی اور سچائی کا سراغ مشکل ہی سے ملتا ہے۔"

اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس نے زیرِ بحث موضوع کو اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ورنہ مقالے کے شروع ہی میں وہ یہ نہ کہتا کہ انسان کی ترقی کی داستان بڑی عظیم اور دلکش ہے، انسان نے اپنی جد و جہد سے اپنا مقام بلند کیا، پہلے وہ کچھ نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ اُس نے عقل کی روشنی سے اس تاریکی کو دور کیا جس میں وہ گھرا ہوا تھا، زمین اور آسمان کو اپنے فکر و عمل کی جولانگاہ بنایا بالکل اسی طرح جیسے سورج طلوع ہوتے ہی تیزی کے ساتھ کائنات پر چھا جاتا ہے، لیکن اس سے زیادہ عظیم اور حیرتناک اس کا وہ عمل تھا جس کا تعلق اُس کی اپنی ذات سے تھا، اُس نے اپنی ہستی، اپنے نفس کا مشاہدہ کیا اور اپنی سیرت و سرشت، اپنے فرائض اور اپنے انجام کا راز معلوم کر لیا —— ظاہر ہے کہ تاریخِ انسانی میں اسی کاوش اور اس کے پیداشدہ نتیجوں کا نام ہی علم و فن ہے، روسو اسے سراہتا ہے اور انسان کا عظیم کارنامہ قرار دیتا ہے، لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ علم و فن کے نام پر سچائی اور انصاف کا خون ہوتا ہے اور نیکی رسوا اور ذلیل ہوتی ہے تو وہ دورِ ماضی میں اُس انسان کی تلاش کرتا ہے جو اپنی فطری حالت میں سادہ،

آزاد، خوش اور بے ریا تھا، اور "رجوع بہ فطرت" کی صدا لگاتا ہے۔ اس سے اس کی منشا یہ ہے کہ وہ اس قوم کو جو سطحی ہر دلعزیزی، دولت و شہرت [illegible] اور ظاہری حالت و شائستگی پر جان دیتی اور اپنے عمل سے انسانیت، سچائی اور نیکی کا مذاق اڑاتی تھی [illegible] یاد دلائے جب جسم اور روح دونوں توانا تھے، سامان آسائش اگرچہ کم تھا لیکن سچی خوشی کی دولت میسر تھی [illegible] تو انسانیت تھی۔

[illegible] اس مقالے میں جو خیالات پیش کئے ہیں وہ اس کے مخصوص [illegible] کی پوری ترجمانی [illegible] ہیں، وہ چاہتا تھا کہ اس کی سماج اور تہذیب ان آلائشوں [illegible] پاک ہو جائے [illegible] کے لئے تباہ کن ہیں، سماج کی تنظیم اس طرح ہو کہ انسان اپنے آپ کو آزاد محسوس کرے [illegible] رسم و رواج کے بندھن ٹوٹ جائیں اور اس میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے [illegible] ظاہر کرے جیسا کہ وہ ہے۔

[illegible] روسو کا یہ کارنامہ ہے کہ [illegible] یہ جانتے ہوئے کہ لوگ اس کے مخالف ہو جائیں گے [illegible] کر کے اپنے معاشرے پر تنقید کی، زیر بحث مقالے کے دیباچہ میں اس نے لکھا ہے:

"مجھے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ میں نے جو موقف اختیار کیا ہے اسے لوگ معاف نہیں کریں گے۔ آج جو کچھ پسند کیا جاتا ہے اس کے خلاف اس طرح میرا کھڑا ہو جانا، خود اس بات [illegible] خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا جائے گا۔ لیکن میں نے [illegible] اور دنیا پرستوں کے خوش کرنے کی فکر نہیں ہے [illegible] جو پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ اپنے معاشرہ کے رائج فکری [illegible] کے محکوم بنیں۔ کوئی مصنف جو اپنے عہد سے بلند و بالا ہوتا ہے، اس قسم کے [illegible] کے لئے نہیں لکھتا۔"

اس مقالے کا تجزیہ اگر اسلوب [illegible]

لگے گا کہ اس میں سطحی خطابت کے سوا اور کچھ نہیں، معلومات اور مواد کے اعتبار سے اس کی بہت اہمیت نہیں ہے، اس کے متعلق روسو نے خود اعترافات میں اپنی رائے اس طرح لکھی ہے: "بیان کے زور اور جذبے کی گرمی سے بھرپور یہ مقالہ پورے طور پر ترتیب خیال اور منطقی استدلال [illegible]، میری تمام تصنیفوں میں یہی مقالہ دلائل کے اعتبار سے سب سے کمزور اور توازن کے لحاظ سے سب سے [illegible] ہے، کسی انسان میں خواہ کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو، لکھنے کا فن اُسے دیر میں آتا ہے۔"

[illegible] بالکل صحیح ہے، اس مقالے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ یکطرفہ اور بیباکانہ کہی گئی ہیں اور بیجا نبداری اتنی واضح اور سادہ لوح ہے کہ کبھی کبھی یہ گمان گذرتا ہے کہ روسو نے یہ خیالات سنجیدگی کے ساتھ پیش کئے اور فکر و نظر کے خزانے میں اس سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اسی مقالے سے روسو کی شہرت ہوئی اور پیرس کے پڑھے لکھے طبقے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی، اس مقالے سے، بہرحال، یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ 'فطرت' کو وہ آئیڈیل قرار دیتا ہے، اور شروع ہی سے یہ خیال اس کے ذہن میں جما ہوا ہے، اور صرف اُسی کو وہ اپنے ذہن کی تمام توانائیوں کے ساتھ سارے حدود کو نظر انداز کرتا ہوا، مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے، اس لحاظ سے اس مقالے کو ہم روسو کے ارتقائے فکر کی کنجی کہہ سکتے ہیں، یعنی فکر و خیال کا وہ سفر جو "معاہدۂ عمرانی" پر ختم ہوا، اس کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

روسو کی دوسری تصنیف "انسانوں میں عدم مساوات کا آغاز" ہے۔ یہ مقالہ بھی اُس نے دیژون اکیڈیمی کے لئے لکھا تھا، اس مقالے میں اُس نے کئی سیاسی اور عمرانی مسئلوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور خیالات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ پہلے مقالے سے بہتر ہے، یعنی اس میں اُس طرح کی انتہا پسندی نہیں ملتی جیسی کہ علوم و فنون والے مقالے میں تھی، یہ ضرور ہے کہ "انسان کی فطری حالت" اور "سماجی حالت" میں جو نمایاں فرق پہلے تھا، وہ اس مقالے میں بھی موجود ہے، لیکن اب وہ اپنے نظریوں کو جذبے کی شدت اور خطابت کی گرمی کے بجائے عقلی دلائل سے [illegible] ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے بھی مانتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اس کے موقف کے

خلاف بھی کہا جا سکتا ہے، مزید براں "فطری حالت" کے متعلق بھی اُس کے خیال میں تبدیلی اور ترقی کا احساس ہوتا ہے، اب یہ سماج کی برائیوں کے مقابلے میں محض ایک خالی خ[illegible] نہیں ہے [illegible] اس خیال کے کچھ مثبت پہلو بھی سامنے آتے ہیں [illegible] دوسرا مقالہ اُس کے ذہنی سفر کی د[illegible] جا سکتا ہے۔

[illegible] کا اصل موضوع اس نے یہ بتایا ہے کہ تاریخ انسانی میں "وہ وقت معین کیا جائے [illegible] اور تشدد کا دور دورہ ہو گیا اور خود فطرت انسانی قانون کے ماتحت کر دی [illegible] یہ بتایا جائے کہ کن "معجزوں" کے نتیجہ میں طاقت وروں نے کمزوروں کو اپنی اطاعت [illegible] نے بھی سچی خوشی کے بدلے ایک فرضی سلامتی خرید لی" روسو نے ان [illegible] اور مفکروں پر تنقید کی ہے جنہوں نے انسان کی فطری حالت کا نقشہ غلط خطوط پر کھینچا اور انسان کی [illegible] ظاہر رہے، انھوں نے فطری زندگی کو اس انداز سے بیان کیا گویا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے، حالانکہ ان کی رائے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے اپنے معاشرے کے [illegible] کمزوریوں کو فطری انسان کے سر منڈھ دیا، اس سلسلہ میں اُس نے چبھتی ہوئی ایک [illegible] مصنف اور مفکر "ذکر کرتے ہیں وحشی کا اور تصویر بناتے ہیں مہذب آدمی کی" اُس نے انسان کی فطری حالت کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس طرح ہے کہ ہر انسان فطری حالت میں، اپنی [illegible] تھا، یعنی اس پر کوئی اخلاقی اور سماجی پابندی نہیں تھی، اس لئے اگر وہ اچھا نہیں تھا [illegible] جبلت کی بنا پر جو ضرورتیں ہوتی تھیں، انھیں وہ آزادی سے پورا کرتا تھا اور پھر [illegible] تا تھا، یہ دنیا خود اس کے لئے پُر اسرار تھی، پھر آج کوئی کیسے اس پر حکم لگا سکتا [illegible] بھی انسانی عقل خود عہد طفولیت میں تھی، نہ معلوم کتنے عہد [illegible] تب کہیں عقل و شعور نے ترقی کر کے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ گرد و پیش کے دوسرے [illegible]وں میں تال میل قائم کر کے اپنے ارادے اور قوت ایجاد سے اپنی زندگی میں تغیر پیدا کر سکے، اسی چیز نے اس پر باہمی امداد کی سود مندیاں واضح کیں، اُس نے اپنی بیوی اور بچے کو پہچانا، خاندان [illegible]

اور پھر ملکیت کا تصور اُبھرا۔ روسو نے اس سلسلہ میں اپنے مقالے کے دوسرے حصہ کو اس جملہ سے شروع کیا ہے: "معاشرہ کا اصل بانی وہ پہلا شخص تھا جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کے چاروں طرف باڑھ لگا کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ یہ میرا ہے، اور جسے ایسے سادہ لوح لوگ مل گئے کہ انھوں نے اس کی بات مان لی۔ کوئی بھی شخص اگر اس وقت اس باڑھ کی خندق اور نشانات مٹا دیتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا "اس جھوٹے دعویدار سے ہوشیار رہو، تم کہیں کے نہ رہو گے اگر تم نے یہ بات بھلا دی کہ زمین کی ہر چیز ہم سب کی ہے اور خود زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ تو وہ انسانیت کا کتنا بڑا محسن ہوتا کہ اس کی وجہ سے نوعِ انسانی بے شمار جرائم، لڑائیوں، قتل و غارت گری، خوفناک تباہیوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہو گئی ہوتی۔" لیکن روسو جذبہ کی شدت سے جلد ہی اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید اس واقعہ سے پہلے ہی صورت حال اتنی بدل چکی تھی کہ انسان اپنی اصلی حالت میں نہیں رہ سکتا تھا، اور وہ اس صورت حال پر آنسو بھی نہیں بہاتا کیونکہ وہ اسے ناگزیر سمجھتا ہے اور باوجود اس کے کہ خرابیاں پیدا ہو چلی تھیں، وہ انسانی ارتقاء کی اس منزل کو 'دنیا کے شباب کا زمانہ' کہتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات اپنے ذہن میں صاف کر لینی چاہئے کہ روسو 'فطری انسان' کو محض ایک معیار قرار دیتا ہے، اور یہ معیار محض ایک شدید ذہنی ردعمل کا ترجمان ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ فطری انسان کو اُن تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ جن کا وہ ذکر کرتا ہے، کوئی تاریخی حقیقت تصور کرتا ہے، ہوبز، اسپنوزا اور لوک نے انسان کی فطری حالت کے بیان میں بڑی افراط و تفریط سے کام لیا تھا اور روسو کا یہی الزام ہے ان مفکروں پر۔ لیکن روسو خود بھی مبالغہ سے بالکل دامن نہیں بچا سکا ہے، اُس کا فطری انسان بھی محض اُس کے تصور کی ایجاد ہے، انسان جب جانوروں کی سی زندگی گذارتا تھا تو یقیناً وہ ان تفکرات اور الجھنوں سے آزاد تھا جو ترقی[۱]، تہذیب اور تمدن

---

[۱] یہاں 'ترقی' کا لفظ بڑے وسیع اور بلیغ مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اس میں شعور کی وہ بیداری بھی شامل ہے جس کے طفیل انسان کو خودشناسی اور خداشناسی کا جوہر ملا۔

کی دین ہیں، لیکن یہی تو وہ بارِ امانت ہے جس پر اسے فخر ہے، اس کے علاوہ اگر وہ کچھ اور تھا یا [illegible] قابل رحم ہے، چاہے وہ فرشتہ ہو یا وحشی۔

روسو کے خیال میں ملکیت کے تصور کے ساتھ انسانوں میں "من و تو" یہ تیرا ہے یہ میرا ہے [illegible] ہی پیدا ہوا، اور [illegible] کی بنا پڑ گئی، اس کے بعد کھیتی باڑی، مختلف چیزوں کی دریافت اور ان چیزوں [illegible] سلسلہ شروع ہوا اور لوگ [illegible] اور سامان آسائش کی تلاش میں لگ گئے، دولت کی تقسیم، محنت اور وسائل میں توازن نہ ہونے کی وجہ سے، غیر متوازن ہو گئی، پھر ایسا ہوا کہ کچھ لوگوں کے پاس دولت بہت بڑھ گئی اور کچھ لوگ خالی ہاتھ رہے، اس سے معاشرہ میں فساد پیدا ہوا، دولتمندوں نے غریبوں کو محکوم رکھنے کے لئے قانون وضع کر لئے، اور اس طرح معاشرتی اور [illegible] ے قائم ہوئے، روسو کی ان تمام قیاس آرائیوں میں کوئی منطقی ربط [illegible] مقالے میں ضمناً معاشرتی اور سیاسی مظاہر کا ذکر آ گیا ہے جنہیں بعد میں اس نے [illegible] عمرانی' میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا۔

قبل اس کے کہ ہم 'معاہدہ عمرانی' اور اس کے نظریوں پر بحث کریں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روسو کے اس مقالے کا ذکر بھی کر دیا جائے جس کا عنوان 'معاشیات' ہے، یہ مقالہ اس نے 'عدم مساوات' والے مقالے سے پہلے لکھا تھا لیکن اس میں ذہن کی پختگی اس سے زیادہ ہے اور اس میں [illegible] نظریہ ارادۂ عامہ' (General Will) کی جسے آگے چل کر اس نے [illegible] وضاحت سے بیان کیا، ایک جھلک دکھائی دیتی ہے، اس مقالے میں اس نے ریاست کی ماہیت سے بحث کی ہے، اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ریاست اور انسانی آزادی میں ہم آہنگی قائم کی جا سکتی ہے، اور مختصراً لیکن بڑے سلیقے سے، یہ بتایا ہے کہ محاصل کی تشخیص (Taxation) کن اصولوں پر کرنی چاہئے، ریاست کے متعلق اس کا خیال ہے کہ اسے اپنے تمام افراد کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا چاہئے اور محاصل کی تشخیص و تجویز میں یہی مقصد [illegible] تو فرد [illegible] کی بھلائی ہے، [illegible] پر جس کے پاس [illegible]

زندگی ہیں، کوئی ٹیکس نہیں لگانا چاہیئے، اس کے برخلاف تعیشات پر بھاری محصول عائد کرنا چاہیئے، ظاہر ہے یہ خیالات ایک پختہ ذہن کے ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاہدہ عمرانی کی تاریخ تصنیف سے [illegible] معاشی طرز فکر سے بڑی حد تک آزاد ہو چکا تھا۔

روسو کی سب سے زیادہ مکمل سیاسی تصنیف 'معاہدۂ عمرانی' ہے جو ۱۷۶۲ء میں "ایمیل" کے ساتھ شائع ہوئی، اس طرح ہم ۱۷۶۲ء کو اُس کے ذہنی سفر کی آخری منزل کہہ سکتے ہیں، اب تک اُس نے [illegible] لکھا تھا، اس میں ایک طرح سے مناظرانہ پہلو غالب تھا، لیکن اب اُس کے نظریے پختہ ہو چکے [illegible] اُن کے تمام پہلو اس کے سامنے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ۱۷۶۲ء میں وہ سیاسیات اور تعلیم کے بنیادی مسئلوں پر اپنے غور و فکر کا نچوڑ دنیا کو پیش کرتا ہے، پہلے کی تحریروں میں اُس کا مقصد تخریبی معلوم ہوتا ہے، 'معاہدۂ عمرانی' میں اس کی نظر تعمیر پر ہے، اور یہ صحیح ہے کہ نئی تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہوتی ہے،

'معاہدۂ عمرانی' کے مطالعہ کے لئے یہ بہتر ہو گا اگر اس سے پہلے کے مقالے بھی پڑھ لئے جائیں، ویسے یہ کتاب خود اپنی جگہ مکمل ہے، اس کتاب میں روسو نے مون ٹسکیو کی طرح یہ نہیں کیا ہے کہ موجود ریاستوں کے اداروں پر بحث کرے، بلکہ اُس نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ بنیادی اور ضروری اصول پیش کرے جو ہر جائز اور قانونی ہیئتِ اجتماعی کی اساس بن جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ معاہدۂ عمرانی میں وہ جذباتیت مفقود ہے جو روسو کی اکثر تحریروں کی خصوصیت ہے، اس میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان سے اگرچہ جمہوری نظام کی کسی قدر تائید ہوتی ہے لیکن دراصل اجتماعی آمریت کے جواز کا پہلو زیادہ نکلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہری جمہوریت کے حق میں تو تھا لیکن بڑے ملکوں میں جمہوریت کو مناسب اور ممکن نہیں تصور کرتا تھا، ایک جگہ تو اُس نے کھل کر یہ بات کہدی ہے کہ چھوٹی ریاستوں کے لئے جمہوریت، اوسط درجہ کی ریاستوں کے لئے اشرافیہ اور بڑی ریاستوں کے لئے بادشاہت ہی سب سے زیادہ موزوں نظام حکومت ہے، جمہوریت سے اُس کی مراد یہ [illegible] کہ وہ نظام حکومت جس میں ہر شہری براہ راست

شریک ہوسکے، نمایندہ حکومت کو وہ "انتخابی اشرافیہ" کہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شہری ریاست کے لئے اُس کے دل میں بڑی جگہ تھی اور یونانیوں کا اسی وجہ سے وہ بڑا مداح تھا، روسو کے سیاسی فلسفہ کے اس پہلو پر عام طور پر بہت کم زور دیا گیا [illegible]

[illegible] کی مشہور کتاب میں خطابت بھی بہت کم ہے، لیکن پہلے باب کا آغاز بڑے خطیبانہ انداز میں کیا گیا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا [illegible] کو دوسروں کا آقا سمجھتے ہیں، لیکن اصل میں ان سے بھی بڑھ کر غلام ہوتے [illegible] تبدیلی کیسے ہوئی؟ مجھے نہیں معلوم ۔ یہ حق بجانب کیونکر ثابت کی جا سکتی ہے؟ [illegible] مسئلہ کو حل کر سکتا ہوں۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسو نے آزادی کو اپنی فکری کاوشوں کا موضوع برائے نام بنایا ہے، دراصل وہ مساوات کو زیادہ اہم قرار دیتا ہے، مساوات کو وہ ہر قیمت پر، آزادی کی قیمت دے کر بھی حاصل کرنے کا آرزومند ہے۔

[illegible] بات کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے" ہر لحاظ سے صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ [illegible] حالت میں بھی وہ آزاد نہیں تھا، فطری حالت سے ترقی کرتے کرتے جب وہ وقت [illegible] اپنی "ابتدائی آزادی" کے زمانے میں (یہ ابتدائی آزادی جیسی کچھ بھی رہی ہو) اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا، تو یہ ضروری ہو گیا کہ وہ دوسروں سے مل کر معاشرہ کی بنیاد ڈالے [illegible] معاشرہ اور پھر بعد میں سیاسی نظام کو برحق ثابت کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان [illegible] جکڑا ہوا ہے، لیکن یہ زنجیریں خود اس کی بنائی ہوئی ہیں، اور یہ دراصل [illegible] ری، خودغرضی اور نفس پرستی نے ڈھالی ہیں، ورنہ سچی آزادی ایک ایسے معاشرہ میں حاصل ہو سکتی ہے جہاں صحیح اور صالح قسم کے سیاسی اصولوں کی کارفرمائی ہو،

روسو کے نزدیک سیاسی معاشرہ کی بنیاد نہ تو ظلم پر قائم ہے اور نہ خوف پر، بلکہ یہ قائم ہے [illegible] رضامندی اور ارادہ سے اور اسی لئے اس کی ایک اخلاقی بنیاد ہوتی ہے، جہاں رضامندی اور ارادہ کو دخل ہو گا وہاں اجتماعی معاہدہ میں اخلاقی شعور کی کارفرمائی ہو گی، لیکن

کے اجتماعی معاہدہ کے نظریے پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں تو اچھا ہوگا کہ کس طرح فطرت آزادی اور فطری حالت میں انسان کی مسرت، آسودگی اور بے فکری کا گن گانے والا یہ مفکر سیاسی معاشرہ کو، اس کی تمام پابندیوں کے باوجود، انسان کے لئے نعمت غیر مترقبہ تصور کرتا ہے، معاہدۂ عمرانی کے آٹھویں باب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتا ہے:

[illegible] سیاسی نظام میں داخل ہونے سے انسان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے عمل میں جبلت کی جگہ انصاف کا معیار کار فرما ہو جاتا ہے اور اس کے افعال میں وہ اخلاقی صفت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے موجود نہ تھی، اس وقت جسمانی خواہش کے بجائے فرض کا احساس، ہوس کی جگہ حق کا احساس، انسان کے عمل کا محرک بن جاتا ہے اور انسان جو اب تک اپنے سوا کسی اور کا خیال نہیں کرتا تھا، خود کو دوسرے اصولوں کے مطابق چلنے پر مجبور پاتا ہے اور اُسے نفس کا کہا ماننے سے پہلے عقل کے مشورے پر چلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حالت میں وہ بہت سے اختیارات کھو بیٹھتا ہے جو اسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، لیکن ان کے بدلے میں اُسے اتنے ہی بڑے فوائد بھی پہونچتے ہیں، اس کے قویٰ استعمال میں آتے ہیں، اس کے خیالات وسیع، اس کے احساسات لطیف اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں، اس کی ساری شخصیت بلندی کے اس درجہ پر پہونچ جاتی ہے کہ اگر اس نئی حالت میں خود اس کی زیادتیاں اور دستور کی بُرائیاں اسے اس کی قدیم حالت سے بھی زیادہ نیچے نہ کر دیتیں، تو اس کا فرض ہو جاتا کہ ہمیشہ اس مبارک لمحے کو دعا دیتا رہے جب وہ فطری زندگی کی قید سے رہا ہوا اور ایک بیوقوف اور جاہل جانور سے، ایک ذی عقل ہستی، ایک انسان بن گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سیاسی معاشرہ کی تشکیل کیسے برحق سمجھی جائے؟ اِسے روسو نے

ترجمہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی کتاب "تاریخ فلسفۂ سیاسیات" سے لیا گیا۔

اس طرح حل کیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سب کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو اس ہیئت اجتماعی کے سپرد کر دیتا ہے جو ہماری ذات اور جان و مال کی حفاظت کرتی ہے اور اس کے بدلے ہم ہر ایک کو اس اجتماعی ہستی کا جزو تسلیم کرتے ہیں [illegible] کوئی خسارہ میں نہیں رہتا، شرطیں سب کے لئے ایک ہوتی ہیں، [illegible] ایک ہوتے ہیں، سب، سب کے فرمانبردار ہوتے ہیں اس لئے سب آزاد ہوتے ہیں، ایک دوسرے [illegible] یہی بات اس طرح کہی ہے: "مختصر یہ کہ ہر شخص چونکہ اپنے آپ کو اور سب کے حوالے کرتا ہے اس لئے وہ دراصل اپنے آپ کو کسی کے بھی حوالے نہیں کرتا، اور چونکہ معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہوتا جس پر ہم کو وہ حقوق حاصل نہ ہو جائیں جو ہم خود اسے دیتے ہیں، اس لئے ہم جتنا کھوتے ہیں اتنا ہی ہمیں واپس بھی مل جاتا ہے اور جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے اسے محفوظ رکھنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔"

محفوظ رکھنے کی اس طاقت کا اظہار اُس اجتماعی ہستی کے وسیلے سے ہوتا ہے جو معاہدہ کے بعد وجود میں آتی ہے اور روسو کے الفاظ میں ارادۂ عامہ (General Will) کی حامل ہوتی ہے، روسو کے سیاسی تصورات میں ارادۂ عامہ کے تصور کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے اور شاید اسی لئے اس کی کئی تشریحیں کی گئی ہیں، خود مصنف کا اس سے کیا مقصد ہے اس سوال کا جواب بھی آسان نہیں، پھر بھی وسیع تر معنوں میں اس کا جو مفہوم ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ معاہدۂ اجتماعی کے بعد ہر فرد کی اپنی شخصیت کے بجائے کمیونٹی کی اپنی ایک شخصیت جنم لیتی ہے جو اجتماعی اور اخلاقی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی [illegible] زندگی اور ارادہ ہوتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ارادۂ عامہ ہمیشہ عوام کی فلاح و بہبود کی جانب ہوتا ہے یا یہ بھی غلط راہ پر پڑ سکتا ہے، اس سلسلہ میں روسو نے "تمام لوگوں کے ارادے" اور "ارادۂ عامہ" میں فرق کیا ہے، آخر الذکر مشترک مفاد کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ اول الذکر انفرادی اور نجی مفاد کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ مخصوص ارادوں کا ایک مجموعہ [illegible] ارادوں کے متضاد اور متخالف اجزاء کے چھٹ جانے کے بعد جو چیز بچتی ہے وہ سب میں مشترک ہوتی ہے اور یہی ارادۂ عامہ ہے، اس کا خیال ہے کہ ارادہ عامہ ہمیشہ عام مفاد

کی طرف مائل رہتا ہے اور شہریوں کو صحیح راستے پر چلنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ معاہدۂ عمرانی کے چوتھے حصے کے ابتدائی جملوں سے اس مبہم نظریے کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے۔

> جب تک کہ انسانوں کی ایک متحد جماعت اپنے آپ کو ایک جسم سمجھتی رہے، اس کا عام حفاظت اور فلاح سے متعلق ایک ارادہ رہتا ہے۔ اُس وقت ریاست کے تمام قوی چُست اور سادہ ہوتے ہیں اور اس کے سیاسی اصول صاف اور روشن، اس میں اغراض کی پیچیدگیاں اور تضاد نہیں پایا جاتا، عام مفاد حاصل کرنے کی صورت ہر جگہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اسے دریافت کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی عقل سلیم درکار ہوتی ہے۔

یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ 'ارادۂ عامہ' اور 'اکثریت کا ارادہ' ایک ہی چیز نہیں ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر 'ارادۂ عامہ' کے وہ مظاہر کون سے ہیں جنھیں ہم دیکھ سکیں، روسو کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں، البتہ اُس کی رائے میں، جسے ہم منفی رائے کہہ سکتے ہیں، 'ارادۂ عامہ' کے اظہار میں عملاً جو چیز مخل ہوتی ہے وہ ریاست میں مختلف انجمنوں کا وجود ہے، ایسی ہر انجمن کا اپنا ایک ارادۂ عامہ ہوگا، جو مجموعی طور پر پوری کمیونٹی کے ارادۂ عامہ سے متصادم ہو سکتا ہے، اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کمیونٹی میں اتنے ووٹ نہیں ہیں جتنے کہ افراد ہیں بلکہ اتنے ووٹ ہیں جتنی کہ انجمنیں ہیں۔ اس سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ "ضروری ہے کہ ریاست کے اندر کوئی اور ریاست نہ ہو اور ہر انسان کے جو خیال ہوں وہ اس کے اپنے ہوں، لی کرگس نے جو نظام قائم کیا تھا اُس کی یہی خوبی تھی۔"

اب اگر اصول کے مطابق ایک نظام قائم کیا جائے تو کیا صورت ہوگی؟ ریاست کا اپنا ایک کلیسا اور مذہب ہوگا اور دوسرے کلیساؤں اور مذہبوں، سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں اور دوسری تنظیموں پر پابندی لگا دی جائے گی، اور نتیجہ میں ایک اجتماعی آمریت اُبھرے گی جو فرد کی آزادی کو سلب کرلے گی، بعد میں روسو کو خیال آیا کہ یہ تو آسان کام نہیں ہے کہ انجمنوں اور تنظیموں پر پابندی لگا دی جائے، اس لئے اُس نے یہ تجویز کیا کہ اگر ایسا ناگزیر ہو تو انجمنوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو اتنا ہی بہتر ہے تاکہ یہ انجمنیں ایک دوسرے کو بے اثر بنا دیں، بعد میں کتاب کے ایک دوسرے باب میں جب وہ حکومت

اور اس کی ماہیت پر غور کرتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انتظامیہ [illegible]
ارادہ عامہ جس کے کچھ اپنے مفاد ہوتے ہیں، یہ ارادہ [illegible] عامہ کمیونٹی کے ارادے اور مفاد سے متصادم
[illegible] ہیں۔ انتظامیہ کے ایک فرد کے پاس تین ارادے ہوتے ہیں: ایک اس کا اپنا ذاتی ارادہ، ایک
حکومت کا [illegible] عامہ، ہونا یہ چاہیئے کہ یہ تینوں مل کر کمیونٹی کے ارادۂ عامہ کے تقاضے پورے
[illegible] بتدریج وہ گھٹ کر شخصی ارادہ کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ تمام چیزیں متحد ہو کر
آدمی کو عقل [illegible] احساس سے محروم کر دینے کی سازش کرتی ہیں جیسے دوسروں پر اختیار اور اقتدار
[illegible]

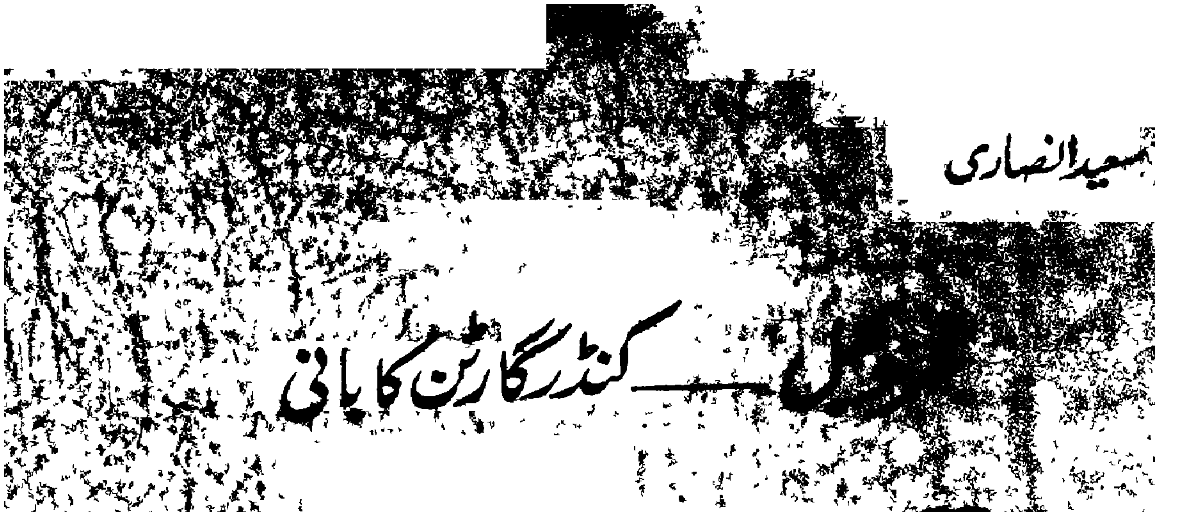
اس طرح ارادہ عامہ جو روسو کے خیال میں کبھی بگڑتا نہیں، ہمیشہ ایک سا اور خالص رہتا ہے، اس بات کی ضمانت نہیں بن سکتا کہ حکمران ظالم نہیں ہو سکتا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ارادہ عامہ کی [illegible] کا مسئلہ کہ ظلم اور جبر سے کیسے بچا جائے، جوں کا توں باقی رہتا ہے۔

[illegible] ساورنٹی) کے متعلق روسو کا نظریہ ہے کہ یہ حق کسی کو دیا نہیں جا سکتا اور نہ تو شہری اس کو اپنے ارادے سے محدود کر سکتے ہیں، اگر ایسا ہو جائے تو وہ معاہدہ ہی ختم ہو جائے گا جس کے ذریعہ سیاسی معاشرہ وجود میں آیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فرمانروائی کی تمام شرطیں شہریوں کو پوری کرنی چاہئیں، فرمانروا کا کام قانون وضع کرنا، حکومت کا طریقہ متعین کرنا، حاکموں کو مقرر کرنا اور ان کے لئے قاعدے اور ضابطے بنانا ہے۔ اصل میں روسو نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ اسے حاکموں پر بھروسہ نہیں تھا، اور نمائندہ حکومت سے بھی وہ ڈرتا تھا، پھر بھی وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکا ہے کہ قوم اگر فرمانروا ہے تو وہ اپنی اس فرمانروائی کو کس طرح ظاہر کرے۔ ایک طریقہ اس کے اظہار کا نمائندوں کے ذریعہ ہے، لیکن وہ اسے بھی پسند نہیں کرتا، نمائندوں کے رواج کو وہ ایک طرح سے جاگیرداری نظام کا ترکہ سمجھتا ہے، اس لئے آپ سے "انگلستان کا دستور [illegible] اس کی رائے میں انگریز صرف اس تھوڑی سی مدت کے لئے صحیح معنوں میں آزاد ہوتے ہیں جب وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں،" اور اپنی آزادی کے لمحوں کو وہ جس طرح استعمال کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی قابل ہیں کہ ان کی آزادی چھین لی جائے۔" اس مبالغہ اور انتہاپسندانہ

رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ روسو اپنے عہد کے تمام سیاسی نظاموں سے بیزار تھا، اصل میں اس کا بنیادی اصول ... ریاست چھوٹی ہونا چاہئے لیکن دنیا یونان کی شہری ریاستوں سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

'معاہدۂ عمرانی' کے آخری باب کا عنوان "معاشرتی مذہب" ہے، اس میں روسو نے عیسائی مذہب ... جو کچھ کہا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے، عیسائیت نے گذشتہ صدیوں میں جو شکل اختیار کر لی تھی، روسو اس سے بہت بیزار تھا، اپنے عہد کی عیسائیت میں اسے تضاد ہی تضاد نظر آتا تھا اور شاید وہ اپنے عہد کے کسی عیسائی کو عیسائی ماننے کے لئے تیار نہیں تھا، ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ "سچے عیسائیوں کا کوئی معاشرہ کوئی قوم نہیں ہو سکتی" اس وقت یورپ میں معاشرے بھی تھے، قومیں بھی تھیں اور وہ کلیسائی نظام بھی تھا جو قوت اور اقتدار میں یورپ کی کسی ریاست سے کم نہیں تھا، لیکن وہ بہرحال خدا کا منکر نہیں تھا اور خدا کا ایک ازلی حقیقت اور ابدی قوت کے طور پر قائل تھا، پھر بھی اُسے مذہب کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا ضرور تھا، اس لئے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مذہب دو طرح کا ہوتا ہے، ایک ذاتی اور دوسرا معاشرتی، ذاتی مذہب اگر اس سے اچھا شہری بننے میں مدد ملتی ہے، فرمانروا کے دائرۂ اثر سے باہر ہے کیونکہ اس سے مفاد عامہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا لیکن معاشرتی مذہب کے عقائد فرمانروا کو طے کرنا چاہئے اور ظاہر ہے کہ یہ عقائد "نیک چلنی کے عقائد" ہوں گے جن کے بغیر اچھا اور مفید شہری بننا ناممکن ہے، اگر کوئی شہری معاشرتی مذہب کو نہ اپنائے تو ریاست کو یہ جبر نہیں کرنا چاہئے کہ وہ اس مذہب کو ضرور مانے، البتہ اُسے وہ ملک بدر کر سکتی ہے "سیاسی مذہب کے عقیدے بہت سادے اور سلجھے ہوئے ہونا چاہئیں، اور ان کی تعداد بھی کم ہونی چاہئے۔ خدا کی ذات، اس کی قدرت، انصاف اور علم غیب پر ایمان لانا، موت کے بعد کی زندگی، نیکی اور بدی کا اجر اور معاہدۂ عمرانی اور قانون کے تقدس کا معتقد ہونا کافی ہے۔ نواہی میں میرے نزدیک صرف 'ناروا داری' کافی ہے، کیونکہ یہ انہیں فتنہ انگیز عقیدوں کا ایک حصہ ہے جسے ہم نے چھوڑ دیا ہے"

(باقی)



سعید انصاری

[illegible] ـــــ کنڈرگارٹن کا بانی

[illegible] میں جرمنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کلیسا [illegible] فروبل کی ابتدائی تعلیم بڑی بے تکی اور بے مقصد ہوئی۔ اس نے جو تعلیم بھی حاصل کی، [illegible] زندگی کے کاموں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی نوجوانی کا زمانہ بھی کچھ تو یونیورسٹی کی [illegible] کچھ نیچرل سائنس کے کاموں میں۔ وہ کبھی تو ایک محکمہ جنگلات کے افسر کے ہاں کام کرتا رہا، [illegible] پر بہ حیثیت محاسب اور ناظر کے کام کیا اور بعد میں ایک میوزیم میں مددگار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ [illegible] میں کام کرنے سے اس کی زندگی میں دو نتیجے پیدا ہوئے: ایک تو یہ کہ اس میں نطرت سے ایک گہری دلچسپی پیدا ہوگئی اور دوسرے یہ کہ اس نے دیکھا کہ ساری نطرت میں ایک وحدت پائی جاتی ہے جس کا ذکر یونیورسٹی کے فلسفہ میں تو ملتا ہے لیکن تعلیمی کاموں میں کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اسی دوران میں اس کی پیسٹالوزی سے سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوگئی اور شاید اسی کے اثر سے اس نے ۲۴ سال کی عمر میں معلمی کا پیشہ اختیار کرلیا اور فرانکفرٹ کے پیسٹالوزین انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہوگیا۔ یہاں دو سال قیام کرنے کے بعد اس نے تین بچوں کی اتالیقی کی اور انھیں لے کر وہ ویردون کے پیسٹالوزین انسٹی ٹیوٹ میں چلا گیا۔ اور اس سے کچھ عرصہ تک بے ضابطہ طور پر وابستہ رہا۔ اس تعلق سے [illegible] سے دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ باقاعدہ طور پر یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ لیکن اسی زمانہ میں نپولین کے حملہ نے جرمنی کی قومی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا، اور اس کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے [illegible] فروبل بھی میدان میں کود پڑا، اس لئے کہ اس سے اس کے قومی وحدت کے خیال میں مدد ملتی تھی۔ اس نے

... کی خواہش پیدا ہوئی اور تعلیمی اصلاح کے کام میں لگ گیا۔ اس نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ ہماری تعلیمی زندگی میں وحدت اور مقصد کے یگانگت کی کس قدر کمی ہے۔ اس کے ساتھ پیسٹالوزی کے تعلیمی خیالات اور فطرت میں وحدت کے تصور سے اس کے خیالات کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس کی سب سے پہلی کوشش اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ اس نے ایک کسان کے جھونپڑے میں ۵ بچوں کو لے کر ایک تعلیمی ادارہ کھولا جس میں وہ ایک عرصہ تک پیسٹالوزی کی طرح اپنے خیالات کا تجربہ کرتا رہا لیکن پیسٹالوزی کی طرح اسے بھی صاحبان غرض کے ہاتھوں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اگرچہ اس کا ادارہ پیسٹالوزی کے تجربوں سے زیادہ مضبوط بنیادوں پر قایم تھا لیکن خود فروبل میں بھی عملی کاموں کی صلاحیت اسی قدر کم تھی۔

۱۸۲۶ء میں اس کی مشہور کتاب "انسان کی تعلیم" شایع ہوئی جس میں اس نے بچپن کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا۔ فروبل کو ہمیشہ سے چھوٹے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا اور اس نے جس قدر بچوں کے کھیل اور بیساختہ مشغلوں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اتنا اس سے پہلے کسی اور نے کبھی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۵ء میں حکومت کی طرف سے ایک انسپکٹر اس بات کے معائنہ کے لئے مقرر ہوا کہ اس ادارے میں کہاں تک انقلاب کی پرورش ہو رہی ہے۔ انسپکٹر جو خلاف رپورٹ دینے کے لئے آیا تھا، اس کی رپورٹ کا ایک حصہ اس ادارے کے بنیادی اصولوں کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"ذہن کی خود عملی اس ادارے کا سب سے پہلا اصول ہے، اس لئے یہاں جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے بچہ کا ذہن کسی مضبوط صندوق کی طرح نہیں بنتا جس میں ہر طرح کے اور مختلف قیمتوں اور شکلوں کے سکے جو آج کل مروج ہیں، سب بھر دیے جائیں، بلکہ تعلیم بتدریج مسلسل اور متواتر ــــــ لیکن ہمیشہ اندرونی طور پر، یعنی اس اصول کے مطابق جو انسانی ذہن کا خاصہ ہے ــــــ بغیر کسی داؤ پیچ کے آسان سے مشکل کی طرف، معروف سے غیر معروف کے ذریعہ ہوتی رہتی ہے اور وہ بچہ اور اس کی ضرورتوں کے اس قدر مناسب ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے

لکھنے کی طرف بھی اسی قدر شوق اور مستعدی سے بڑھتا ہے، جس قدر کہ کھیل کود کی طرف۔

آٹھ دس سال کے ناکام تجربوں کے بعد فروئبل کے خیالات نے ایک متعین شکل اختیار کرلی۔ شروع [illegible] اس نے بلیکن برگ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں وہ پہلا ادارہ کھولا۔ جسے وہ [illegible] نے کنڈر گارٹن کا نام دیا۔ اور پھر اپنی زندگی کے بقیہ دن اسی کے اصول اور طریقوں کی اشاعت میں صرف کئے۔ اور اسی کے ساتھ اس نے کثرت سے اس موضوع پر لکھنا بھی شروع کیا۔ لیکن بعد میں جرمن حکومت کو ان نئے اداروں میں انقلاب کی بُو آنے لگی اور اس نے انھیں سرے سے بند کر دیا۔

باوجود اس کے کہ فروئبل نے اپنے مجرد خیالات کو عملی شکل میں نہایت کامیابی سے پیش کیا، پھر بھی روسو کی طرح اکثر اس کے خیالات نہایت مبہم اور ناصاف ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کے خیالات فلسفیانہ ہوتے، لیکن ان میں اکثر عقل سے زیادہ جذبات کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس پر مزید یہ کہ ان خیالات کی حد اکثر جاکر تصوف اور مابعد الطبیعیات سے مل جاتی تھی، اس لئے ان کی وضاحت اور تشریح اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ فروئبل بڑا سخت مذہبی آدمی تھا، لیکن فلسفہ اور فطرت کی محبت نے اس کی مذہبیت میں وحدت کی بجائے کثرت کا رنگ پیدا کر دیا کہ اس کے خیالات میں ہر جگہ مثالیت نظر آنے لگی جو اس عہد کے فکر کے بالکل منافی تھا۔ اور اس سے نہ صرف فروئبل کے خیالات کو قبول عام حاصل ہونے میں دشواری ہوئی بلکہ اس کی بڑی حد تک مخالفت بھی ہونے لگی۔ پھر بھی آئندہ سطروں میں ہم اس کے بعض بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

قانون وحدت تعلیم کی اصل بنیاد :

فروئبل کے تعلیمی خیالات کی بنیاد فلسفہ پر ہے جس کا سلسلہ کانٹ اور ہیگل سے جاکر ملتا ہے۔ اس پوری فلسفیانہ تحریک کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اصل حقیقت اور اس کی عملی حیثیت زندگی اور وجود یعنی فطرت اور انسان دونوں کی بنیادی وحدت میں ہے۔ وہ ذات مطلق مادہ نہیں روح ہے۔ روح جو خود شعوری ہے اور اسی خود شعوری روح میں وجود یعنی انسان اور فطرت دونوں کے معنی

حد اصلیت پائے جاتے ہیں، اس سے وہ وحدت ملتی ہے جس نے فطرت اور زندگی کی ہمہ جہتی کی تشریح ممکن ہے، اس لئے کہ اصل فرق اس جامع حیثیت وجود کی وحدتوں میں ہے جو ان ظاہری تنوعات کو معنی بخشتا ہے۔ فروبل کے نزدیک یہ روحانی حقیقت تمام زندگی اور وجود کا سرچشمہ ہے اور یہی مقصد تعلیم کا ہر کردہ فرد کی زندگی کو اتنی وسعت دے کہ وہ اس ہمہ گیر روح میں شامل ہو کر اس وجود کو اپنے اندر سمو لے۔ یہی اندرونی تعلق تمام حقیقت کی اصل ہے، جو فرد کی زندگی میں تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ فروبل نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے:

"تمام اشیاء میں ایک ابدی قانون کی فرمانروائی ہے۔ یہ ہمہ گیر قانون مبنی ہے ایک ہمہ گیر، زندہ، باشعور اور دائمی وحدت پر۔ یہی وحدت خدا ہے۔ تمام چیزیں اسی وحدت الوہی یعنی خدا سے وجود میں آئی ہیں، اور ان سب کا اصل سرچشمہ وہی وحدت الوہی یعنی تنہا ذات خداوندی ہے۔ خدا ہی تمام چیزوں کا سرچشمہ ہے۔ تمام اشیاء میں اسی وحدت الوہی یعنی ذات خداوندی کی حکومت ہے۔ تمام اشیاء کی زندگی اور وجود اسی وحدت الوہی یعنی ذات خداوندی کے ذریعہ سے ہے۔ تمام کائنات اسی سرچشمہ الوہی کی بدولت رواں دواں ہیں۔ وہ سرچشمۂ الوہی جو ہر شے میں پایا جاتا ہے، وہی ہر شے کا جوہر ہے۔"

فروبل کے خیال کے مطابق ہر شے اور ہر فرد اس "ہمہ گیر شعوری وحدت" میں شریک ہے جو اس شے اور فرد کو معنی بخشتا ہے۔ اس وحدت کو پانا، اس اندرونی رشتہ کو نشوونما دینا، آفاقیت کے اس جذبہ کو جو ہر ایک فرد میں موجود ہوتا ہے، وسعت دینا اور اس "جوہر الوہی" کو ترقی دینا یہاں تک کہ فرد اپنے منتہا کو پہنچ جائے ــــ اسی کا نام تعلیم ہے۔ اس نے کہیں اور بھی یہ کہا ہے کہ "تمام اشیاء کی زندگی کا حاصل اور مقدر یہ ہے کہ وہ اپنے جوہر یعنی وجود الوہی کو کھولے۔" فروبل کی تمام تحریروں میں اسی قسم کا مذہبی جذبہ ملتا ہے۔ یہ کوئی خارجی شے نہیں ہے بلکہ یہ اس کے نظام کی اصل روح ہے۔ ہر شے اس روح میں شریک ہے اور اس حد تک وہ اسے پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس بنیاد پر فطرت کی ہر شے سے خدا کا جلوہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ تعلیم کا کام اس صلاحیت کو ابھارنا ہے کہ وہ جوہر اس ذات مطلق

[illegible] کے ساتھ مل کر ایک ہو جائے اس کا قول تھا کہ فطرت اور تمام موجودات اس جلوۂ الوہی کا مظہر ہیں۔ ہر وجود [illegible] عبارت ہے۔ تمام اشیاء کا وجود جوہر الوہی کی بدولت اور اس کے ذریعہ ہوتا ہے [illegible] نے بار بار اور مختلف طریقوں سے اس خیال کو پیش کیا ہے جو اس کے فلسفہ [illegible] ہم عقیدہ ہے۔ اس کا یہی عقیدہ اصل میں اس کا وہی قانون وحدت ہے جو اس کے تعلیمی نظریہ کا اہم ترین [illegible]

[illegible] اس نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" میں اپنے بنیادی خیالات اور اصول پیش کئے ہیں [illegible] اس نے اپنی دوسری کتاب "تعلیم نمو کے ذریعہ" میں بھی انھیں کی تشریح اور تفسیر بیان کی ہے۔ [illegible] اس نے اپنے اسی بنیادی خیال جسے وہ 'قانون وحدت' کہتا ہے اور جس کی اوپر کی سطروں [illegible]، اس کے مزید اسباب و وجوہ بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ ہم نمبروار ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

[illegible] اس قانون کے ذریعہ ہم صحیح طور پر بچہ کی فطرت کو سمجھ سکتے ہیں۔

[illegible] اس کے ذریعہ بچہ زندگی کے تمام رشتوں کی مرکزی کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔

[illegible] اس کے ذریعہ ہمیں تعلیم کا صحیح اور واضح مقصد ملتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مناسب ذرایع اور طریقہ حاصل ہوتا ہے۔

[illegible] جو تعلیم اس قانون پر مبنی ہو، وہ عملی ہوتی ہے، اس لئے یہ فوری تکمیل اور استعمال کی متقاضی ہوتی ہے۔

[illegible] ایسی تعلیم ایک ایسے عملی زمانہ کے لئے بہت موزوں ہے جو ان اعلیٰ ترین تصورات کو جو تجربہ سے مرتب ہوتے ہیں، زندگی میں مکمل ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔

[illegible] ایسی تعلیم زندگی کی ہر منزل میں اپنے آپ کو اس منزل کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔

[illegible] وحدت کی یہ تعلیم ایک ایسے زمانہ کے لئے خاص طور پر موزوں ہے، جو انتشار، اختلاف اور انفرادیت [illegible]

ایسی تعلیم اعلیٰ ترین فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات کو زندگی میں واضح اور حقیقت سے قریب کرے گی۔

۹۔ ایسی تعلیم صنعتی زمانہ کے میکانکی اور مردہ کن اثرات کو اور مزدوروں کی روز افزوں خرابیوں کو دور کرے گی، اس لیے کہ یہ بچہ کی طاقت کو ابھارتی، مضبوط بناتی اور ترقی دیتی ہے، تاآں کہ وہ ایک آزاد شخصیت پیدا کر سکے، اس لئے کہ یہ اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اس کے مزاج کے مطابق کس طرح برتاؤ کیا جائے، کام کو بہ حیثیت ایک تخلیقی عمل کے اونچا درجہ دیتی ہے اور خیال، ارادہ اور عمل کی قوتیں پیدا کرتی ہے اور اس طرح سیرت کی ایک صحیح بنیاد تیار کرتی ہے۔

وحدت کی اس حقیقت پر فروبل کو جو اعتقاد تھا، اسی کی بنیاد پر وہ یہ بھی مانتا تھا کہ فطرت بچہ کے سامنے خدا کا جلوہ پیش کرتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں ایک طرف جہاں مظاہر فطرت سے کام لینے اور مطالعہ فطرت پر اس قدر زور دیتا ہے، دوسری طرف اس معاد کے تمثالی طور سے پیش کرنے پر بھی اسی قدر اصرار کرتا ہے۔ اس نے نمو پذیر حیات میں بھی وحدت دیکھی اور اس بنیاد پر وہ نامی اشیاء میں ارتقاء کے نظریہ کا شروع ہی سے حامی تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس بات کا اور بھی قایل ہو گیا کہ بچہ کے لئے مطالعہ فطرت، نباتیات، حیاتیات وغیرہ کا علم بہت ضروری ہے۔ وہ اس بات کا بھی قایل تھا کہ وہی وحدت غیر نامی اشیاء میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی سے اسے بچہ کی زندگی اور اس کے خیالات میں اعلیٰ وحدت کا ایک ثبوت مل گیا۔ چنانچہ اس تصور کی بنیاد پر اس نے اپنے کنڈرگارٹن میں 'ہدایا' (Gaben G) کے نام سے کچھ مشغلے ایجاد کئے۔ اپنے ذاتی جذبہ کی بنا پر اسے تمام غیر نامی اشیاء میں حتیٰ کہ شیشہ کے ٹکڑوں میں بھی ایک عالمگیر وحدت نظر آتی تھی۔ ایک فرد اور اس کی نسل کے درمیان جو ایک واحد نامی زندگی ہے اور مدرسہ جس کا ایک چھوٹا نمونہ ہے، ایک اعلیٰ وحدت پائی جاتی ہے۔ اس طرح مدرسہ بچہ کے لئے ایک ایسا ادارہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنی سماجی زندگی کے تمام مظاہر ایک سادہ ترین اور اعلیٰ نمونہ کی شکل میں پاتا ہے۔ مدرسہ کا اصل کام بہ حیثیت ایک سماجی ترقی کے ادارے کے اور ساتھ ہی ساتھ ایک انفرادی ترقی کے ادارے کے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک فرد کی زندگی میں بھی وہی وحدت ہے جو شیرخوارگی، بچپن اور جوانی کی ہر منزل میں پائی جاتی ہے اور جسے [illegible] روزمرہ کے کاموں میں نہ پاکر تعلیم کو محض ایک رسمی اور ظاہری فعل بنادیتا ہے۔ فروئبل نے اس [illegible] کو بہت اچھی طرح سمجھا تھا اور اسی کے ساتھ اس نے مختلف مضامین کے درمیان بھی ایک ایسا [illegible] کی بنیاد پر اس نے مدرسہ کے سارے نصاب کی دوبارہ تنظیم ضروری سمجھی۔ [illegible] نظریۂ باربط مضامین' کے تصور کی اس کے پیروؤں نے بڑی حمایت کی۔ اسی طرح اندرونی تعلق کے اس قانون سے جو دوسرے لفظوں میں معروضی اور موضوعی باہمی وحدت کا نام ہے ذہنی نمو کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جو علم، ادراک اور دوسرے مشاغل کی وحدت پر زور دیتا ہے۔ اسی قدر اہم اور بنیادی ہے جس قدر اس کے اور دوسرے تصورات، اگرچہ فروئبل نے انھیں کوئی نفسیاتی شکل نہیں دی، پھر بھی وہ آج کل کے ذہنی نشوونما اور ترقی کے تصورات سے بہت قریب ہے، جس کی بنیاد پر جدید نفسیات کی عمارت قایم ہے۔

غرض ہر نقطہ پر فروئبل نے خیال اور زندگی میں ایک وحدت دیکھی، جس کی تعلیم کے ذریعہ اور نشوونما دینی ہے۔ اس طرح تعلیم کا کام فرد کا اعلیٰ زندگی کے ساتھ ایک مطابقت پیدا کرنا ہوجاتا ہے جو اصل میں اس کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور جس میں اسے اپنے وجود اور اپنی ذات کو پانا چاہیئے۔

نمو تعلیم کے ایک عمل کی حیثیت سے:

وحدت کے فلسفیانہ تصور کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ تمام اشیاء کی نسل کا تسلسل بھی مانا جائے۔ روسو کے زمانہ میں انفرادیت کا جو تصور رایج تھا، اس کی بجائے نامی وحدت اور ترقی کا تصور پیدا ہوا۔ فلسفہ کے نقطۂ نظر سے حقیقت اب روحانی بن جاتی ہے، یعنی ذہن ایک مجرد اور خودمختار حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ خودمختاریت نہ صرف اشیاء کا وجود یا اصل سمجھی جاتی ہے بلکہ اس عمل کے متعلق بھی جس سے اظہار کی دنیا قایم رہتی ہے۔ اس عمل کا سائنٹفک نام انگلستان کے سائنسداں [illegible] نامی ارتقار کا نظریہ رکھا۔ فروئبل نے اسی خیال کو لے لیا اور اسے تعلیم میں استعمال کیا۔ یہ نہ صرف [illegible] کے نظری بیانات میں دکھائی دیتا ہے جو تعلیم کی نوعیت اور عمل سے اس نے ظاہر کئے ہیں، بلکہ

ہدایا (G[illegible]) اور جماعت کے اندر ان مقررہ مشغلوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اس نے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے تجویز کئے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کے اندر بنیادی تصور یہی ہے کہ ہر بعد کے آنے والے عمل میں اس سے پہلے گزر جانے والا عمل شامل ہے۔ اس کی مختلف تحریروں میں اس قسم کے بیانات ملتے ہیں کہ ہر شے جو بعد میں آنے والی ہے، وہ اس سے نکلے گی جو اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ اس قسم کے بیانات میں گویا ایک سرّی یا مخفی معنی ہیں جو عام پڑھنے والے کی نظر سے پوشیدہ سمجھے جاتے ہیں۔

اس نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" میں عام فلسفیانہ خیالات ایک خاص مذہبی انداز میں ظاہر کئے ہیں، مثلاً خدا غیر منقطع تسلسل کے ساتھ تخلیق کرتا ہے اور پیدا کرتا ہے۔ خدا کا ہر خیال ایک کام ہے، ایک [illegible]، ایک پیداوار ہے اور خدا کا ہر خیال اس تخلیقی قوت کے ساتھ ابدالاباد تک لامتناہی پیدائشی عمل میں جاری رہتا ہے۔ ارتقا اس وحدت یعنی روح کا میلان ہے جو مختلف شکلوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح تعلیم اس ارتقا کے عام عمل کا صرف ایک پہلو ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے فرد اس ہمہ گیر وحدت کو پالیتا ہے جس کا وہ صرف ایک جزو ہے۔ وہ عمل جس سے اس کی زندگی میں ایسی وسعت پیدا ہوتی ہے جو اسے فطرت کے ساتھ ملا دیتی ہے، یہاں تک کہ یہ سماج کے تمام مشغلوں میں ہمدردی کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے اور نسل انسانی کے تمام کارناموں اور انسانیت کی تمام آرزوؤں کی شریک بن جاتی ہے۔

فروبل نے یہ خیالات تمام تر ایک مجرد فلسفیانہ انداز میں ظاہر کئے ہیں اور انھیں کبھی منطقی ترتیب کے ساتھ پیش نہیں کئے۔ اسی کے ساتھ اس نے بچوں کے لئے کچھ مشغلے اور مشقیں بھی مرتب کی ہیں، جو "ہدایا اور مشغلوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا منشا رجحی یہی ہے کہ ایک اچھے، باہنر استاد کے ہاتھوں بچہ میں ذہنی متحدہ نشوونما پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہدایا اور مشغلے نہ صرف استاد اور بچوں کے استفادہ کے لئے ہیں بلکہ جو لوگ فروبل کے فلسفہ کے سمجھنے والے ہیں، وہ ان میں کہیں گہرے معنی پائیں گے، اس لئے کہ یہ نہایت فلسفیانہ دقت نظر کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، جس سے

کم سے کم بچہ کے ذہن اور روح کی نشوونما میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی خیال میں رکھنی چاہیے کہ یہ نشوونما صرف ان مشغلوں کے استعمال پر موقوف نہیں ہے جو استاد تجویز کرتا ہو بلکہ استاد کی ذات پر مبنی ہے جو زندگی اور حقیقت میں وحدت کو دیکھتا ہے اور خود بچہ کے ذہن پر کہ اس کے اندر یہ وحدت کا جذبہ اور شعور کہاں تک پایا جاتا ہے۔ فروبل کے خیال کے مطابق "ان ہدایا اور مشغلوں" کا استعمال صرف بچہ کو اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کرنے یا اسے اس کا علم دینے یا اس سے وابستہ کرنے کے لئے اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کرتا ہے بلکہ یہ "ہدایا اور مشغلے" اور حقیقت میں مدرسہ کا کوئی مشغلہ بھی ہو، جب تک وہ وحدت کے اس اصول اور نشوونما کے اس طریقے کے مطابق استعمال نہ کئے جائیں، اس وقت تک ان کی صحیح تعلیمی قدریں حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ یہ قدریں خود فروبل کے لفظوں میں اس وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب "وہ حقیقت جو کل میں ہے، اس کے چھوٹے سے چھوٹے جزو میں پایا جائے۔ اسی طرح جو حقیقت بہ حیثیت مجموعی انسانیت میں ہے، اس کا اظہار معمولی سے معمولی انسان یا چھوٹے سے چھوٹے بچہ میں بھی ہونا چاہئے اور مزید یہ کہ جو حقیقت بہ حیثیت مجموعی انسانیت کے اندر ہے اس کا اظہار بچہ کے اندر بھی ہوتا ہے اور وہ بچہ کے اندر بہ طور روح اور جراثیم کے مخفی ہوتی ہے، وہ پھر اپنی نوعیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے، یقیناً وہ ایک صاف چشم باطن کو نظر بھی آسکتا ہے۔"

خود عملی تعلیم کے عمل کی حیثیت سے:

فروبل نے تعلیم کے عمل کو خود عملی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ اصول انیسویں صدی کے اوائل حصہ کے افکار و خیالات سے اخذ کیا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ خیالات جو فلسفہ اور سائنس میں یکساں طور پر کارفرما تھے، اس نے سب سے پہلی بار ان سے تعلیم کے مسائل کے حل کرنے میں کام لیا ہے۔ سائنس کے میدان میں یہ قدیم خیال کہ تعلیم جاندار مخلوق بندھے ٹکے نوع میں منقسم ہے، اس کی بجائے یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ تمام مخلوقات ادنیٰ شکل سے ارتقاء پاکر اعلیٰ شکل میں آئی ہیں اور اس طرح تمام انواع میں تسلسل کا ایک رشتہ قایم ہے

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس صدی کے شروع میں ایک نیا علم وجود میں آیا جسے 'حیاتیات' یا 'بایولوجی' کہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں فرانس کے ایک مشہور فلسفی لامارک نے بھی اپنے خیالات ان عوامل کے متعلق ظاہر کئے ہیں جہاں ادنیٰ شکلوں سے اعلیٰ شکلوں کی نشوونما میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح اس نے ان اصولوں میں۔ کم سے کم ایک اصول کی وضاحت کر دی ہے جو حیات کی تمام شکلوں کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے۔ یہ جسم کے کسی حصہ یا عضو کے استعمال یا عدم استعمال سے متعلق ہے جو خود عمل کے اصول کی کارفرمائی پر منحصر ہے۔ اس سے پہلے ارتقار کا مسئلہ ایسے سائینسدانوں اور فلسفیوں نے پیش کیا تھا جو خارجی موثرات پر اعتقاد رکھتے تھے۔ لامارک کے نزدیک ان تبدیلیوں کا باعث وہ جاندار مخلوق اور وہ جسم نامی خود ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کے بازو یا جسم کے کسی اور حصہ کی ان کے مخصوص استعمال سے مخصوص نشوونما ہوتی ہے، اسی طرح ایک جسم نامی کے اپنے کسی حصہ کی ایک مخصوص جانب استعمال سے اس قسم کی نشوونما ظہور پذیر ہوگی۔ اسی طرح اس کے عدم استعمال سے اس میں لاغری اور دبلاپن پیدا ہوگا۔ یہ نظریہ آج مختلف شکلوں کی وضاحت میں خواہ کتنا ہی ناقص اور نباتات کی دنیا میں کتنا ہی محدود نظر آتا ہو لیکن اس زمانہ میں مختلف شکلوں کی اصل وجہ اور ان کی نمو پذیری کے اصول کی حیثیت سے بہت بڑا انکشاف سمجھا جاتا تھا۔ فلسفیانہ افکار میں نظریہ کا یہ نقص کچھ بہت اہمیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے کسی حصہ جسم کا ایک جانب استعمال اصول عمل کا ایک پہلو تھا جس سے وہ جسم نامی اس ہمہ گیر عمل میں حصہ لیتا تھا جو تمام مادی وجود کو معنی بخشتا ہے۔ اس وقت کا سب سے غالب فلسفیانہ نظریہ تھا جو خود فروبل نے بھی قبول کر لیا تھا کہ تمام اشیا میں ایک بنیادی وحدت ہے اور تمام تبدیلیوں اور حیات کی تمام شکلوں کا ایک ہی اصول ہے۔ تمام موجودات میں ایک واحد تعمیری قوت ہے جو خود کو فطرت یعنی خارجی زندگی میں بہ حیثیت ایک قوت کے اور اندرونی زندگی میں بہ حیثیت ایک ذہن کے جلوہ گر کرتی ہے۔ یہ طاقت ایک فرد میں ذہن کی حیثیت سے اپنے لئے اپنی دنیا آپ تعمیر کرتی ہے۔ خود ذات یعنی ذہن میں بہ عمل موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ بذات خود عمل ہوتا ہے۔ اس عمل کے ذریعہ یہ خود اپنی تکمیل کرتا ہے، اپنی دنیا آپ تعمیر کرتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کا شعور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔

(باقی)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مترجم: عماد الحسن آزاد فاروقی

قرآن سے متعلق جرمنوں کی خدمات

[illegible]لوم کی خدمت اور ان کی آبیاری میں جرمنوں کا مقام جانا پہچانا ہے۔ اسی طرح علوم قرآن [illegible] کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے، بلکہ پچھلی صدی میں تو اس سلسلہ میں دوسرے اہل مغرب کے مقابلے میں انہیں ایک امتیاز حاصل رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں قرآن کی پہلی طباعت ۱۵۳۰ء میں پاگانینی کی توجہ سے بندقیہ کے شہر میں ہوئی لیکن پوپ الیکساندر ہفتم بہت ناراض ہوا اور تمام نسخے [illegible] دینے کا حکم دیا۔ بہرحال جرمنی کا چھپا ہوا سب سے قدیم نسخہ جو ہم تک پہنچا ہے وہ ابراہم ہنکلمان کا ۱۶۹۴ء کا ہے۔ یہ ہیمبرگ میں جو شمالی جرمنی کا ایک شہر ہے، چھپا تھا۔

قرآن کے حوالوں کی ضرورت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ تخریج آیات کی کتابیں قدیم زمانے سے [illegible] ملتی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان مؤلفین نے پاروں اور رکوعات کی طرف اشارہ کر دیا ہے [illegible] تلاش کرنے والے کو تقریباً آدھا صفحہ یا کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ اس میں قطعیت [illegible] کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر حوالے میں آیت دی جائے تو بہت زیادہ آسانی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آیتیں عام طور سے ایک سطر یا دو سطر سے زیادہ نہیں ہوتیں۔

[illegible] فلوگل نے سب سے پہلے تمام آیات کی ابجد کے اعتبار سے فہرست بنائی اور اس کے اشارے سورتوں اور آیتوں پر نمبر ڈال کر دئے بلکہ ۱۸۳۴ء میں لائپزک میں اس نے ایک قرآن بھی طبع کرایا جس میں ہر آیت پر نمبر دئے گئے تھے۔ اہل مغرب جب کوئی دلیل قرآن سے دیتے ہیں تو عام طور سے سورتوں اور آیتوں کا ذکر فلوگل صاحب ہی کے نمبروں کے حساب سے دیتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ

اپنی اپنی زبانوں کے تراجم میں بھی انھوں نے انھیں نمبروں کو استعمال کیا ہے۔ مگر قابل افسوس امر یہ ہے کہ فلوگل صاحب کو مسلمانوں کی آیات شماری کے طریقے کا علم نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے کہیں تو صحیح کیا اور کہیں غلطی بھی کی۔ بعد میں مسلمانوں نے مصر اور مختلف جگہوں پر ایسے قرآن چھاپے جس میں فلوگل صاحب کے نمبروں سے مختلف نمبر ڈالے اور کہیں کہیں تو ان کا فرق چھ چھ آیتوں تک کا ہو جاتا ہے اسی لئے اہل علم اب دونوں نمبروں کا ساتھ ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال کچھ بھی ہو پہل کرنے والے کو امتیاز حاصل ہوتا ہے اور یہ فضیلت اس جرمن یعنی فلوگل صاحب ہی کی ہے۔

علوم قرآن مثلاً اس کی تدوین کی تاریخ یا اس کی قراءتوں کے اختلاف پر مسلمانوں نے تو شروع زمانے ہی سے توجہ دی۔ ہاں یورپ میں جرمنوں نے سب سے پہلے اس کا خیال کیا۔ میری مراد تھیوڈور نولڈکے کی "تاریخ القرآن" سے ہے، جو لایپزک میں ۱۸۶۰ء میں چھپی۔ اس کے ایک عیسائی شاگرد شوالی نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طرف توجہ دی اور پہلی جلد ۱۹۰۹ء میں اور دوسری ۱۹۱۹ء میں چھاپی۔ پھر دو جرمنوں برگشترلیسر اور برتیسل نے اس میں مزید اضافے کر کے ۱۹۳۸ء میں تیسرا ایڈیشن چھاپا یہ سب کے سب ایڈیشن لایپزک میں ہی چھپے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے اور ہر تحقیق کرنے والے کو اس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے گو ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اس سے اتفاق ہی کرے۔

جنوبی جرمنی میں میونخ یونیورسٹی میں خاص قرآنی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کچھ امریکن بم اس پر گرے اور جو کچھ کام وہاں ہوا تھا وہ اور تمام عملہ سب تباہ ہو گئے۔ پھر بھی وہ قابل ذکر ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کسی اسلامی ملک کو توفیق دے کہ وہ اس جیسا کوئی ادارہ قائم کر سکے۔ برگشترلیسر اور ان کے بعد برتیسل نے اس ادارہ کی تنظیم میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ حکومت اور یونیورسٹی دونوں نے اس کی نشوونما اور ترقی پر بہت روپیہ خرچ کیا، یہاں تک کہ وہ ادارہ دنیا بھر میں قرآن کا سب سے بڑا میوزیم بن گیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے

[illegible] ذیل کام کئے۔

۱۔ تفسیر، قرارت اور دوسرے علوم قرآن پر جتنی اہم کتابیں، خاص طور پر عربی میں، چھپی [illegible] سب انھوں نے جمع کیں۔

۲۔ مندرجہ بالا موضوعات پر جو کتابیں اب تک نہیں چھپی ہیں ساری دنیا سے ان کے [illegible]

۳۔ ہر زمانے کے قرآن کے نسخوں کے عکس جمع کئے۔ اس کے لئے انھوں نے دنیا کے کونے کونے، اسلامی اور غیر اسلامی شہروں کا سفر کیا اور جو کچھ بھی نسخے انھیں مل سکے یہاں تک ایک پارہ یا صفحہ بھی اگر ملے تو اسے جمع کیا۔ اس طرح ان کے پاس پہلی صدی ہجری سے لے کر موجودہ زمانے تک کے مختلف نسخے جمع ہو گئے، ان کی پہلی غرض تو یہی تھی کہ وہ ان نسخوں کا باہم مقابلہ کریں اور اگر کچھ غلطیاں ہوں تو ان کو جمع کریں۔ (مگر سوائے کتابت کی غلطی کے اور کوئی غلطی انھیں نہیں ملی) لیکن ان نسخوں کے حاصل کر لینے سے ان کے پاس وہ سب کچھ جمع ہو گیا جس کے ذریعہ ایک مورخ عربی رسم الخط، تزئین وتجلید قرآن وغیرہ علوم کی تاریخ لکھ سکتا ہے۔

۴۔ انھوں نے قرآن کی ایک طویل ترین تفسیر شروع کی۔ اس طرح کہ ہر آیت کا الگ باب بنایا اس میں انھوں نے صحابہ کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک کے ہر مفسر کی اس آیت سے متعلق تفسیر درج کی اس کی ترتیب انھوں نے مفسر کے زمانے کے لحاظ سے رکھی۔ اس طرح ہمارے لئے ممکن ہو گیا تھا کہ ہم ہر آیت اور ہر کلمہ کی تفسیر کی نشوونما سے واقف ہو سکیں۔ ابھی یہ کام جاری ہی تھا کہ جو کچھ انھوں نے مکمل کیا تھا سب ضائع ہو گیا۔ اب ممکن ہے کہ کوئی اس کام کو دوبارہ شروع کرے اور اگر وہ چاہے تو اسے بغیر عربی تفسیر کا بھروسہ کئے ہوئے بھی کر سکتا ہے کیونکہ علماء اسلام نے قرآن کی تفسیریں اپنے اپنے یہاں کی زبانوں مثلاً فارسی، ترکی، [illegible] وغیرہ میں کی ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عجمی حضرات اس شعبۂ علم میں عربوں سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں۔

[illegible] کی خوش قسمتی سے وہ مخطوطات اب بھی محفوظ ہیں۔ اگرچہ میونخ یونیورسٹی میں ان کے عکس ضائع ہو گئے تھے اور ممکن ہے کوئی صاحب ظرف جس کے پاس مال اور شوق اکٹھا ہو گئے ہوں اس کام کو ویسا ہی بلکہ کچھ اضافے کے ساتھ کر ڈالے۔

[illegible]تاریخ قرآن:

ساری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یقیناً قرآن ہی ہے۔ سبھی مسلمان چاہے وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اس کی تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اسے پڑھتے ہیں۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اپنے معاملات میں اپنی دینی کتاب سے مدد لی ہو تاکہ اس کی پوری پوری حفاظت کر سکیں اور یہی سبب ہے کہ ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ مسلمان قرآن کو انسان کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ اس کو خدا کا کلام جانتے ہیں جو کہ اُن کے پیغمبر محمدؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ پورا قرآن ایک دم نہیں نازل ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال کے عرصہ میں اُترا۔ اُس وقت عرب میں کسی قسم کا نشر و اشاعت کا سامان نہیں تھا، یہاں تک کہ لکھنا پڑھنا بھی عجوبہ چیزیں تھیں، مورخوں کا بیان ہے کہ مکہ میں جو نبیؐ کا مولد ہے صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے جبکہ اس وقت مکہ کی آبادی تقریباً دس ہزار تھی، مزید یہ کہ حضورؐ خود بھی امی تھے اور لکھنے پڑھنے سے واقف نہیں تھے جیسا کہ خود قرآن اس کی صراحت کرتا ہے۔ غرض کہ جو بات ایک محقق کو حیرت میں ڈال دیتی ہے وہ یہ ہے کہ آں نبیؐ امیؐ نے شروع ہی سے جو وحی ان کے پاس آتی تھی اُس کی حفاظت کی طرف توجہ دی۔ پس جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان میں جو لکھنا جانتا تھا اُسے بلوا کر جو کچھ ان پر نازل ہوتا تھا لکھوا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان کی نقلیں کر کے امت کے درمیان پھیلا دیتے تھے۔ پھر دوسری وحی آتی تھی تو حضورؐ لکھوانے کے ساتھ ساتھ پچھلے نسخوں کے درمیان اس کا محل وقوع بھی بتا دیتے تھے (اس طرح قرآن برخلاف ترتیب نزول کے، جس حساب سے سورتیں درج کی گئیں، اس اعتبار سے مدوّن کیا گیا ہے) یہ سلسلہ

حضورؐ کی وفات تک چلتا رہا ۔۔۔۔۔ [illegible] ایک پہلو تھا

دوسرا رخ یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ قرآن حفظ کرتے رہیں نیز نماز بھی بغیر اس کے کہ تھوڑا سا قرآن پڑھا جائے درست نہیں ہو سکتی ۔ باوجود اس کے کہ قرآن کا حجم توریت اور انجیل کے [illegible] سے زیادہ ہے قرآن حفظ کیا جاتا رہا ہے اور حفظ کے ذریعہ لکھے ہوئے قرآن کی [illegible] کے ذریعہ حفظ کی تصحیح ہوتی رہی ہے ۔

[illegible] یہ ہے کہ حضورؐ نے لوگوں کو صرف اپنے اپنے لکھے ہوئے قرآن پر ہی تکیہ کر لینے کو نہیں کہا بلکہ ضروری قرار دیا کہ وہ اسے شروع سے آخر تک حضورؐ کے پاس پڑھیں یا کسی ایسے شخص کے پاس پڑھیں جس نے حضورؐ سے پڑھا ہو، اسی طرح ہر زمانے میں ہوتا رہا اور آج تک مسلمانوں کے بچے قرآن کو کسی مستند استاد کے پاس پڑھتے ہیں اور وہ ان کے فارغ ہونے کے بعد سند دیتا ہے اور اس میں ذکر کرتا ہے کہ جو قرآن اس بچے نے پڑھا ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اُن استاد نے اپنے استاد اور پھر ان کے استاد نے اپنے استاد سے پڑھا تھا ۔ اس طرح تمام اُستادوں کا ذکر کرتا ہے یہاں تک کہ نبیؐ تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا ہے ۔

غرض حضورؐ کے زمانے سے ہمارے زمانے تک قرآن کی حفاظت کے تین طریقے چلتے رہے ۔ اس وقت سارے عالم میں سینکڑوں ہزاروں حافظ ہیں جن کو پورا قرآن یاد ہے ۔ ترکی میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار حفاظ ہیں ۔ ان کی تعداد عربی ممالک میں یقیناً اور زیادہ ہوگی ۔

حضورؐ کی زندگی میں تو قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا ہی رہا لیکن حضورؐ کی وفات کے قریب اس کو کتاب کی صورت میں مدوّن کیا گیا اس لئے حضورؐ کے زمانے کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملتا ۔

مسلمانوں میں اس وقت تاریخ لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لئے اوّلین نسخوں کے بارے میں تحقیق سے کچھ نہیں معلوم ہو سکتا ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ استنبول کی توپ قاپی سرائے میں [illegible] چھوٹی سورتوں پر مشتمل موجود ہے وہ حضورؐ کے زمانے کا ہے کیونکہ اس کے آخر [illegible] کو عثمانؓ ابن عفان کاتب وحی نے لکھا ہے ۔ خود کتب خانہ میں قرآن کے بعض

اوراق پائے جاتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہیں۔ جس کے حروف کثرت استعمال سے مٹ گئے تھے قرآن کو دوبارہ لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ اوراق یا کچھ چھوٹے چھوٹے اجزا ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہیں اس کے علاوہ خدیجہ بن معوفتہ بن سالتہ الانصاری کا ۳۲ھ کا اور عقبہ بن عامر کا ۵۲ھ کا نسخہ بھی ملتا ہے۔ استنبول کے اسلامی میوزیم میں حضرت علی کے ہاتھ کا بھی ایک ورق ملتا ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک ورق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خط میں ہے جس پر مغل بادشاہوں کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرح تاشقند میں بھی ایک نسخہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہے روسی حکومت نے کیمونسٹ انقلاب سے پہلے اس کا عکس لے کر چھپوایا تھا۔

فنون لطیفہ اور قرآن:

قرآن بہت سے فنون لطیفہ کے آغاز کا باعث ہوا ہے۔ مثلاً تجوید سے تلاوت قرآن جو اسلام کی دینی موسیقی ہے۔ گو وہ ایسی چیز ہے کہ صرف سنی ہی جا سکتی ہے۔ قرآن ہی کی کتابت نے عربی رسم الخط کو واضح شکل دی، اس کے علاوہ قرآن کو مختلف رنگوں میں لکھنا اس کی آرائش کرنا اور مختلف اقسام کی جلدوں کا بنانا وغیرہ اسلامی فنون لطیفہ بھی اسی سے شروع ہوئے۔ ہم اس بحث کو یہ کہہ کر ختم کر رہے ہیں کہ جرمنوں کا ان سب علوم میں بھی بہت حصہ ہے۔

تراجم قرآن:

مختلف اقوام کے درمیان زبانوں کا بہت اختلاف ہے، ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتا اور قرآن تو تمام عالم کے لئے اترا تھا۔ اس لیے قرآن کا ترجمہ فہم وعمل کے لئے ضروری ہو گیا (یہاں نماز میں ترجمہ کی تلاوت کا سوال نہیں ہے) اور سب سے پہلا ترجمہ ایک صحابی ہی کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ فقیہ الکبیر شمس الائمہ سرخسیؒ نے (مبسوط جلد اول صفحہ ۳۷) لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کے پاس لکھا کہ وہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ فارسی میں لکھ دیں، چنانچہ ایران اس فارسی ترجمہ کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ اس

[illegible] کی زبانیں نرم پڑ گئیں — فرید وجدی مرحوم نے تحقیق کی ہے
[illegible] جواز ترجمۃ القرآن الی اللغات الاجنبیہ صفحہ ۵۸) کہ سلمان فارسیؓ نے یہ کام نبیؐ کی اجازت [illegible]
[illegible] البدایہ والنہایہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ میرے علم میں نہیں کہ یہ کس کی [illegible]
[illegible] والنہایہ ابن کثیر کی ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے)
[illegible] شہریار نے عجائب الہند صفحہ ۲-۳ میں ذکر کیا ہے کہ علماء ہند نے دین کی تبلیغ کے لئے ۲۷۰ھ سے بھی پہلے قرآن کا ترجمہ کر لیا تھا اور شاید یہ ترجمہ سندھی یا ملتانی زبان میں تھا۔

جاحظ نے البیان والتبیین میں (جلد اول صفحہ ۳۶۹) لکھا ہے کہ موسیٰ بن سیار الاسواری متوفی ۲۵۵ھ قرآن کی تفسیر فارسی میں پڑھایا کرتے تھے۔ ہم تک علماء ماوراء النہر کا ۳۴۵ھ کا ترجمہ پہنچا ہے [illegible] نے ملک منصور بن نوح سامانی کے لئے کیا ہے اور ترجمہ میں طبری متوفی ۳۱۰ھ کی تفسیر کا خلاصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس شکل میں قرآن کا ترجمہ و تفسیر تین زبانوں یعنی فارسی، مشرقی ترکی اور مغربی ترکی میں ملتا ہے۔ یہ سب نسخے بحمد اللہ ہم تک مخطوطات کی شکل میں پہنچ گئے ہیں اور سب کے سب مسلمانوں کے ترجمہ شدہ ہیں۔

غیر مسلموں میں سُریانی سب سے پہلے ہیں جنھوں نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ کیونکہ ایک کتاب ایسی ملتی ہے جس میں کہ قرآن کی آیات کا سریانی میں ترجمہ ہے۔ یہ مخطوطہ چمڑے کے اوپر ہے اور مانچسٹر کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ منگانہ صاحب نے تحقیق کی ہے کہ یہ مخطوطہ بار صلیبی کا ہے جو کہ حجاج بن یوسف کا ہمعصر تھا یعنی یہ پہلی صدی ہجری کے آخر کا ہے۔ اس کے بعد اہل یورپ نے اندلس میں اس پر توجہ دی اور سنہ ۱۱۴۱-۱۱۴۳ء میں روبرتوس کیتیننسیس انگریز نے قرآن کو لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد تو مسلم اور غیر مسلم علماء اس کو تمام زبانوں میں ترجمہ کرتے رہے۔

[illegible] ۱۳۶۴ھ میں ایک کتاب "القرآن فی کل لسان" چھاپی ہے جو کہ دو امور پر حاوی ہے یعنی میری معلومات کی حد تک تمام زبانوں میں مکمل یا غیر مکمل تراجم کی فہرست اور نمونے کے لئے ہر زبان میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ، پھر میں نے ۱۳۶۵ھ اور ۱۳۶۶ھ میں اس کے مزید دو ایڈیشن

چھاپے، اس طرح پہلی طباعت میں صرف ۲۳ زبانوں کی تعیین ہوئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن میں ۴۳ زبانیں تھیں تیسرے میں ۶۷ زبانیں تھیں اور اگر اب مجھے چوتھے ایڈیشن کے چھاپنے کے اسباب مہیا ہو جائیں تو میرے پاس سو سے زیادہ زبانوں کا مواد موجود ہے، اور جہاں تک یاد پڑتا ہے ان میں سے ہر زبان میں ایک سے زیادہ ترجمے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو میں سو سے زائد ترجمے ہیں۔ ترکی تراجم، خط اویغوری، خط عربی اور خط لاطینی میں پائے جاتے ہیں۔ ترکی نیز فارسی دونوں میں پچاس پچاس ترجموں سے زیادہ ہیں۔ نیز روسی ترک اپنی زبان روسی رسم الخط میں ہی لکھتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ کمیونسٹ علاقوں میں وہ قرآن کا ترجمہ نہیں کر سکے۔ جہاں تک یورپ کی دوسری زبانوں کا تعلق ہے میری معلومات کی حد تک ہسپانوی جو کہ عربی رسم الخط میں خمیادو کہلاتی ہے اور لتوانیہ اور یوگوسلافیہ کی زبانوں میں تراجم پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں مجھے فرانسیسی میں قرآن کے ترجمے کی سعادت حاصل ہوئی تو اس کا پہلا اڈیشن تقریباً بارہ ہزار نسخوں کا دو ہفتوں میں ختم ہو گیا پھر اسی سال دوسرا ایڈیشن تقریباً پندرہ ہزار کا سال بھر سے کم عرصے میں ختم ہو گیا اور جس وقت کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس ترجمہ میں تاریخ تدوین قرآن اور اس کی حفاظت کے اوپر ایک مقدمہ نیز یورپ کی مختلف زبانوں میں تراجم کی ایک فہرست شامل ہے۔ ذیل میں اس فہرست کا خلاصہ پیش ہے:

۱۔ [illegible]			۱
۲۔ اسوجیۃ			۶
۳۔ افریقیانیہ	(ولندیزی لہجہ میں)	خط عربی میں	۲
		خط لاطینی میں	۳
۴۔ البانوی			۲
۵۔ خمیادو	(ہسپانوی خط عربی میں)		۴۵
۶۔ جرمن			۴۳
۷۔ انگلش			۵۷

۹۔ یوکرینی

یوگوسلاوی (خط عربی میں) [illegible]

(") خط روسی میں [illegible]

خط لاطینی میں [illegible]

[illegible] (خط عربی میں) [illegible]

(خط لاطینی میں) [illegible]

۱۴۔ بوہیمین [illegible]

۱۵۔ [illegible] (خط لاطینی میں) ۲۳

(خط اویغوری قدیم میں) ۴

(خط عربی میں، ڈاکٹر احمد آتش کی فہرست کے مطابق) تقریباً ۶۰

۱۶۔ ڈنمارک کی زبان میں	۳	۱۷۔ روسی	۱۱
[illegible]۔ رومانوی	۱	۱۹۔ اطالوی	[illegible]
[illegible]	۳۴	۲۱۔ فن لینڈ کی زبان میں	۱
[illegible]	۴۲	۲۳۔ ہنگیرین	[illegible]
[illegible]	۱	۲۵۔ ولندیزی	[illegible]
[illegible]۔ ہسپانوی (خط لاطینی میں)	۱۸	۲۷۔ یونانی	[illegible]

مالک رام

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات

آج ۲۲ فروری ہے۔ دس سال ہوئے، آج ہی کے دن ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ہوئی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مولانا ابوالکلام آزاد کے سے آدمی مر بھی سکتے ہیں ؟!

انسان فانی ہے، اس کلیے سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ مادی جسم اس شکل میں قائم رہنے والا نہیں ہے، یہ ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گا، اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض انسان مر جانے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ملک کی تاریخ کے صفحات پر ان کے کارناموں کے نقش اتنے نمایاں اور پختہ و پائدار ہوتے ہیں کہ وہ زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں ؟ حالات کی تبدیلی، انداز و معیار کا تفاوت ان کی شہرت میں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی جن کی ہم آج دسویں برسی منا رہے ہیں، ایسے ہی شخص تھے کہ جسمانی موت کے باوجود وہ آج تک زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ان کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ اس سے متعلق اس مختصر صحبت میں کوئی تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ عالم تھے، مفسر قرآن تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، صحافی تھے، سیاسی رہنما تھے، جنگ آزادی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی ——— اور ان سب کے علاوہ وہ بلند مرتبہ انسان تھے، ان کی ہر ایک حیثیت پر مفصل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

وہ ایک پرانے علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہیں

... جب انھوں نے ۱۹۰۱ء میں اپنی تعلیم مکمل کر لی اور یہ تعلیم ... فارسی اور عربی کا وہی درسِ نظامی جو تقریباً ایک صدی سے ... انھیں بھی پڑھنا پڑا۔

لیکن ابھی وہ تعلیم کی منزل طے بھی نہیں کر پائے تھے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں انھیں شعر گوئی ... میں انھوں نے بعض مشہور اساتذۂ وقت: داغ دہلوی، اور امیر مینائی اور ... سے مشورہ کیا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی؛ بعض اور شاعر بھی اتنی کمسنی ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دل میں اس عمر میں خیال پیدا ہوا کہ شعر گوئی کی تکمیل کے لیے ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ... جب ان کی عمر محض گیارہ سال کی تھی، نیرنگ عالم کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ جاری کیا جس میں مشاہیر شعراء کا کلام چھپتا رہا۔ یہ پرچہ ایک سال کے اندر اندر بند ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے المصباح شروع کیا، یہ بھی زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ اس دوران میں ان کا بعض اور پرچوں سے بھی تعلق رہا۔ بالآخر ان کا مشہور رسالہ لسان الصدق منظرِ عام پر آیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ دراصل یہی پرچہ ان کی عام شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوا اور اسی سے وہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں عام طور پر متعارف ہوئے۔ یہ بھی کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ امرتسر کے مشہور اخبار وکیل میں بحیثیت مدیر کام کرتے رہے۔ اس میں کسی طرح کا شبہہ نہیں کہ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے؛ لیکن ان کا نقطۂ نظر اور معیار اتنا بلند تھا کہ ان کی غیر مطمئن سیمابی طبیعت اپنی منزل کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں پھری۔ وہ جہاں بھی گئے، خوب سے خوب تر کے جویا ... لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ جس منزلِ مقصود کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔ یہ کہیں ... بالآخر یہ انھیں ملی بھی تو کہاں؟ خود اپنے جاری کردہ الہلال میں

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا

یہ ہفتہ وار صحیح معنوں میں [illegible] سنگ میل ثابت ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء میں [illegible] تھا، جب ان کی عمر [illegible] سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ تین سال کے بعد یہ بھی حوادث زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بند ہو گیا، لیکن سچ پوچھئے تو یہ آج بھی زندہ ہے، کیونکہ آج تک ہر ہفتہ وار کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ وہ الہلال کے معیار کو پہنچ جائے؛ یہ اور بات ہے کہ یاروں کے بہت زور مارنے پر بھی کسی کو اس کا انداز نصیب نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم بھی یکسر دینی علوم سے متعلق تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے، انھوں نے وسیع اور گوناں گوں ذاتی مطالعے سے اس پر اضافہ کیا۔ پھر انھوں نے دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا منبع و مرکز رہا تھا۔ الہلال میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق پر سے اٹھا کر روزمرہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر و تدبر کے نتائج انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ بلکہ مخالفانہ قبضہ جما لیا اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلم بند نہ کر سکے، ہمیں اعتراف ہے کہ یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان ہے لیکن اگر ہم مسئلے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اول میں آ گئے ہیں اور ان سے متعلق انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں درج کر دئے ہیں تو اس نقصان کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے اُن کا اندازِ فکر اور اسلوب بیان۔ اگر ہم واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کریں تو ناممکن ہے کہ ہم ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہوں اور ہمیں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کو کس ڈھنگ سے مطالعہ کرنے کے

خواہش مند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے رستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

گر ترجمان القرآن محض ترجمہ و تفسیر ہی نہیں، بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنما بھی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے قطع نظر کر کے علوم و دعوتِ قرآن [illegible] پیش کیا، جو شارعِ عام کا مقصود اور صدرِ اول کا اعتقاد تھا [illegible] مضامین قلم بند کیے تھے، لیکن اس کے بعد حالات کے تقا[illegible] دور بدلے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو گئی تھی، اب ادب بھی مجبوراً چھوٹ گیا [illegible] کے دوران میں انھوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالۂ [illegible] کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اہلال ان کے عہدِ شباب کی یاد [illegible] بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ [illegible] یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے جو روزِ اول سے ان سے منسوب رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی قربانی دی۔ اگر وہ اور تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

میں پھر وہی بات دہراؤں گا، جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جس شخص نے ہماری تہذیب و ثقافت کو اتنا کچھ دیا ہے، کیا وہ کبھی مرسکتا ہے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ مرجائے یعنی بھلا دیا جائے، تو ہم [illegible] بد قسمت اور کون ہوگا!

(بشکریہ اردو پروگرام، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

یہ ہفتہ وار صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس کا [illegible] جولائی ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا، جب ان کی عمر ۲۴ سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ تین سال [illegible]انہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بند ہوگیا، لیکن سچ پوچھئے تو یہ آج بھی زندہ ہے، کیونکہ [illegible]تک ہر ہفتہ وار کا مطمعِ نظر یہ رہا ہے کہ وہ الہلال کے معیار کو پہنچ جائے؛ یہ اور بات ہے کہ یاروں کے بہت زور مارنے پر بھی کسی کو اس کا انداز نصیب نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم بھی یکسر دینی علوم سے متعلق تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے، انھوں نے وسیع اور گوناں گوں ذاتی مطالعے سے اس پر اضافہ کیا۔ پھر انھوں نے دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا منبع و مرکز رہا تھا۔ الہلال میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق پر سے اٹھا کر روزمرہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر و تدبر کے نتائج انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ بلکہ مخالفانہ قبضہ جما لیا اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلم بند نہ کر سکے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان ہے لیکن اگر ہم مسئلے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اول میں آ گئے ہیں اور ان سے متعلق انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں درج کر دئے ہیں تو اس نقصان کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے اُن کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان۔ اگر ہم واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کریں تو ناممکن ہے کہ ہم ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہوں اور ہمیں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کو کس ڈھنگ سے مطالعہ کرنے کے

خواہش مند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے رستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ ترجمان القرآن محض [illegible] ہی نہیں، بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنما بھی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے قطع نظر کرکے علوم و دعوتِ قرآن کو [illegible] میں پیش کیا، جو شارعِ عام کا مقصود اور صدرِ اول کا اعتقاد تھا

الہلال میں [illegible] نے کئی خالص ادبی مضامین قلم بند کیے تھے، لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انھیں [illegible] سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہوگئی تھی، اب ادب بھی مجبوراً چھوٹ گیا۔ حسنِ اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انھوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالۂ [illegible] غبارِ خاطر کے عنوان سے شائع ہوئے۔ الہلال ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے، غبارِ خاطر [illegible] بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے، یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے، جو روزِ اول سے ان سے منسوب رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی قربانی دی۔ اگر وہ اور تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کرکے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہوگیا ہوتا۔

میں پھر وہی بات دہراؤں گا، جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جس شخص نے ہماری تہذیب و ثقافت کو [illegible] دیا ہے، کیا وہ کبھی مرسکتا ہے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ مرجائے یعنی بھلا دیا جائے، تو ہم [illegible] اہل اور بدقسمت اور کون ہوگا!

(بشکریہ اردو پروگرام، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

عبداللطیف اعظمی

مولانا آزاد کی دسویں برسی —— ایک رپورتاژ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی، قوم کی اور علم و ادب کی جو شاندار خدمت کی ہے، اور اپنے دور میں وہ جس مرتبے اور مقام کے رہنما اور عالم تھے، اس لحاظ سے ہم نے ان کو یاد نہیں رکھا۔ ان کی کوئی یادگار قائم نہیں کی، چھوٹے پیمانے پر بھی ہر سال پابندی کے ساتھ ان کی یاد کو تازہ کرنے کی کوئی منظم کوشش نہیں کی۔ ہمیں خوشی ہے کہ امسال ان کی دسویں برسی کے موقع پر، اپنے فرض کو پورا کرنے اور ان کی یاد کا حق ادا کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ کامیاب کوشش کوئی مستقل شکل اختیار کر لے اور مولانائے مرحوم کی شایان شان ہم ہر سال ان کی برسی منا سکیں۔ اس طرح کہ ان کے مقاصد زندگی کی ترویج اور نشر و اشاعت بھی ہو سکے اور سیاست، علم اور اعلیٰ مذہبی و اخلاقی اقدار کو فائدہ بھی پہنچے۔

مولانا کی دسویں برسی منانے کے لئے میر مشتاق صاحب کی کوششوں سے، ۲۲ فروری کی صبح کو، مولانا کے مزار پر ایک بہت اچھا اجتماع ہوا۔ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تشریف لائے، مولانا آزاد کے مزار پر پھول چڑھائے، فاتحہ پڑھی اور جلسے کی مسند صدارت کو عزت بخشی، ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی تشریف لائیں اور مولانائے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنی مختصر تقریر میں مولانا کی سیاسی اور علمی خدمات کو سراہا، ان کی انسان دوستی، ان کے سیکولر خیالات و افکار، اور قومی یکجہتی اور مشترک تہذیب و زبان کے لئے ان کی کوششوں کو یاد کیا اور اس چراغ کو روشن رکھنے پر زور دیا کہ اسی میں قوم کی زندگی ہے، ملک کا مفاد ہے اور دراصل یہی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ اس تقریر کے بعد جناب سلام مچھلی شہری نے نظم پیش کی، جو شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ موقع و محل اور وقت کی ترجمان

* یہ نظم ایک مقامی روزنامے میں شائع ہو چکی ہے اس لیے یہاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ میری خواہش پر سلام صاحب نے اس نظم میں حسب ذیل شعروں کا اضافہ کیا ہے جو کہ [illegible] میں ہوئے ہیں [illegible] ان کو درج کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "ابوالکلام آزاد کی یاد میں"۔ غیر مطبوعہ شعر یہ ہیں:

[illegible] موجود ہیں "صدرِ وطن"
[illegible] کے چہرے پہ ان کا ہی عکس جلوہ فگن
جو صدرِ ہند ہیں پر گھر میں صرف "ذاکر" ہیں
جو اہل فن کے مربی ہیں، نور شاعر ہیں
ابوالکلام کہ تھے بلبلِ بہارِ چمن
ان ہی کی یاد میں آئی ہیں "جانِ بزمِ وطن"
وہ "جانِ بزمِ وطن" اندرا کہیں جن کو
نئی حیات کی دلکش فضا کہیں جن کو

[illegible] کے بعد جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر تشریف لائے اور حسب ذیل قطعات کے ذریعہ مولانا آزاد مرحوم کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا:

ملک و ملت کو ناز ہے تجھ پر — تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانے میں خود رہا برسوں — ملک کو قید سے کیا آزاد

[illegible] اور قوم کے عقیدت مند — یاد کرتے رہیں گے کام ترا
[illegible] ابوالکلام آزاد! — تا قیامت رہے گا نام ترا

[illegible] قدر عزم تھا جواں اپنا — کتنا روشن تھا اپنا مستقبل
جب کہ آزاد اور نہرو تھے — مادرِ ہند کا دماغ اور دل

پھر سے آمادۂ فساد ہیں لوگ — ہر طرف بغض ہے کدورت ہے
[illegible] خلوص و دانش کی — آج پھر ملک کو ضرورت ہے

اس موقع پر تقریباً تمام مرکزی وزیر موجود تھے، وزیر داخلہ شری چوہان، وزیر تعلیم شری تری گون سین، وزیر غذا شری جگجیون رام، وزیر اطلاعات و نشریات شری کے کے شاہ، وزیر صنعت شری فخر الدین علی احمد، نائب وزیر شری بھگوت سنگھ آزاد، نائب وزیر شری یونس سلیم۔ صدر جمہوریہ کی تشریف آوری سے قبل ان کی باہمی گفتگو کافی دلچسپ تھی۔ چند وزیر آچکے تھے اور وہ لوگ اسٹیج کے نیچے مولانا کے مزار سے مل کر فرش پر بیٹھ گئے۔ جب جگجیون رام صاحب تشریف لائے تو بعض وزیروں نے ان سے کہا کہ وہ اسٹیج پر تشریف رکھیں، انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور زینے پر بیٹھ گئے جو اسٹیج پر چڑھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کے کے شاہ تشریف لائے۔ ۱۸ر فروری کو انھوں نے یوم غالب کے مشاعرے کی صدارت فرمائی تھی اور اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے موقع و محل کے مطابق بہت مناسب شعر پیش کئے تھے۔ انھوں نے جگجیون رام صاحب کو زینے پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو برجستہ فرمایا، یہ غالب کا زمانہ نہیں ہے جگجیون رام کہ آپ فرما دیں گے :

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی آئیں تو سب نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ غیر وزیروں میں سے کسی نے کہا: اب آپ لوگوں کی سربراہ آگئیں اب تو اسٹیج پر تشریف رکھئے۔ وزیروں نے اندرا جی سے آگے بڑھنے کو کہا، انھوں نے فرمایا دھکتے میں وہاں بھی پہنچ جائیں اور وزیروں کے جھرمٹ میں اسٹیج پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے وہاں سے ماحول کا جائزہ لیا، جامع مسجد کے حسین منظر کو دیکھا، اس کے ارد گرد کباڑیوں کی دوکانوں پر نظر ڈالی اور فرمایا، یہاں پر کیا ہو رہا ہے۔ ان کا اشارہ ان سڑکوں اور دوکانوں کی تعمیر کی طرف تھا، جو ایک عرصے سے وہاں جاری ہے اور جامع مسجد کے علاقے کو صاف ستھرا رکھنے اور اس کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا، کباڑیوں کی ان دوکانوں سے جامع مسجد کا حسن بالکل چھپ گیا ہے۔ افسوس کہ اس وقت کوئی ایسا شخص نہیں

تھا، جو اس علاقے کی اسکیموں سے پوری طرح واقف تھا اور ان کو صحیح صورت حال بتلاتا اور ان کے اس [illegible] صاحب وغیرہ نو راشٹرپتی کے استقبال میں مصروف تھے۔

[illegible] کالج، دیال سنگھ، میں بھی مولانا آزاد کی برسی منائی گئی اور استادوں اور طالب علموں [illegible] پر جو تقریریں کیں وہ جذبات اور خیالات کے لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔ مگر بعض مقرروں سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ ہندی میں مولانا پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، نئی نسل تو آج بھی نصاب تعلیم کے علاوہ، غالباً انگریزی کی کتابیں اور رسالے نہیں پڑھتی، لیکن پچھلے دنوں انگریزی کے خلاف جو مظاہرے کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر مولانا آزاد اور دوسرے مسلم قوم پرور رہناؤں کے متعلق ہندی میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔

"مولانا آزاد کے انتقال کو دس سال ہو گئے، ہندوستان کے اس عظیم رہنما کو کچھ لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔" ہماری زبان نے اپنے اداراتی نوٹ میں لکھا ہے۔ کچھ اسی طرح کی بات روزنامہ "دعوت" نے بھی لکھی ہے: "مولانا اپنے وقت کی بہت قد آور شخصیت تھے، مگر احسان ناشناس زمانہ انھیں بھولتا جا رہا ہے۔" مگر سوال یہ ہے کہ انھیں کس نے یاد رکھا ہے؟ ہمارے مسلم اخبارات دوسروں سے شکایت کرتے ہیں کہ مسلمان رہناؤں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ مگر یہ مسلم اخبارات خود بھی کچھ کرتے ہیں؟ مولانا آزاد کی دسویں برسی پر مسلم اخبارات کو اٹھا کر دیکھ جائیے ہر طرف سناٹا نظر آئے گا۔ روزنامہ الجمعیۃ نے مولانا آزاد کی برسی کی خبر شائع کرتے وقت دلّی کے کانگریسی رہناؤں سے شکایت کی ہے کہ فلاں فلاں اشخاص کے علاوہ اور کوئی بھی جلسے میں موجود نہیں تھا۔ مگر خود اس اخبار کو اداریہ نہ سہی ایک نوٹ لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر کسی کو اداریہ لکھنے کی توفیق ہوئی تو وہ ایک غیر مسلم روزنامہ ہے۔ اردو کے مشہور روزنامہ تیج نے اپنے ۲۴ فروری کے شمارہ [illegible] ایک اداریہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں اس نے مولانا کو کھل کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں بھی ہر سال مولانا کی یاد میں تقریریں اور فیچر نشر کئے جاتے ہیں حسب معمول اس سال بھی ۲۲ فروری کو مولانائے مرحوم کی یاد کو تازہ کیا گیا اور ان کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اردو تقریروں کے سکشن سے، جو ایک طویل عرصہ سے قائم ہے اور جس سے ہمیں اردو کے اچھے پروگراموں کی توقع ہوتی ہے، جو پروگرام نشر ہوا وہ کچھ کمزور سا تھا، مولانا آزاد کی تحریروں کی بنیاد پر ایک فیچر مرتب کیا گیا تھا، شاید کسی اچھے مقرر کا انتظام نہ ہو سکا، اس لیے خلا کو پُر کرنے کے لیے ایک پروگرام شامل کر لیا گیا۔ اس فیچر کا عنوان تھا "اسوۂ آزاد"۔ میرے خیال میں پچھلے سال بھی اسی عنوان سے یہی پروگرام نشر کیا گیا تھا۔ "اسوہ" کے لفظی معنی جو بھی ہوں، لیکن اردو میں اس کا استعمال آنحضرتؐ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لیے کسی اور کے لیے استعمال کرنا ذرا نامناسب ہے، جناب ساغر نظامی صاحب تو اس قسم کی باریکیوں سے واقف ہیں، اس لیے اس عنوان کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس سے قطع نظر یوں بھی موضوع کے لحاظ سے اس فیچر کا یہ عنوان صحیح نہیں تھا۔

خوشی کی بات ہے کہ دہلی ریڈیو کے دوسرے پروگراموں میں بڑی پراثر اور فکر انگیز تقریریں نشر ہوئیں، اردو مجلس سے تین تقریریں نشر ہوئیں اور تینوں ایک سے ایک اچھی؛ ڈاکٹر تاراچند کو مولانا کے ساتھ وزارت تعلیمات میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا، انھوں نے قومی یکجہتی اور مولانا آزاد کے عنوان سے تقریر کی، پروفیسر خواجہ غلام السیدین کو بھی مولانا کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ان کی تقریر کا عنوان تھا "مولانا آزاد بحیثیت انسان"۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو کے مستند نقاد اور بہترین انشاپرداز ہیں، ان کی تقریر تھی "مولانا آزاد کا اجتہاد اردو نثر میں"۔ بڑی دلکش تقریر تھی۔ ان تقریروں کی نقلیں حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، انشاء اللہ جامعہ کے اگلے شمارے میں ہم شائع کر سکیں گے۔ کسی اور پروگرام کے تحت جناب ایم این مسعود صاحب نے انگریزی میں تقریر کی تھی، عنوان تھا "مولانا آزاد جیسا کہ میں ان کو جانتا ہوں"۔ موصوف کو بھی مولانا آزاد کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہے انھوں نے اس کی نقل بھیجنے کا وعدہ کیا ہے، انشاء اللہ اس کا ترجمہ بھی کسی مناسب موقع پر پیش کیا جائے گا۔ شری کے ڈی مالویہ کی بھی ایک تقریر نشر ہوئی تھی، عنوان تھا "مولانا صاحب کو میں بھی جانتا

تھا، میں یہ تقریر نہ سن سکا۔ شاید سندی میں رہی ہوگی، بہرحال اسے بھی حاصل کرنے کی [illegible] اور چاہتا ہوں کہ مولانا آزاد سے دلچسپی [illegible] بھی واقف کرانے کی کوئی صورت [illegible]

[illegible] سروسز کے تحت اردو پروگرام کے نام سے نہایت مفید اور اچھی تقریریں نشر ہوتی ہیں۔ [illegible] مالک رام صاحب نے مولانا آزاد کی ادبی خدمات پر ایک تقریر کی تھی۔ یہ تقریر [illegible] اس اشاعت میں شائع کی جا رہی ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی نے مولانا آزاد کی کتابوں اور ان کے [illegible] وغیرہ کو مرتب کر کے شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے، اس [illegible] کام جاری پر ہے [illegible] اس عنوان پر ان کو تقریر کرنے کا حق تھا۔

[illegible] کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہنگامی حیثیت کی ہیں اور عوامی سطح پر کی گئی ہیں۔ مگر ضرورت ہے کہ علمی سطح پر کچھ کام شروع کیا جائے۔ ہمارے ایک دوست کوشش کر رہے ہیں کہ مارچ میں ایک اجتماع کیا جائے، جس میں مولانا آزاد کے ثقافتی اور سیاسی افکار پر ایک سمپوزیم کیا جائے اور مولانا آزاد کی تصانیف اور جو کتابیں خود مولانا آزاد پر لکھی گئی ہیں، ان کی ایک نمائش بھی کی جائے۔ اس کام میں دلی کے کچھ بااثر حضرات حصہ لے رہے ہیں، اس لیے امید ہے کہ یہ کوشش کسی نہ کسی حد تک ضرور کامیاب ہوگی۔ اس طرح کے اجتماع کی تیاری کے لیے جس قدر وقت چاہیے، وہ نہیں ہے، لیکن اگر کسی معیاری کام کی بنیاد پڑ جائے تو یہ بجائے خود ایک بڑا کام ہے۔

مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ابھی کوئی مکمل اور جامع کتاب نہیں لکھی جا سکی، جس میں مولانا کے [illegible] اور کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہو۔ اس سال مرحوم کی دسویں برسی کے موقع پر ڈاکٹر [illegible] بیدار کی ایک وقیع کتاب شائع ہوئی ہے۔ بیدار صاحب کو جن موضوعات سے دلچسپی ہے، ان میں مولانا آزاد بھی شامل ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے مولانا کی زندگی اور کارناموں کے وہ پہلو

سامنے آئیں گے جو کسی حد تک تاریکی میں تھے۔ میں نے اس وقت جلدی میں صرف ورق گردانی کی ہے۔
مولانائے مرحوم کی موقع موقع سے بہت سی تحریریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان میں بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو آسانی سے آج ہر شخص کو میسر نہیں آسکتیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے بعض کی آپ بھی سیر کرلیں۔ "مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے نام سے مولانا کے ابتدائی دور میں ایک رسالہ شائع ہوا تھا یہ دراصل مولانا کا ایک خطبہ صدارت تھا، جو بنگال کی صوبائی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، بعد میں مولانا کی نظرثانی کے بعد البلاغ پریس سے دوبارہ شائع کیا گیا۔ مولانا پیغمبروں اور بیسویں صدی کے رہنماؤں کے طریق کار کے فرق اور اختلاف پر لکھتے ہیں:

"۱۹۱۱ء میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک مذہب عمل قرار دے لوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے تمام مرحلوں پر غور کر لیا ہے، اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے، اس وقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کرلیا تھا، ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصے میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت انجمنوں کے عہدوں اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں۔

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی؛ موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے اتباع و اقتدار کے لیے نوع انسانی کے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں حکمت اور سنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم اور محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے رہنما ہاتھوں میں دیدینے کے لیے مضطر تھا؛ گریبالڈی، میزینی یا گلیڈ اسٹون اور پارنل بننے کا عشق

میرے اندر تھا۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشۂ گمنامی و نامرادی میں خدمت و محنت کی

ایک غیر دلچسپ [illegible] افسانوں کے کسی ہجوم میں چھپ [illegible] یہ

بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہدِ نبوت و مذاہب کا ایک دلدادہ، انجمن

[illegible] باقاعدہ پریسیڈنٹ ہو، خدا کے رسولوں کا طریقِ خدمت و دعوت اور

[illegible] کا طریق ریاست و حکومت ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے"۔۔۔۔

۱۹۰۷ء کی ایک [illegible] ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

"[illegible] مورخین کے ملمع کار اور پر از تعصب قلم نے جن عجیب چالاکیوں سے

[illegible] فرضی تصویر کھینچی ہے، وہ دنیا کے اس متمدن ترین خطے کے قلمی فریبوں کی

ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ اس شریفانہ مصوری کی انجام دہی کے لیے باعزت مصوروں

[illegible] دست نگر ہونا پڑا، جس قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت تھی اس کا کافی ذخیرہ متعصبانہ

[illegible] سرسری نظر، سطح بینی، غلط واقعات، پر از کذب روایات اور مدلسانہ قصص نے پیشتر ہی سے

[illegible]

[illegible] اور جھوٹ کی باہمی کشمکش میں اخلاق کی طرف سے اطمینان دلایا گیا ہے کہ اول الذکر کی فتح

[illegible] دیکھنا چاہیے کہ یہ فتح بھی چند قدرتی آسانیوں اور آثار کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ آثار مفقود

[illegible] اور بعض اوقات ایسا ہوا بھی ہے تو سچائی کی دبی چنگاریوں کو جھوٹ کی راکھ کے ڈھیر

میں ڈھونڈھنا ایک بے سود محنت ہو جائے، ایک بڑی علامت اختلاف اور تعدد و تنوع بیان ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ اور بالخصوص انگلستان کے تاریخی اسٹیج پر جب مغلِ اعظم کا دربار منعقد

ہوتا ہے تو کوئی فرماں روا اس قدر مختلف، متعدد اور گاہ گاہ متضاد صورتوں میں نظر نہیں

آتا، جس قدر ظلم و تعصب کا یہ فرضی دیوتا اورنگ زیب عالمگیر۔ اس کے خط و خال غایت

[illegible] اور حیرت زا ہیں، کہیں سے خشونت اور سختی ظاہر ہوتی ہے اور کہیں نرمی اور رحم دلی

[illegible] مضا بیدار، صفحہ ۷۵

کا اثر ہویدا ہے۔ ایک تصویر میں وہ ہلاکت [illegible] پر جو تصویر بنی

اس میں حسن کی وہی بنا کھڑا ہے، اگرچہ آخری اوصاف کا اظہار بھی پوشیدہ مصالح پر مبنی

[illegible] وجہ تضاد سا اختلاف بے معنی نہیں ہو سکتا۔[1] ......

مولانا آزاد کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے مولانا شبلی کا مشہور شعر یاد آگیا:

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

پاکستان میں مولانا آزاد کی کتابیں بہت مقبول ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں بکتی ہیں، مگر وہاں کی حکومت اس کی پوری احتیاط رکھتی ہے کہ سرکاری [illegible] ان کا کوئی ذکر نہ آنے پائے، اس لیے یہ توقع رکھنا کہ وہاں کے ریڈیو نے بھی مولانا آزاد کی برسی پر [illegible] نشر کیا ہوگا، سراسر عبث ہے۔ البتہ مولانا کے مرحوم کے عقیدت مند مولانا غلام رسول مہر اور ہفت روزہ چٹان (لاہور) کے اڈیٹر جناب شورش کاشمیری مولانا کی یاد کا چراغ ہر حالت میں روشن رکھتے ہیں اور ابوسلمان شاہجہاں پوری نے مولانا آزاد کی یادگار میں ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ کئی سال سے مولانا کے خطوط کا ایک مکمل اور جامع مجموعہ مرتب کر رہے تھے، خوشی کی بات ہے کہ امسال اس دسویں برسی کے موقع پر وہ شائع ہو گیا ہے۔ میری خواہش پر، اس رپورتاژ کے لئے انھوں نے ایک پیشگی کاپی بھجوائی ہے، مگر اس دور میں جبکہ دنیا سمٹ کر مختصر سے مختصر تر ہو گئی ہے اور فاصلے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے فاصلے بڑھ گئے ہیں، اس کتاب کو روانہ ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں، مگر دیکھئے کب موصول ہوتی ہے۔ یہ رپورتاژ اگرچہ اُس مجموعۂ خطوط سے محروم رہا، مگر قارئین جامعہ کو اس سے مستفید کرنے کی کوئی نہ کوئی اور صورت نکل آئے گی ——— یار زندہ صحبت باقی

---

[1] مولانا ابو الکلام آزاد صفحہ ۲۸۹

سعید انصاری

رفتارِ تعلیم

نوجوان اور ڈاکٹر کلوویس مقصود:

یوں تو یونیورسٹیوں کے کنووکیشن میں ہندوستان کے بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم یا قومی زندگی کے ممتاز اشخاص ہمیشہ مدعو کئے جاتے ہیں، اور وہ ہندوستان کی تعلیم سے متعلق اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس سال جموں وکشمیر یونیورسٹی نے اپنے ہاں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر عرب لیگ کے خاص [illegible] ڈاکٹر کلوویس مقصود کو مدعو کیا تھا جنھوں نے نوجوانوں کے مسئلے، ان کے ضبط ونظم اور قومی زندگی میں ان کے حصے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ عام خیالات سے ذرا مختلف ہیں، اس لئے رفتارِ تعلیم کے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے، وہ کہتے ہیں کہ

"نوجوانوں کو انھیں اپنے ملک کے عام حالات سمجھنے کا پورا موقع دینا چاہیئے۔ انھیں اپنے قومی مقاصد سے اور زیادہ باقاعدہ اور گہرے انداز میں وابستہ ہونے کا موقع ہونا چاہیئے۔ ہمارے نوجوان اسی وقت ٹھیک انداز میں کام کریں گے جب وہ یہ سمجھیں گے کہ ان کے مسئلے خواہ کتنے ہی اہم اور پریشان کن کیوں نہ ہوں، اور ان کی تکالیف خواہ کتنی ہی شدید اور فوری کیوں نہ ہوں، یہ ملک کی عام پریشان حال سماجی اور معاشی اسباب کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جو شکایات طلبا اور نوجوانوں کو مخصوص ہیں، ان پر فوری توجہ ہونی چاہیئے اور ان کا خاطر خواہ علاج کرنا چاہیئے۔ لیکن نوجوانوں کو بھی اپنی شکایتوں کے سلسلے میں یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی ملک کے عام حالات کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ نوجوانوں [illegible] تعلق نہیں رکھنا ہے بلکہ ان کا پوری قوم سے واسطہ ہے۔ دوسری [illegible] ہے کہ جو انتظامی اور نفسیاتی دیواریں ان کے اور نوجوانوں کے

... سے گزر کر ان سے معاملہ کرنا ہے ۔ انھیں یہ بھی ...

... جوان ایک حد ... ہوتا ہے ۔ ملک و قوم کا مستقبل اس کے ہاتھوں میں ہے اور جب یہ مستقبل اسے ایک یا دھندلا ... ہے تو اس کی پریشانی اور بے چینی بڑھ جاتی ہے اور ناراضگی اور غصہ کے اظہار کی مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے ۔ یہ صورت حال ان ملکوں میں اور بھی نازک ہو جاتی ہے جو ابھی ترقی کے راستے پر گامزن ہیں ۔ ان ممالک کے بوڑھے اور عمر رسیدہ آزادی و ترقی کی کشاکش سے دوچار ہو چکے ہیں اور وہ ایک گونہ اس کا پھل کھا رہے ہیں، لیکن یہ نوجوان ہنوز اس کشاکش ... اس کے نتائج سے بھی محروم ۔

نوجوانوں کے لئے اس زندگی میں بڑا موقع ہے ۔ ان کی نت نئی تبدیلیوں کی خواہش، ان کے علم کی پیاس، ان کے زیادہ سے زیادہ حصول کی کوشش سب اس بات کی متقاضی ہیں کہ وہ اپنے ملکی اور قومی مسایل کا اپنے بڑوں اور زیادہ تجربہ کار بزرگوں کے ساتھ صحیح سے صحیح حل سوچیں گے اور زندگی کے نئے افق تلاش کریں گے ۔ اس طرح ان میں ایک توازن اور ہم آہنگی رہے گی جو جدید دنیا سے انھیں وابستہ رکھے گی ۔"

موجودہ نظام تعلیم کی بے روحی

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی ایک غیر سرکاری جماعت ہے جس کا ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی بڑے شہر میں اجلاس ہوتا ہے اور جہاں تعلیم کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے اشخاص جمع ہوتے ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر مقالے پڑھتے ہیں ۔ اس کانفرنس کا افتتاح کوئی بڑا آدمی کرتا ہے اور خطبۂ صدارت تعلیم کا کوئی ماہر دیتا ہے ۔ اس سال یہ کانفرنس گذشتہ دسمبر میں مدراس میں ہوئی تھی ۔ اس کا افتتاح مدراس کے گورنر سردار اجل سنگھ نے کیا تھا، استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر مدالیار نے دیا تھا اور اصل اجلاس کی صدارت پروفیسر ڈی سی شرما کے حصہ میں آئی تھی ۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی علمی حیثیت کے مطابق اپنا حق ادا کیا تھا اور تعلیم کی ترقی اور اس کی رفتار بڑھانے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ ڈاکٹر مدالیار نے لوگوں میں تعلیم کے روز افزوں شوق کو دیکھ کر بڑے

مختصر لیکن بلیغ انداز میں یہ فرمایا تھا کہ ہمیں اپنے کاموں میں ہندوستان میں رہ کر زیادہ سے زیادہ دکھانی ہے اور باہر جاکر اپنے کام [illegible] بڑی سے بڑی عزت حاصل کرنی ہے۔ یہی ہمارا خواہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری نعرہ ہونا چاہئے۔

[illegible] پرتاپ سنگھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں ہندوستان کے اندر اخلاقی اور روحانی تعلیم پر زور [illegible] یہ شکوہ کیا تھا کہ وہ بعض وقت اپنے کو ٹریڈ یونین میں تبدیل کر دیتے ہیں [illegible] بے چینی کا سب سے بڑا سبب انھوں نے "نظام تعلیم کا میکانکی اور بے روح" ہونا بتایا تھا اور اس بات پر سخت افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا کہ ذرا سی شکایت بھی ہنگامہ و فساد کا رخ اختیار کر لیتی ہے اور یہ بھی بڑی قابل افسوس بات ہے کہ طلبا کی جماعت سماج دشمن لوگوں کے ہاتھوں میں [illegible] سے آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ تعلیم گاہوں میں اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا لازمی انتظام ہو، اس لئے کہ مذہب اور اخلاق کا سیرت کی تشکیل اور ضبط کے قیام میں بڑا حصہ ہے۔

اس کے بعد اصل خطبہ صدارت ڈاکٹر ڈی سی شرما کا آتا ہے، جس میں انھوں نے بڑی شکایت اس امر کی ہے کہ تعلیم کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے کمیشن مقرر ہوئے جن میں یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے رادھا کرشنن، ثانوی تعلیم کے لئے مدالیار کمیشن اور سب سے آخر میں تعلیم کی تنظیم و اصلاح کے لئے کوٹھاری کمیشن جو ابھی حال میں مقرر ہوا تھا۔ سب کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور وہ سب کی سب کتب خانوں کی زینت بن [illegible] اس امر کی ہے کہ ان رپورٹوں کا جو مفید حصہ ہے اور ان کی جو سفارشات اس وقت قابل عمل ہیں [illegible] اکٹھا کر کے ان پر عمل کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہر ریاست کم سے کم [illegible] اپنے سالانہ میزانیہ کا تعلیم پر صرف کرے۔ اس سلسلہ میں مدراس نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ زبان کے مسئلہ پر انھوں نے فرمایا کہ انگریزی ابھی ہندوستان میں بہت دنوں تک [illegible] کی اور جنھیں اس میں شبہ ہے وہ ان ملکوں کا حال دیکھیں، جیسے سوویت روس ہے وہاں انگریزی یا کسی غیر ملکی زبان کا کیا حال ہے۔

بیان بابت ملکیت ماہنامہ جامعہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۴۔ پبلشر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۵۔ ایڈیٹر کا نام : ضیاء الحسن فاروقی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پرنسپل جامعہ کالج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

مارچ ۱۹۶۸ء

The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



[illegible]

[illegible]

برہان

سالانہ چندہ
روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۷ | بابت ماہ اپریل ۱۹۶۸ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

[illegible] کا دور ہے، اس کی کچھ اپنی خوبیاں ہیں، زندگی کی رفتار تیز ہے اور اسی تیزی سے
م کے خزانے میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے اب تخصّص سے مفر نہیں، اس کا ایک اہم پہلو
قیق بھی ہے اور تحقیق کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، علم و ادب کا کوئی شعبہ ہو
قیق سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا، اردو شعر و ادب میں بھی تحقیقی کام نے خاصی حد تک اپنا اعتبار قائم
لیا ہے اور میں اسے ترقی کی علامت سمجھتا ہوں لیکن کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تحقیقی کام
لیقی کام کرنے والے ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہو، لیکن محسوس میں
ایسا ہی کرتا ہوں، اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب میر
ے میں ابھی واضح نہیں ہے۔

کوئی بڑا تخلیقی کام تاریخی نظر کے بغیر ممکن نہیں، یہ نظر ہمیں محقق ہی کی مدد سے مل سکتی ہے، مثلاً
[illegible] عصری شاعری کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کی نظر اپنے کلاسیکی ادب پر گہری ہو، یہ ادب اپنے
کی تہذیب کا آئینہ دار ہوگا، اس تہذیب کا ارتقاء، اس کے نشیب و فراز، جلال و جمال، اس کے
ں کی تپش اور اس کی راتوں کا سوز، غرض سب کچھ اس کے ادب نے سمیٹ لیا ہوگا، اس ادب کا کھنا
اس کی آفاقی قدروں کو انگیز کرنا عظیم شاعری کے لئے ناگزیر ہے، اس کے بغیر شاعر کے خیالات
[illegible] ترتیب اور ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکتی جو کلاسیکیت کے ٹھہراؤ اور نظم و ضبط میں ملتی ہے
اس تہذیب کے زمانہ اور خود شاعر کے عہد کے درمیانی عرصے میں تاریخ کن مراحل سے گزر

اور اپنے دور میں پر کیا کیا لے کر گذری، یہ سب کچھ بھی شاعر کی نظر میں ہونا چاہئے، اس سے یہ مراد نہیں کہ شاعر مورخ بھی ہو، مطلب یہ ہے کہ اس کا تاریخی شعور بیدار ہو تاکہ سماجی شعور کی جلا ہو سکے۔

ایسا شاعر خود تحقیق نہیں کرے گا، سارا مواد اُسے محقق سے ملے گا، اس لئے تحقیقی کام کی بڑی اہمیت ہے، یہی بات ایک بڑے ناول نگار اور نقاد کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، لیکن محقق کا کام بے نتیجہ ہے اگر اس سے تاریخی نظر نہ پیدا ہو تحقیقی کام کے لئے بڑے صبر و استقلال اور گہرے اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے محققوں کو نہ تو وہ سہولتیں میسر ہیں جو ایسے صبر آزما اور محنت طلب کام کے لئے ضروری ہیں اور نہ عام طور پر وہ شوق اور لگن پائی جاتی ہے جو ویرانوں میں خزانے ڈھونڈ لیتی ہے، بدقسمتی سے تعلیمی نظام کی کل بھی کچھ ایسی بن گئی ہے کہ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا جو تھوڑا بہت کام ہوتا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے کہ چھپ جائے تاکہ اونچے گریڈ کے ملنے میں رکاوٹ نہ ہو، غیر محسوس طور پر اس کا اثر یہ پڑا ہے کہ تحقیق کا کوئی اعلیٰ مقصد، اس ادبی مقصد کے ساتھ، نہیں رہا، اسی لئے ہمارے محققین کو اس کا احساس بہت کم ہے کہ تخلیقی ادب کی ترقی کے لئے اُن پر کتنی بڑی ذمہ داری ہے، یہ بات طے ہے کہ جس تاریخی نظر کا ذکر کیا گیا ہے وہ شاعر یا ناول نگار کا تخیل اور تفکر پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے محقق کو اپنے کام اور مقام کا اندازہ ہونا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خود پسند اور مغرور ہو جائے، جس طرح شاعر، نقاد یا ناول نگار کو تاریخی نظر اُس کے کام سے ملتی ہے اسی طرح وہ مجبور بھی ہے کہ اس کی مدد سے وہ خود کوئی بڑا تخلیقی کام انجام نہیں دے سکتا، یہ کام وہی کر سکتا ہے جو ذوقِ جمال رکھتا ہو، جس میں رازِ کائنات کو پا جانے کا حوصلہ ہو، جو روحِ کائنات کی حقیقت کو سمجھنے اور اس سے اتحاد پیدا کرنے کا آرزومند ہو، جسے جذبات اور احساس کی شدت کی دولت ملی ہو اور جو تخیل کے پروں پر اڑ سکتا ہو ـــــ اور

[illegible] کو ساری دنیا کی داستان غم بنا دینے کی بھرپور فنکارانہ صلاحیت اور قدرت [illegible] ہو۔ اس طرح درحقیقت تحقیق اور تخلیق دونوں ایک دوسرے کے کام آتی ہیں، دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں، اس لئے تحقیق اور تخلیقی کام کرنے والے ایک دوسرے کے حریف نہیں، ساتھی ہیں۔

[illegible] جو تخلیقات ہو رہی ہیں، وہ بہت کمزور قسم کی ہیں، ہماری نئی نسل کے شاعر، نقاد، افسانہ نویس اور ناول نگار، اپنے کلاسیکی ادب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، ان میں وہ تاریخی نظر نہیں جو اُن کے دل کے اضطراب کو تھام سکے، نالہ ہے مگر خام [illegible] میں پختگی اسی وقت پیدا ہو گی جب اُن کے سامنے تہذیبوں کے طلوع و غروب کے فکر انگیز مناظر ہوں، اور یہ چیز بغیر کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے اور تاریخ انسانی کے خوب و زشت سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں، اور یہ سب کچھ نتیجہ ہو ایسے تفکر پر کہ انسان کی کہانی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی کہانی بن جائے۔

[illegible] نئے لکھنے والے، خواہ وہ شعر کہتے ہوں یا نثر لکھتے ہوں، اُس زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہیں جس میں وہ لکھتے ہیں، میری مُراد اردو زبان سے ہے، اس زبان کے محاورے، اس کی تشبیہیں اور استعارے، اس کی شعری علامتیں ـــــ یہ سب ایک خاص تہذیب کی دین ہے، اس تہذیب میں ہندی کی ملاحت، فارسی کی حلاوت اور عربی کی صلابت سبھی کچھ شامل ہے، اردو کے تخلیق کاروں کو اس تہذیب اور اس کے بنیادی عناصر سے آگاہی ہونی چاہئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان نے فارسی کا ذوق کھو کر اپنے آپ کو ایک بڑی دولت سے محروم کر لیا، اور اُردو کے شعری ادب کا تقریباً سب کچھ ہی فارسی ہی کا رہینِ منت ہے، ایسی صورت میں کیا یہ لازم نہیں آتا کہ فارسی شعر و ادب کا مطالعہ بھی سنجیدگی سے کیا جائے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو زبان و بیان پر قدرت اردو اور فارسی جانے بغیر حاصل ہو جائے اور معلوم ہے کہ زبان و بیان پر قدرت کے بغیر اچھی ادبی تخلیق نہیں ہو سکتی، جدید شاعری کا انسان خواہ کتنا ہی تنہا کیوں نہ ہو، وہ تاریخ کے دھارے سے [illegible] سکتا، جدید شاعر بلاشبہ اپنے انفرادی اضطراب و ہیجان کو آج

ے انسان کا المیہ کہہ سکتا ہے، لیکن یہ بھی تو ایک تاریخی حقیقت ہی ہے اور کوئی تاریخی حقیقت [illegible] نیاز نہیں ہو سکتی ۔

سوال ہے کہ کیا آج 'مشاہدۂ حق' کی گفتگو 'بادہ و ساغر' کی زبان میں نہیں ہو سکتی ؟ میرا خیال ہے کہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ پرانی علامتوں کو برتنے کا سلیقہ ہو، تشبیہیں اور استعارے اول اول، بھونڈی شکل میں، اپنی غذا خارجی حالات ہی سے حاصل کر سکتے ہیں لیکن شاعر کا مذاق، اس کا وجدان اور اس کا تخلیقی فن، زبان و ادب کی کلاسیکی معلومات کے سہارے، اُن تشبیہوں اور استعاروں کی تہذیب کرتا ہے، اور کبھی کبھی تو پرانی تشبیہوں اور استعاروں کو نیا مفہوم عطا کرتا ہے، اس سلسلہ میں اقبال کی یاد آگئی ہے، انھوں نے اسی نہج پر اردو غزل اور اردو شاعری کے دامن کو بہت وسیع کر دیا، ایک شعر سُن لیجئے ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

آج کل نفسیاتی الجھن کا ذکر عام ہے، کہتے ہیں کہ جدید افسانہ ہو یا شاعری اسی الجھن کی ترجمانی کرتی ہے، چلئے ہم بھی مان لیتے ہیں، لیکن یہ اُلجھن تو رومانی تحریک کے دور میں یوروپ کے انسان میں بھی رہی ہو گی ۔ ہو سکتا ہے کہ کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ذرا مختلف ہو، لیکن پھر یہ کیسے ممکن ہو سکا کہ گوئٹے جیسا خلاق فن عالم ظہور میں آیا، اس میں بھی شک، اضطراب، مایوسی اور ناکامی کا دور گذرا لیکن اس نے جلد ہی اپنے درد کا درماں بھی ڈھونڈھ لیا، اور اس 'درماں' نے اسی 'درد' کی کوکھ سے جنم لیا، ہمارے آج کے شاعر اور افسانہ نگار بھی اس کی کوشش کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی نفسیاتی اُلجھنوں میں کسی اعلیٰ مقصد کے لئے ترتیب پیدا کریں، اس سے پہلے تو اُن کے نفس کی تربیت ہو گی اور پھر اُن کا غم دنیا کا غم بن جائے گا اور ہر شخص یہ سمجھے گا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اس کی اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں اور وہ انھیں کے دل کی آواز ہے ۔

ضیاء الحسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(۱۷۱۲ء——۱۷۷۸ء)

(۳)

روسو نے جس طرح اس حقیقت کو مان لیا تھا کہ فرد کے لئے معاشرتی زندگی ناگزیر ہے، اُسی
رح اس بات پر بھی زور دیا کہ اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لئے فرد کی تعلیم بھی اچھی اور مناسب ہونی
اہئے۔ لیکن جیسے اُس نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی اداروں کے خلاف انقلابی خیالات
ش کئے بالکل اسی طرح تعلیم کے متعلق بھی اُس کی آواز رائج طریقوں اور مسلّمہ اصولوں کے خلاف
قلاب اور بغاوت کی آواز تھی، اس آواز کی گھن گرج اُس نے اپنی تصنیف "امیل" کے برجستہ
زروں، جذباتی جملوں اور منتخب ترکیبوں اور استعاروں کے ذریعہ لوگوں کے کانوں تک پہنچائی،
یل کا اس تصنیف وہی ہے جو "معاہدۂ عمرانی" کا ہے۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے خود اُس کی
رزوؤں کی کہانی بھی ہے، وہ آرزوئیں جن کے مطابق وہ اپنا بچپن گذارنا چاہتا تھا لیکن
اس کی قسمت میں نہ تھا، یہ فرانس کے طبقۂ امراء کی خاندانی زندگی اور امیر گھرانوں کی مہذب
رتوں کے طور طریقے پر طنز بھی ہے، اس میں بھی ہمیں فطرت اور فطری زندگی کی سادگی اور
بزرگی کے احترام کی دعوت دی گئی ہے اور ایک بار پھر یہی بتایا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر
[illegible] لیکن تہذیب و تمدن اُسے خراب کر دیتے ہیں۔ فطرت انسانی کے نیک ہونے کا تصور
سائی تعلیمات کی با[illegible]تھا، کلیسا نے صدیوں یہ تعلیم دی تھی کہ انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے،

خدا جو رحیم اور رحمٰن ہے، انسان کی نجات کے لئے بیچین تھا، اس لئے اُس نے خود حضرت مسیحؑ [illegible] کو صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے، روسو کلیسا کے اس عقیدہ کا مخالف تھا اور یہی وجہ ہے کہ کلیسا نے اُسے کبھی معاف نہیں کیا۔

ویسے تو "امیل" ایک کہانی کے روپ میں لکھی گئی ہے، لیکن اس کا ایک حصہ ناصحانہ ہے، مجموعی طور پر یہ فلسفۂ تعلیم پر ایک پختہ کار ذہن کی ممتاز تصنیف ہے، اس میں اُس نے یہ بتایا ہے کہ بچہ کی صحیح اور سچی تعلیم اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اُسے شروع ہی سے ماں باپ سے الگ کر لیا جائے، خاندان، اسکول اور سماج سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، اس طرح سب سے الگ کر کے اُسے ایک نمونے کے استاد کی نگرانی میں رکھا جائے جو اُس کی پرورش فطرت کے حُسن اور نیرنگیوں کی آغوش میں کرے۔ کتاب کے شروع ہی میں وہ ایک بنیادی اصول بیان کر دیتا ہے: "خالق کائنات ہر چیز کو اچھی بناتا ہے لیکن جیسے ہی یہ انسان کے ہاتھوں میں پہونچتی ہے اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔" ہماری تعلیم کے تین سرچشمے ہیں: فطرت، انسان، اشیاء، ان تین وسیلوں سے جو کچھ ملتا ہے اُس میں اگر ہم آہنگی اور توازن نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں خرابی اور خامی رہ گئی ہے۔

روسو جب یہ کہتا ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت فطرت کے مطابق ہونی چاہئے تو اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بچے کی خواہشات، جذبات اور اُس کے جبلّی عمل اور ردِ عمل پر قید و بند نہ عائد کی جائے، دوسروں کے ساتھ رہ کر بچے کی رائے اور خیال پر خارجی اثرات پڑتے ہیں اور ان کی وجہ سے اُس کے اپنے ذاتی تاثرات پر اُس کی فطرت کی کارفرمائی نہیں رہ پاتی، اور یہ چیز بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے مُضر ہے۔ روسو اٹھارویں صدی کی بناوٹی اور تکلفات سے بھرپور متمدن زندگی کے ملبے سے انسان کو نکال کر ایک نیا جنم دینا چاہتا تھا، وہ ایک نئے انسان کی تعمیر کا خواب دیکھتا تھا، اسی لئے وہ مروجہ سماجی اداروں اور رائج ریت رسم کے استحکام کے لئے دی جانے والی تعلیم کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اس طرح کی تعلیم میں بچے کی فطرت کو فراموش اور اُس کی سچی خوشی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔" انسانی دانشمندی کا سارا اسرار غلامانہ

تعصبات پر مشتمل ہے، ہمارے رسم و رواج محکومی، پابندی اور کچھ نہیں، مہذب آدمی غلامی کی حالت میں پیدا ہوتا ہے، غلامی ہی میں زندہ رہتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے، پیدائش کے وقت اسے پوتڑوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور مرنے پر اسے کفن پہنایا جاتا ہے، غرض جب تک کہ وہ انسانی شکل میں ہوتا ہے، اس پر مختلف اداروں کی بندشیں ہوتی ہیں۔"

جیسا کہ مضمون کے شروع میں کہا جا چکا ہے روسو کی ذہنی روح تعمیر سے نہیں بلکہ تخریب کے ہیجان سے پیدا ہوئی تھی، وہ سیاست اور معاشرت کے ہر شعبے میں اثبات کا نہیں نفی کا واعظ تھا، [illegible] تعلیم کے میدان میں بھی اس کی آواز منفی ہی رہی، اس نے کہا کہ یہ بات مفاد پرستوں کے حق میں ہوگی اگر تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ پرانے عقائد کو اور مستحکم بنایا جائے، اس لئے ضروری ہے کہ بچے کی [illegible] تعلیم کا نہج منفی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو یہ نہ بتایا جائے کہ نیکی اور سچائی کیا ہے بلکہ یہ کہ وہ کس طرح اپنے دل کو برائیوں اور اپنے ذہن کو غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ بچے کا بھی اپنا [illegible] خواہش ہوتی ہے، صحیح تعلیم یہ ہے کہ اس کی خواہش، فطری رجحانات، داخلی صلاحیتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اپنی فطرت دبائی نہ جائے۔

تعلیم کے اس منفی تصور سے روسو کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ سرے سے تعلیم ہی نہ دی جائے، مقصود یہ تھا کہ تعلیم ہو لیکن مروجہ طریقۂ تعلیم سے ہٹ کر ایک دوسرے نہج پر۔ اپنے اس تصور کی وضاحت میں اس نے لکھا ہے کہ "میں مثبت تعلیم اس تعلیم کو کہتا ہوں جو وقت سے پہلے ذہن کی تعمیر کا رجحان رکھتی ہے اور بچے کو وہ فرائض سکھاتی ہے جو ایک بالغ انسان ہی پورے کر سکتے ہیں، میں منفی تعلیم اس تعلیم کو کہتا ہوں جو ان اعضا کو جنہیں ہم حصول علم کا وسیلہ کہتے ہیں براہ راست اس علم کا وسیلہ بننے سے پہلے، تیار اور ان کی تکمیل کرتی ہے، اور حواس کے مناسب استعمال سے عقل و شعور کی معجز نمائی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے، منفی تعلیم بیکاری اور کاہلی کا مشغلہ نہیں ہے، اس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، یہ نیکی نہیں سکھاتی، یہ برائی سے بچاتی ہے، یہ سچائی کی تعلیم نہیں دیتی، یہ خطا سے محفوظ رکھتی ہے، اس سے بچے کی طبیعت

فطری جذبہ ہے، معلم کو چاہئے کہ وہ اس جذبہ کی قدر کرے [illegible] بچے کے فطری مذاق کا لحاظ رکھے، [illegible] کوئی علم یا معلومات بچے کے ذہن پر نہ لادی جائیں، صرف یہ دیکھا جائے کہ کس چیز کا سیکھنا بچے کے لئے مفید ہے، وہی حرفہ یا علم بچے کو سکھایا جائے جسے وہ طبعی طور پر پسند کرتا ہے، تعلیم میں ہاتھ کے کام کی روسو کے نزدیک بہت اہمیت تھی، اس کی سماجی افادیت [illegible] سے بحث کی ہے، بعد میں مفکرین نے اس کے نفسیاتی پہلو پر بہت زور دیا لیکن [illegible] انکار کسی نے نہیں کیا۔

سیاسی افکار کی طرح روسو کے تعلیمی خیالات کا اثر بھی بہت ہوا، انیسویں صدی کے کئی اکابر معلمین نے اسی کے خرمن سے خوشہ چینی کی، پستالوزی، ہربرٹ، فروبل اور دوسرے معلمین کے یہاں روسو کے خیالات کا اثر صاف نمایاں ہے، جدید تعلیم کے نفسیاتی، عمرانی اور مادی رجحانات جن کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا اور برتا گیا ہے، ایک طرح سے روسو ہی کی دین ہے۔

ایک بڑے اور انقلابی مصنف اور مفکر کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کی تحریروں میں بیک وقت وہ تمام رجحانات مل جاتے ہیں جو آگے چل کر زندگی کے مختلف شعبوں میں تحریکوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے مصنف کا ہر خیال اعتراض و تنقید سے بالا ہوتا ہے، اپنی جگہ اس کے افکار میں بھی اعتراض کی گنجائش ہوتی ہے، اور کبھی کبھی بہت ہوتی ہے، روسو پر پر بھی اعتراض کی بہت گنجائش ہے، لیکن چونکہ وہ باغی تھا اور ایسا باغی کہ اپنے پورے عہد کو طوفان و ہیجان کی بھٹی میں جھونک دینا چاہتا تھا، اس لئے سیاست، معیشت، تعلیم اور ادب غرض ہر چیز پر اس کے انقلابی خیالات کا اثر پڑا روسو کا عہد عقلیت کا عہد تھا، یہ عقلیت نشاۃ ثانیہ کے عہد کی مبہم مگر تند مزاج رومانیت کے خلاف ایک شدید رد عمل تھا، نشاۃ ثانیہ کی رومانیت کو مبہم میں نے اس لئے کہا ہے کہ اس کے پہلو پر کلاسیکیت کی چھاپ تھی، البتہ آرٹ شاعری اور ادب میں اس کا آہنگ عہد وسطی کے کلیسائی مزاج کے خلاف ایک اعلان جنگ تھا

[illegible] کے لوگ کیتھولک عیسائیت کی تنگ نظری [illegible] پابندیوں [illegible] ے، اور انسان
[illegible] کا طائر قفس کی تمام تیلیوں کو توڑ کر فضائے بسیط میں پرواز کرنے کا آرزومند تھا، یہ [illegible]
[illegible] اب اسی دنیا، اسی زندگی، اس کی کشمکش، اس کے نشیب و فراز اور اسی کے لذت و الم کو
[illegible] بنانا چاہتا تھا، شکسپیر اس آرزو [illegible] تمنا کی علامت تھا، اس نے انسانی جذبے اور
[illegible] کے رنگا رنگ مظاہر کی [illegible] تفسیر و تشریح کی کہ اس انقلابی عہد میں انسان
[illegible] مرکز بن گیا۔

[illegible] عقلیت کا یہ پہلی لہر تھی اور ابھی مکمل طور پر یہ عہد وسطیٰ کے ذہنی اثرات کو مٹا نہیں سکی
[illegible] اس کی روک تھام کے لئے عقلیت کے پشتے بنا دیئے گئے، عقلیت کا یہ دور سترھویں صدی
[illegible] کے آخر میں شروع ہوا اور تقریباً اسی نوے سال تک یورپ کی علمی و ادبی فضا پر چھایا رہا۔
[illegible] تحریک میں جذبے کی کوئی اہمیت نہیں تھی، سب کچھ عقل تھی، اس تحریک نے فرانس میں جنم لیا
[illegible] انگلستان [illegible] جرمنی میں پھیلی، عقلیت نے آزاد خیالی کا رنگ جمایا اور رائج رسم و روایات
[illegible] مذہبی عقائد و اعمال طنز و تضحیک کا نشانہ بنے، اس نے روشن خیالی کے لئے فضا ہموار
[illegible] تنقیدی اور علمی [illegible] فکر کو پروان چڑھایا، بلاشبہ عقلیت کا یہ بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کا
[illegible] یہ بھی کلاسیکی [illegible] ادب میں یونانی اصولوں ہی کو برتا جاتا رہا، اور یونانی رومی تہذیب کی کلاسیکیت
[illegible] گن گاتے رہے، یورپ ذہنی اعتبار سے، اپنی عقل پرستی کے باوجود، یونان اور
[illegible] کی کاسہ [illegible] خواہ کسی کی اور کسی نوعیت کی ہو تخلیقی قوت کے سرچشموں کو خشک
[illegible] ہے، ہر قوم اور ہر عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کا یورپ اپنی کلاسیکیت
[illegible] کے باوجود حقیقی معنوں میں کلاسیکی نہیں تھا، اس عہد کی عقلیت یکطرفہ اور انتہا پسندانہ
[illegible] عہد وسطیٰ کے فکری و ذہنی جمود کے خلاف، اس لئے اس میں ہمیں وہ توازن اور ہم آہنگی
[illegible] جو یونانیوں کے عہد آخر کے فکر و فلسفے میں پائی جاتی ہے۔

روسو پہلا شخص ہے جس نے فرانس میں اس بے روح عقلیت کے خلاف آواز اٹھائی

اور رومانیت کا غلغلہ ایک بار پھر بلند ہوا، اُدھر جرمنی میں کانٹ اور ہرڈر نے عقلیت کی کمزوریاں [illegible] اور بصیرت سے اس تحریک کے ہیجان کو سکون سے آشنا کیا،

[illegible] کا تعلق ہے وہ فرانس میں اس نئی رومانی تحریک کا امام تھا، اس کی آشفتہ نوائی میں غضب کا سوز اور بلا کی گرمی تھی، اُس کی تحریروں میں جذبے کی شدت تھی اور وہ اپنی بات اس طرح سے کہتا تھا کہ سننے والا یا پڑھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ یہ اُس کے اپنے دل کی آواز ہے، اُس نے عقل اور تجزئے کو وہ اہمیت نہیں دی جو اٹھارویں صدی کے عقلیت پسندوں کا طرۂ امتیاز تھا، اس کے بجائے اُس نے جذبے اور جبلت کو اہم بتایا اور یہ کہا کہ جذبہ حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے اس لئے جذباتی زندگی صداقتوں اور مسرتوں سے معمور ہے، عقل محض پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس سے ہم خیالات و آرار کے گورکھ دھندوں میں پھنس جاتے ہیں، ہم اپنی بے خبری اور جہل میں زیادہ خوش رہ سکتے ہیں، اس سے کون انکار کرتا ہے کہ ایک عالم ایسی ہزاروں چیزوں سے واقف ہوتا ہے جنھیں ایک جاہل شخص کبھی نہیں جان سکتا؟ لیکن کیا یہ عالم اس بنا پر سچائی سے قریب ہو جاتا ہے؟ برخلاف اس کے علم کے میدان میں وہ جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا ہی سچائی سے دور ہوتا جاتا ہے کیونکہ علم کا غرور اور رائے قائم کرنے کے سلسلے میں اُس کی خود پسندی اُسے سیکڑوں غلط خیالات میں اُلجھا دیتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یورپ کی علمی انجمنوں کی حقیقت مکر و فریب کے پبلک اسکول سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ علم اور عقل پر اس شدت کا حملہ کرنے کے ساتھ ہی وہ جذبہ، وجدان، فطرت، محبت، آزادی اور فطری سادگی کے قصیدے پڑھتا ہے، انسان کی اہمیت بتاتا ہے اور اسی کو کائنات کا مرکز سمجھتا ہے۔ انسان اُس کے نزدیک ایک لامحدود دنیا ہے جس میں بے پناہ امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ تخیل کی پہنائیاں انسان کا وہ جوہر ہے جس کے سہارے وہ اپنی دنیا آپ بناتا اور بگاڑتا ہے، اُس کا دل گنجینۂ حقیقت ہے، اسی میں وہ ڈوب کر اُبھرے تو زندگی کی سچائیوں کا سراغ مل سکتا ہے

ظاہر ہے کہ یہی رجحانات رومانیت کی خصوصیت ہیں، انھیں میں فطرت اور انسان سے محبت
[illegible] محبت کا جذبہ داخلیت کی طرف لے جاتا ہے، ہیومانزم اگر محض علمی فلسفہ اور
عقلی توجیہہ ہو کر رہ جائے تو اس سے دل کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی، دل کی دنیا آباد ہوتی ہے جذبہ کی
[illegible] کی [illegible]، ذوق کی لذت سے، سمجھنے کی تڑپ سے۔ روسو نے فرانسیسی
[illegible] شامل کیا اور ایک نئی طرز یعنی رومانیت کی بنیاد ڈالی۔

جدید ادب میں روسو کا کیا مرتبہ ہے؟ اس سوال کا جواب ہم ڈاکٹر یوسف حسین خاں
کی مشہور کتاب 'فرانسیسی ادب' کے ایک طویل اقتباس سے دیتے ہیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی
رائے ہے جس کی نظر فرانسیسی ادب اور روسو کی ادبی حیثیت پر مسلم کہی جا سکتی ہے، فطرت
اور روسو [illegible] طرح انسانی ڈرامہ میں ایک زندہ اور جیتے جاگتے کردار کی حیثیت سے پیش
کیا، اس پر بھی اس اقتباس سے روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فرانسیسی ادب میں ویسے تو فطرت کا ذکر ہمیں نشأۃ ثانیہ کے بعد سے برابر ملتا ہے
لیکن روسو نے اسے بلند مرتبہ پر پہنچایا اور ایسا اعلیٰ مقام عطا کیا کہ آج تک وہ وہیں براجمان
ہے۔ اس نے فطرت کے ساتھ انسانوں کا جذباتی تعلق قائم کر دیا جسے اس کا زبردست کارنامہ
سمجھنا چاہیئے۔ اب فطرت محض انسانی عمل کے پس منظر کا کام نہیں دیتی بلکہ مقصود بالذات بن گئی۔
اب وہ مطالعہ اور شاعری کا موضوع قرار پائی اور اہل ذوق نے اسے نئی بصیرتوں کا ماخذ قرار
دیا۔ روسو کے بعد ادب میں نفسیاتی تجزیے کے ساتھ فطرت کی تصویر کشی لازمی قرار پائی۔ روسو
کے طرز تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ فلسفی ادیبوں کے طرز کے خلاف اس کے یہاں حرارت و حرکت
کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح اس نے جدید ادب کے لئے راستہ صاف کر دیا جس میں خارجیت
اور داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ رومانی غنائیت کا، جس کے موضوع خودی، خدا اور فطرت
[illegible] پائی ہے۔ اس کے تصورات میں منطق اور جذبہ، تجرید اور ادراک، خطابت اور شاعری
فلسفہ اور مصوری سب کی لطیف کارفرمائی موجود ہے۔ وہ عہد جدید کے مختلف رجحانات کا سنگم ہے

...نے اس سے خوشہ چینی کی ... یہی رومانیت پسند اور حقیقت پسند دونوں اسے ا...
... جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے اُس کی عظمت کے گُن گائے ہیں۔ ایک موقع پر اس نے روسو کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

> "ایک زمانہ تھا جب کہ میں غرور سے کہتا تھا کہ انسانیت کی عزت علم سے ہے اور مجھے جاہل لوگوں سے نفرت تھی۔ روسو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ برتری کا فریب دینے والا احساس جاتا رہا اور مجھے محسوس ہوا کہ اصل میں عزت و احترام کا مستحق انسان ہے۔"

"روسو کا اثر اٹھارویں اور انیسویں صدی ہی تک محدود نہیں رہا۔ رومان رولاں کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کی تحت شعوری نفسیات کا ماخذ بھی روسو ہے۔ ٹالسٹائے نے اس کو اپنا امام مانا ہے۔ اس کی اخلاقی اصلاح کی تحریک اور ایاس نیا پولیانا میں اُس نے جو اپنا مدرسہ قائم کیا تھا، وہ روسو کی تعلیم اور خیالات کے زیر اثر تھا۔ نوجوانی کے زمانے میں روسو کی تصویر وہ عقیدتاً اپنی گردن میں ڈالے رکھتا تھا۔ آخری زمانے تک اس پر یہ اثر قائم رہا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

> "روسو کی تصانیف کا میرے دل پر اس قدر اثر ہے کہ بعض وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ گویا میں خود ان کا مصنف ہوں"

"یہ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائے نے اپنی تصانیف میں روسو کے خیالات کی بیسویں صدی میں ترجمانی کی۔ اس طرح مختلف زمانوں میں روسو کے اثر کا ایک نیا انداز رہا ہے جس سے اُس کی شخصیت کی وسعت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔"[1]

۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، فرانسیسی ادب، ... ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، صفحات ۲۵۲-۵۴

سعید انصاری

فروبل کنڈرگارٹن کا بانی

(۲)

[illegible] میں فروبل کے فلسفیانہ خیالات اور تعلیم کے نظری پہلوؤں سے بحث کی گئی تھی۔ اس حصہ میں تعلیم کے عملی پہلوؤں اور بالخصوص کنڈر گارٹن سے بحث ہوگی۔

فروبل کا اثر تعلیم کے عملی پہلوؤں پر:

فروبل کا [illegible] کے عملی زندگی کے متعلق ایسا ہی انقلاب انگیز تھا، جیسا کہ پسٹالوزی کا۔ اور باوجود [illegible] اور پسٹالوزی کے اس کے خیال میں وہ اب بھی اسی قدر اصلاح کا محتاج تھا، جتنا ان سے پہلے۔ ان تبدیلیوں کا جو تجربی بنیاد پر اس کے اندر پیدا ہوئیں، فروبل انھیں ایک فلسفہ کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ اپنی ایک کتاب "تعلیم نمو کے ذریعہ" میں وہ لکھتا ہے:

"تعلیم و تدریس، ضبط اور مدرسہ بہ حیثیت مجموعی اپنی ضروریات اور ان کا انتظام، خواہ وہ بچوں کی زندگی سے بالکل باہر ہوں یا انسانی زندگی کے اندر بھی ہوں، پھر بھی ان کا تعلق ایک ایسے زمانہ سے ہوتا ہے جو بچہ کے نقطۂ نظر سے اتنا مستقبل بعید میں ہوتا ہے کہ اس کے لئے کسی جاذبیت، ابھار اور نمو کا سبب نہیں بنتا۔ جو کچھ بچے کو کرنا یا سیکھنا ہے، وہ اس کے ارادے اور عمل سے شروع ہونا چاہیئے جو اندرونی طور پر کرنے یا خواہش سے مربوط [illegible] مجموعی زندگی کا نتیجہ ہو جو خود اپنی جگہ پر متحد اور مربوط ہو۔ اس کا اظہار یقیناً ہمارے تمام مضامین تعلیم سے ہوتا ہے جن کا تعلق بیشتر انسان کی زندگی سے ہے۔ ہماری تمام [illegible] اور لکھنے، گننے اور بولنے، حساب اور زبان سے متعلق خصوصیت سے کمزور

ہوتی ہے اس لئے کہ وہ مجردات سے شروع کی جاتی ہے، جہاں پر اسے ختم ہونا چاہئے۔ اس [illegible] کی اس تدریس کے زندگی میں بہت کم دیرپا اثرات ہوتے ہیں۔

فروبل [illegible] مدرسہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں بچے کو زندگی کی اہم باتیں حقیقت کے لوازمات [illegible] آزاد شخصیت، ذمہ داری، کام کرنے کا حوصلہ، سبب اور نتیجہ کا تعلق اور اس قسم کی اہم باتیں آنی چاہئیں، نہ صرف انھیں سیکھ کر بلکہ برت کر حاصل کرنی چاہئیں۔

وحدت کے بنیادی تصور کے مطابق مدرسہ کو ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جس میں ہر بچہ خود اپنی انفرادیت کو دریافت کرے، اپنی شخصیت کو ابھارے اور اپنے کام کے حوصلے اور کرنے کی قوت کو نشوونما دے۔ یہ باتیں اسے ایسے لوگوں سے مل کر کرنی ہیں جو خود بھی اسی قسم کے کاموں میں لگے ہوں، جہاں سب کی دلچسپیاں مشترک ہوں، سب مل کر ذمہ داری اٹھاتے ہوں اور اس کا صلہ و انعام سب کو یکساں ملتا ہو۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کا مستقل محرک ہو۔ مدرسہ کو جس طرح کہ دنیا ہے ایک وحدت بننا ہے، جس میں ترقی پذیر انفرادیت کی تمام وحدتیں دنیا کی زندگی میں شریک ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ایک مصنف کے قول کے مطابق

"اس[1] کا کنڈرگارٹن یا مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جہاں سب مل کر ذمہ داری اٹھاتے ہیں، سب انفرادی حقوق کا احترام کرتے ہیں، سب میں برادرانہ ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے اور سب ہنسی خوشی مل کر کام کرتے ہیں۔"

غرض اشتراک عمل جو وحدت کا لازمہ ہے، وحدت کے اندر تنوع جو زندگی اور حقیقت کا قانون ہے، اس مدرسہ کا بنیادی اصول ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹا سا سماج بن جاتا ہے۔ تعلیم زندگی کا ایک جزو ہو جاتی ہے جو کسی آگے کی تیاری نہیں بلکہ بذاتِ خود اس کا خلاصہ ہو۔

تدریس پھر تعلیم یا مدرسہ کے کام کے مرادف نہیں رہتی ہے پھر ایک ایسے عمل کا ذریعہ بن جاتی ہے

---

[1] ہیوز : فروبل کے تعلیمی قوانین

[illegible] عمل اور طبعی دل چسپیاں [illegible] ہوتی ہے اور پھر علم کے کسی طبعی استعمال اور [illegible] اظہار پر ختم ہوتی ہے جو تدریس کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کھیل کی اہمیت اس کے نزدیک بہت زیادہ ہے جب بے ساختہ عمل اور بچہ کی طبعی دل چسپیوں کا سب سے بڑا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے [illegible] یا اور مشغلوں میں ایک حصہ جہاں تعلیمی مشغلوں کا ہے، دوسرا حصہ مختلف کھیلوں سے تعلق رکھتا ہے۔

کھیل کی اہمیت

[illegible] کے عملی کاموں پر فروبل کا جو سب سے گہرا اثر پڑا ہے، وہ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں کھیل کی اہمیت ہے۔ کھیل کا تعلیمی فائدہ سب سے پہلے افلاطون نے بتایا تھا اور اس کے پھر قدیم مصریوں کے ہاں اس کا پتہ ملتا ہے۔ اسی طرح تعلیم کی ساری تاریخ میں بالخصوص نشاۃ ثانیہ کے مصنفوں نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، اور فروبل کے کنڈر گارٹن سے پہلے کوئی نصف صدی سے یہ جرمنی میں ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس تحریک میں زیادہ تر اس کی جسمانی حیثیت پر زور دیا جاتا تھا، لیکن فروبل نے اس کو [illegible] اور اخلاقی معنی پہنا دیئے ہیں۔

کھیل چونکہ بچہ کا سب سے بے ساختہ عمل ہے، ابتدائی عمر میں یہ تعلیمی عمل کی ایک بہت بڑی بنیاد بن جاتا ہے۔ چونکہ یہ بچہ کی طبعی دل چسپیوں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس میں اس کی پوری صلاحیت ہوتی ہے کہ بچے کے ان اعمال، جذبات اور خیالات کی بنیاد اس پر رکھی جائے جو ماہرین تعلیم ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کھیل ہے جس کے ذریعہ بچہ سب سے پہلے دنیا کو اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس کھیل کے ذریعہ معلم زندگی کی وہ تفسیر جو وہ دینا چاہتا ہے، بچہ کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ نہایت خوبی کے ساتھ حقیقی معاشرتی تعلقات کی دنیا سے بچہ کو روشناس کر سکتا ہے [illegible] اور جذبۂ عمل پیدا کر سکتا ہے اور اسے ایک ایسا فرد بنا سکتا ہے جو اس معاشرتی کُل کا ایک جزو نظر آئے۔

[illegible] صرف نظری حیثیت سے کھیل کی تعلیمی اہمیت بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے خیالات اس نے کنڈر گارٹن کی عملی شکل میں پیش کئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ کنڈر گارٹن میں کھیل

ذریعہ اس نے خود تعلیم کے صحیح مفہوم کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ بلکہ آج کل ڈل چسپی کے غلط معنی پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے اس کا ایک غلط نظریہ لوگوں کے سامنے آگیا ہے، یہاں تک کہ آج بہت سے لوگ تعلیم ہی کو کھیل سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اور یہ وہی غلطی ہے جو اکثر ایسی صورت میں سرزد ہوتی ہے جب ہم ذریعہ کو مقصد اور مقصد کو ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

ہاتھ کے کام کی تعلیمی اہمیت :

کھیل کی طرح ہر قسم کا ہاتھ کا کام بھی ہے۔ جس طرح ہم کھیل میں لپے ساختگی پاتے ہیں اور اس میں بھی ہم خیال کو عمل کا جامہ پہنا سکتے ہیں اور اسے تعلیم کا ذریعہ بنا سکتے ہیں، ہاتھ کا کام تعلیمی عمل کی ابتدار بھی ہو سکتی ہے اور انتہا بھی۔ روسو نے سب سے پہلے ہاتھ کے کام کو تعلیم کے ایک ذریعہ کے طور پر پیش کیا ہے، لیکن اس نے زیادہ تر اسے سماجی اور معاشی بنیاد پر پیش کیا ہے پیسٹالوزی کا چونکہ یہ خیال تھا کہ تمام علم حواس کے ذریعہ آتا ہے اور تعلیم اصل میں انہی حواس کی تربیت کا نام ہے، اس نے اس تصور میں ایک اور نفسیاتی پہلو کا اضافہ کر دیا تھا۔ نیلن برگ نے اگرچہ اسے اور عملی بنا دیا تھا لیکن وہ سماجی اور معاشی حدود سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ لیکن فروبل نے خالص تعلیمی بنیادوں پر ہاتھ کے کام اور ہر عملی مشغلے کو وہ جگہ عطا کی جو آج کل کی تعلیمی دنیا میں اسے حاصل ہے۔ پیسٹالوزی نے مطالعۂ اشیار اور ہاتھ کے مشغلوں کو زیادہ تر اس وجہ سے تعلیم میں شامل کیا تھا کہ وہ بچہ تک علم پہنچانے کا یا زیادہ سے زیادہ حواس کی تربیت کا ایک ذریعہ ہیں۔ لیکن فروبل نے اس میں ایک تخلیقی مقصد پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے ذریعہ بچہ ایک طاقت پیدا کر سکتا ہے، اس لئے کہ ہر مشغلہ کسی ایک خیال یا مقصد کا مظہر ہوتا ہے جو تعلیم کے ذریعہ بچہ حاصل کرتا ہے۔ مدرسہ کے اندر کسی شے، سامان یا معلومات کے استعمال کا بڑا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ بچہ اس کا کیا کر سکتا ہے۔ اس طرح گویا ایک وسیع معنی میں اصل مقصد چیز کا استعمال ہے اور مدرسہ کا تمام کام تعمیری ہے۔ لیکن فروبل کے نزدیک بچہ کے ان مادی اشیار کے استعمال میں ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ روحانی ہے۔ وہ اس ہاتھ کے کام کا اخلاقی، روحانی اور مذہبی مقصد ان لفظوں میں بیان کرتا ہے :

خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اس لئے انسان کو بھی خدا کی طرح تخلیق اور چیزوں کو وجود میں لانے کا کام انجام دینا چاہئے۔ انسان کی روح کو بے صورتی پر حاوی ہونا ... لانا چاہئے کہ وہ شکل اور صورت اختیار کرلے اور آپ اپنی زندگی پائے۔ یہ ہے کام اور حرفہ، نفع بخش اور تخلیقی ... عمیق اہمیت اور عظیم مقصد۔ ہم محنت اور کام کرنے دھرنے میں سچ مچ خدا کی طرح ہو جائیں جن کے ساتھ واضح شعور یا مبہم سا احساس بھی ہونا چاہئے تاکہ اس کے ذریعہ ہم مادی کو خارجی شکل میں ظاہر کرسکیں، جسم کو روح کی اور صورت کو خیال کی شکل دے سکیں اور غیر مرئی کو مرئی بنا سکیں۔

... کی اہمیت اس اصول کی شکل میں پائی جاتی ہے کہ تعلیم اصل میں باطنی نشوونما ہے جو ... انی ذات کا بیرونی شکل میں ظاہر کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہاتھ کے ذریعہ یعنی اس کا ... مظہر ہے بلکہ اس مادی اظہار کی طاقت کا نشوونما اصل بنیاد ہے ذہنی، ... اتی اور روحانی اظہار کا جو عمل کی شکل میں ہوتا ہے اور جو آگے چل کر عادت یا سیرت کی شکل ... یار کر لیتا ہے۔ اس بنیاد پر اس کا خیال تھا کہ تمام تعلیم کے لئے

اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمام کام کو آزاد شغل کا درجہ دیا جائے یعنی اسے ایک معقول عمل بنا دیا جائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس قانون کو جس کے مطابق تمام ... ہوتا ہے تسلیم کیا جائے اور شعوری طور پر اس کا اطلاق کیا جائے جس طرح کہ اس کا اب تک غیر شعوری طور پر اطلاق ہوتا رہا ہے۔ اس طرح سے کہ درجہ بہ درجہ ... کے شعور میں آئے اور تمام تشکیل و تعمیر کے لئے ایک رہبر اور رہنما سمجھا جائے۔ ... عمل کے سوا کسی اور طریقہ سے انسانی عمل آزاد شغل میں تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اسی ... ذہنی عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہاتھ کے کام کے ساتھ ساتھ ذہن کا کام بھی ہو۔ اس وقت فن یا آرٹ صحیح معنوں میں آزادانہ شغل کہا جا سکتا ہے، لیکن ہر

انسانی کام کم و بیش تخلیقی کام ہے اور یہ اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے [illegible] خالق کی ایک چھوٹی شکل ہے۔

[illegible] فروئبل کے نزدیک حواس کی تربیت، مہارت پیدا کرنے، جسم کی ورزش، میکانکی تعلیم یا کسی پیشے کے حصول سے کہیں زیادہ گہرا مقصد رکھتا ہے۔ یہ خیالات کے اظہار کا سب سے موزون طریقہ، عادات پیدا کرنے کی سب سے متعین شکل اور سیرت کی تعمیر کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

مطالعۂ فطرت مدرسوں میں:

اگرچہ اس سے پہلے پسٹالوزی اور دوسرے ماہرین تعلیم نے بھی مدرسوں میں مطالعۂ فطرت پر زور دیا ہے، لیکن فروئبل کے نزدیک اس کا جو مفہوم ہے، وہ دوسروں سے بالکل جدا ہے۔ اس کا عام مفہوم تو اس کے ہاں بھی یہی ہے کہ مظاہر فطرت کے متعلق علم حاصل کیا جائے، لیکن اس سے زیادہ اس کی اصل غرض یہ ہے کہ فطرت سے تعلق کے ذریعہ بچہ میں اخلاق کی اصلاح، مذہبی روح اور روحانی فکر پیدا ہو۔ لیکن اگر فروئبل کی ان مثالی قدروں کو چھوڑ بھی دیا جائے پھر بھی فطرت کے مطالعہ سے اخلاقی تربیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہ مظاہر فطرت اور بچہ کی ذہنی و اخلاقی زندگی میں بہت کچھ مشترک ہے، جس کا ایک دوسرے پر اثر پڑنا لازم ہے۔ مطالعۂ فطرت میں جو باتیں بچوں کے سامنے آتی ہیں، وہ بڑی قابل قدر ہیں اور ان کی بڑی روحانی اہمیت ہے، ان باتوں کے علاوہ ان میں بہت کچھ بچوں کی دلچسپیوں کی تشفی کا موقع ہے اور بہت مختلف قسم کے مشغلے ان میں آسکتے ہیں، اس وجہ سے مطالعہ فطرت کا ابتدائی تعلیم میں بہت بڑا درجہ ہے اور اس حیثیت سے اس میں بچوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا مواد کہاں تک مل سکتا ہے اور حساب اور ہاتھ کے کام کا کہاں تک موقع ہو سکتا ہے، ان وجوہ سے مدرسہ کے مضامین میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ مطالعۂ فطرت کی حیثیتیں جو بعض اور ماہرین تعلیم نے پیش کی تھیں، اگرچہ کچھ عرصہ بعد بہت مدھم پڑ گئیں لیکن فروئبل نے اس کے مطالعہ کی جس نقطہ نظر سے وکالت کی تھی، وہ بڑی حد تک آج بھی قائم ہے۔ اس کے نزدیک مطالعۂ فطرت کا مفہوم اس کا تجزیہ اور کاٹ چھانٹ نہیں ہے بلکہ فطرت کی پوری زندگی

ہے یعنی پودے کا مطالعہ ایک نمو پذیر شے کی حیثیت سے ہے، جانور کا ایک فعال ہستی کی حیثیت اور پودے کا اپنے وظیفہ خاص کے خیال سے۔ غرض فروبل کا اثر جہاں ایک طرف اپنے مثالی تصور سے موجودہ سائنس ... کے خلاف ہے ... دوسری طرف فطرت کے تصور اور سائنس کی ضرورت اور اس کے استعمال کے لحاظ سے یہ جدید سائنسی نقطہ نظر کے عین مطابق اور اس سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

کنڈر گارٹن:

کنڈر گارٹن کا بنیادی خیال یہی ہے کہ بچے کو اظہار ذات کا پورا موقع دیا جائے تاکہ وہ نمو پذیر ہو سکے۔ اس غرض کے لئے اسے اپنی بنیادی دل چسپیوں اور عمل کے میلانات سے کام لینا ہوگا۔ ... کی بنیاد تمام تر خود عملی پر ہونا چاہئے اور اس کام کے دوران میں اسے اپنے خیالات کے ... علم کے حصول کا موقع ہونا چاہئے۔ اصل مقصد حصول علم نہیں، بلکہ وہ نمو ... جس میں علم مقصد کے ایک ذریعہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ علم ایک ضمنی یا نتیجہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر نمو حاصل کرنی ہے تو ایک ضروری جزو ہے۔ اب سے پہلے مدرسوں میں علم کے حصول پر بطور ایک مقصد کے جو اس قدر زور دیا جاتا تھا وہ اب ایک ضمنی یا جزو کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ یہ اب مکمل تعلیمی عمل میں کام یا اظہار ذات کے ساتھ ایک جزو یا ضمن کی حیثیت رکھتا ہے۔

... جو شکلیں فروبل نے تربیت کے لئے اختیار کیں، ان میں سے ایک اشارے، دوسرا گانا اور تیسری زبان رکھی ہے۔ ان ذریعوں سے فروبل نے بچہ کو اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار ... ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا بقیہ حصہ ایسے مواد کو کھیلوں، عملی کاموں، کہانیوں اور دوسری ... میں ترتیب دینے کے لئے وقف کر دیا تھا، جس سے ایک طرف بچہ اور دوسری طرف استاد اس کی دل چسپیوں اور میلانات سے کام لے سکیں۔ حتی الامکان ان ذرائع کو باہم مربوط اور ایک دوسرے سے وابستہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر، استاد جب بچے کو کہانی سنائے گا تو بچہ ... نہ صرف اپنی زبان میں بلکہ گانوں، اشاروں، تصویروں یا ...

[illegible]ش یا اور دوسری آسان چیزوں سے بناکر ظاہر کرے گا۔ اس طرح سے بچے میں خیالات پیدا ہوں [illegible]س کی قوت تخیل تیز ہو گی، ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہو گی، اعصاب میں ربط پیدا ہو گا، اصل [illegible]یار میں ظاہر کرنے کی کوشش سے اخلاقی فطرت مضبوط ہو گی اور احساسات [illegible] ہو گی۔ اس طرح تعلیم کا ہمہ جہتی نشو و نما کا مقصد پورا ہو سکے گا۔ کنڈر گارٹن کے سامان تعلیم میں علاوہ گانوں کے، فروبل نے ایک سلسلہ "ہدایا اور مشغلوں" کا تیار کیا تھا۔ یہ ایک خاص تدریج اور ترتیب کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس وقت بچہ ایک 'ہدیہ' کے مواد سے یا اس پر مبنی 'مشغلوں' سے واقف ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد دوسرا شروع کرتا ہے، جو پہلے سے نکلتا ہے اور اس طرح ہر ایک سے نئے تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور پرانوں کی تکرار ہوتی ہے۔ ان "ہدایا اور مشغلوں" میں عام طور سے جو فرق کیا جاتا ہے، وہ کسی خاص اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ فروبل نے خود تمام کاموں کو 'مشغلے' کہا ہے اور ان کے سامان کو 'ہدایا'۔ لیکن بعد میں جب فروبل کے فلسفہ کے اصول مرتب ہونے لگے تو مواد یا سامان سے زیادہ مشغلوں پر زور دیا جانے لگا۔ اگرچہ فروبل نے اپنے تعلیمی اصولوں کو ان مقررہ شکلوں میں ترتیب دے کر تعلیم کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر گانے اور مشغلے ایک زمانہ اور قوم کے لئے مخصوص نظر آتے ہیں، لیکن زمانہ اور حالات کے مطابق ان میں تبدیلیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

کنڈر گارٹن کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ فروبل کے انتقال سے قبل کئی ایک کنڈر گارٹن جرمنی کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکے تھے، لیکن پراشا کی حکومت کو ان میں نہ جانے کیا ایسی انقلابی روح نظر آئی کہ اس نے ان سب کو بند کر دیا۔ لیکن ایک شریف خاتون بیرونس برتھا (B [illegible] Berth[illegible]) کو اس سے ایسی دل چسپی پیدا ہوئی کہ وہ اپنے کام کو بند کرنے کی بجائے انگلستان اٹھا کر لے گئیں جہاں کی آزاد فضا میں [illegible] کو پنپنے کا بہتر موقع ملا۔ سچ پوچھئے تو کنڈر گارٹن [illegible] مقبول بنانے میں ان خاتون کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دس سال کے بعد اگرچہ حکومت نے اپنی [illegible] اٹھا لی لیکن پھر بھی وہ پورے نظام تعلیم کا جزو نہ بن سکا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان کے

[illegible] سے زیادہ حیرت ناک کوئی ہستی نہیں ہے۔ فرشتوں سے زیادہ
ئل اور حیوانوں [illegible] دنیا کی سب سے زیادہ پیچیدہ Computer [illegible]
یہ اور بے [illegible] امکانات کا مالک، بقول اقبال

دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
پر تیرے بحرِ تخیل کے کنارے

تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

مولانا آزاد نے شعوری طور پر اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اپنی خودی کی تعمیر کی تھی۔ وراثت
یرت اور دل و دماغ کا بیش بہا خزانہ پایا تھا، بزرگوں کی تربیت سے بہت کچھ حاصل کیا
ور پھر اپنی [illegible] اور انفرادیت کے طفیل ہر معاملہ میں اپنی ایک ذاتی راہ نکالی تھی اور
د وراثت اور تربیت کے اثرات قبول کرنے کے ان کو تمام و کمال اپنانے سے انکار کر دیا
[illegible] اپنے ہی بنائے راستوں پر چلتے رہے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی تربیت دیتے
۔ ایمان کو بھی انھوں نے بطور ایک عطیہ خداداد کے نہیں پایا، بلکہ اس کے حصول کی راہ میں
ر شبہ کے [illegible] رزاروں میں سے گذرے اور اس تک طلب، سعی اور فکر کی سخت
ہدامد آزمائشوں کے بعد پہونچے۔

سوچیے تو کیسا ہمہ گیر اور غیر معمولی انسان تھا یہ آزاد! میں بہت سے اسمائے صفت استعمال

کر کے اپنی تقریر کو بوجھل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تعجب ہے تاہم یہ دیکھ کر کہ بنانے والے نے اپنی نعمتوں کی کس قدر فراوانی تھی ان کی ذات میں۔ ایک نہایت جید عالم دین جس نے نہ صرف اپنے مذہب بلکہ مذاہب عالم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان میں نظر پیدا کر کے مذہب اسلام کی تعلیم کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ بجائے خود ایک عمر بھر کا کام تھا لیکن ان کی گوناگوں شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ انھوں نے ملک کی سیاسی جد وجہد میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ پیش آئے جس میں انھوں نے گاندھی جی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت کا فرض انجام دیا۔ تیسری طرف ان کی تقریریں اور تحریریں اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور عرصہ دراز تک رکھیں گی۔ وہ لفظوں کا جادو وہ عبارت کا در وبست، وہ فصاحت جو ابتدائی دور میں شوکت الفاظ سے معمور کرتی تھی اور آخری دور میں اپنی سلاست اور زور بیان سے جادو جگاتی تھی۔ پوری تحریر کو ضبط تحریر میں لائیں تو معلوم ہوگا کہ ادب عالیہ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

پھر کیا آپ کو ایک عالم دین، ایک صف اول کے سیاسی قائد اور ایک بلند پایہ ادیب سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اس کو مثلاً علم موسیقی سے گہرا لگاؤ اور وسیع واقفیت ہوگی یا اس کا ذوق جمال اس قدر لطیف اور شگفتہ ہوگا کہ وہ قرآن شریف کی تفسیر میں بھی اس پہلو کو ابھار کر کے دکھائے گا اور فیضان جمال کو خدا کی صفات عالیہ میں شمار کرے گا؟ یہ سب چیزیں بھی ان کی ذات میں خوبصورتی کے ساتھ سمائی ہوئی تھیں۔ اور ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ بات نہ بھول جائے کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت میں انھوں نے محکمۂ تعلیم کے کاموں میں کس طرح ایک نئی وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اس میں بعض بالکل نئے دروازے کھولے، جیسے ادب اور فنون لطیفہ کی اکیڈمیاں یا ثقافتی تعلقات کا [illegible] صدی میں ان کی ٹکر کی ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی چند ہی ہستیاں نظر آتی [illegible] میں نے ابھی ان کی ذاتی خصوصیات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی ذات میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک اصول پرستی جس کا تقاضہ ہے کہ انسان جس بات کو صحیح سمجھے اس پر مضبوطی

ے ساتھ قائم رہے اور دوسری جرأت کا کسی خوف یا لالچ یا نام نہاد مصلحت سے متاثر نہ ہو۔ دراصل خوف
ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کا یا تو حساب صاف نہ ہو یا جو اپنے یقین اور [illegible]
تیار نہ ہوں۔ لیکن مولانا کا حساب زندگی ہمیشہ صاف رہا اور کبھی نہ خواہش انعام ہوئی نہ ستائش کی
ا۔ کوئی خطاب قبول نہیں کیا، سنتا ہوں کہ جب بھارت رتن نے دروازے پر دستک دی تو انہوں
دروازہ نہیں کھولا۔ دیگر اعزازی ڈگریوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ اگر کوئی ادارہ
عت ان کے نام پر کسی [illegible] کا نام رکھنا چاہے تو بغیر ان سے دریافت کئے [illegible]
[illegible]۔ میں نہیں چاہتا کہ جب تک میں وزیر تعلیم ہوں اس قسم کی کوئی چیز کی جائے!
ت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی گاندھی جی یا جواہر لال سے اختلاف ہوتا تو اس کو کھلم کھلا ان کے سامنے
ہوتی [illegible] خلاف ان لوگوں کے جو سامنے تائید اور پیٹھ پیچھے مخالفت کرتے
اصول پرستی کا ایک قصہ سن لیجئے ایک صوبہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے الکشن کے لئے ایک
وار کا نام بہت اصرار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان کے پاس صوبہ کانگریس کمیٹی کی طرف سے وفد
ار اور ٹیلی فون آئے، ان کے اپنے ساتھیوں اور وزیروں نے سفارش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ
ہیں ہلا۔ اس شخص نے اناج کی ذخیرہ اندوزی کی اس وقت جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔
ی طرح اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ اس کو کانگریس کا ٹکٹ دیا جائے"۔ زندگی ایسی
ہ صاف گزری کہ جب پیدا کرنے والے نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو بنک میں اتنا روپیہ نہ
موٹر خریدنے کے لئے حکومت سے جو رقم لی تھی اس کو ادا کیا جا سکے! میں نے بحیثیت ان
اسٹنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے آٹھ سال سے زیادہ ان کے ساتھ کام کیا اور انھوں نے کبھی
امیدوار کے تقرر یا ترقی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی کوئی سفارش نہیں کی۔ "یہ تمہارا
[illegible] اصول کے مطابق فیصلہ کرو"۔ دہلی آنے سے پہلے جب میں حکومت بمبئی میں مشیر تعلیم
[illegible] نے ایک عزیز کے بارے میں خط لکھا لیکن اس میں یہ بات بالکل واضح کر دی کہ اس معاملہ
دمت کے چیف منسٹر یا کسی وزیر یا حاکم سے سفارش نہ کی جائے۔ مولانا بالعموم بہت لئے دئے

رہتے تھے اور لوگوں کو بہت دفعہ اس کی وجہ سے ان کے متعلق غلط فہمی ہوتی تھی۔ غبار خاطر میں خود

...ں افتاد طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقت حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں دوسروں کو سبک سر تصور کرتا ہوں اس لئے ان کی طرف نہیں بڑھتا حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر کہاں کر سکتا ہوں۔"

لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جب بے تکلف احباب کی صحبت ہوتی (جس میں کوئی ناجنس شریک نہ ہوتا) تو ان کی گفتگو میں لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، مزاح لطیف اور برجستہ شعر خوانی کے پھول کھلتے اور فن گفتگو میں ان کے کمال کا بھید کھلتا۔ بالعموم وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے میں بہت احتیاط برتتے کیونکہ ان کی طبیعت میں بے پناہ ضبط تھا۔ اس لئے عام طور پر لوگ ان کے دل کے گداز اور محبت کی گہرائی کی جھلک نہ دیکھ پاتے تھے۔ لیکن میں نے خوش اتفاق سے کبھی کبھی اس دل کو بے نقاب دیکھا اور اس کی گرمی کو محسوس کیا۔ بس ایک بات اور سن لیجئے۔ مولانا ساری عمر پبلک کام کرتے رہے، ان کی زندگی پبلک کی نظر کے سامنے گذری، وہ قومی زندگی کے تمام امید آفریں اور یاس انگیز ہنگاموں سے گھرے رہے۔ لیکن ان کی زندگی کا اصل مرکز ان کی ذات کے اندر تھا جس سے وہ اپنی تمام قوت اور الہام حاصل کرتے تھے۔ اپنی جیل خانے کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا چھن گیا تو گیا مضائقہ؟ وہ تمام سامان جو اندر تھا اور ہے کوئی نہیں چھین سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ ... سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔ انسان کا اصلی عیش دماغ کا ہے، جسم کا نہیں ... وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سروسامان کو ہمیشہ اپنے سے باہر ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو معلوم ... ہو جائے گا کہ وہ ہم سے باہر ...

[illegible] ایک اور جگہ :

[illegible] میری کامرانی کا راز کیا ہے ؟ میں اپنے دل کو مرنے [illegible] کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ [illegible] اس میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی۔

[illegible] کہ دلِ زندہ تو نہ مر جائے ۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دیکھا آپ نے اس مردِ خدا کو، جس کی بدولت اس کی ذات کے [illegible] دنیاوی سرو سامان کے بغیر بھی غنی تھا [illegible] اگر کرسیٔ وزارت یا کانگریس کی صدارت یا [illegible] دنیاوی اعزاز چھین لئے جاتے [illegible] وہ اتنا ہی بلند، اتنا ہی باوقار، اتنا ہی عہد آفریں ثابت ہوتا۔

[illegible] ہیں یہ لوگ ۔ سن رکھو تم فسانہ ہیں یہ لوگ

کبھی کبھی دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے (کاش غلط ہو) کہ اب ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، کم سے کم آسانی سے نہیں !

(بہ شکریہ اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

آل احمد سرور

اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد

اردو نثر میں مولانا آزاد کے اجتہاد کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے غالب کی مثال ذہن میں رکھنی ہوگی۔ غالب کو اپنی منزل تک پہونچنے کے لئے کئی راستوں سے گزرنا پڑا۔ بیدل کی آمریت سے غالب آخر میں آزاد ہو گئے مگر بیدل کو جذب کر گئے۔ دوسرے الفاظ میں غالب کو سمجھنے کے لئے بیدل کے اثر کی انقلابی اہمیت کو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اسی طرح غالب کے اردو خطوط کی سادہ پرکاری کے پیچھے فارسی انشا پردازی کا ایک عمر کا ریاض اور الفاظ پر فتح پانے کی ایک طویل داستان ہے۔ غالب گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج تھے اور اپنے آپ کو عندلیب گلشن نا آفرید کہتے تھے۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی یہی صورت ملتی ہے۔ دونوں کی انفرادیت شاہراہ عام سے ہٹ کر چلتی ہے، دونوں کے یہاں انانیت ہے۔ دونوں کی منزل کو سمجھنے کے لئے ان کے آغاز سفر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہے کہ غالب نے جہاں اقبال کو متاثر کیا وہاں ابوالکلام آزاد کو بھی۔ یہ اثر صرف غالب کے اشعار کا حوالہ دینے تک محدود نہیں ہے۔ مولانا کی پوری ادبی شخصیت میں بھی اس کا پرتو نظر آجاتا ہے۔

سرسید کی تحریک نے اردو ادب کو مغرب کی عقلیت سے آگاہ کیا، مولانا سرسید کی سیاست سے الگ رہے، مگر ان کی حریت فکر کی نشوونما میں سرسید کا بڑا ہاتھ ہے۔ سرسید جدید اردو نثر کے معمار اعظم ہیں۔ لیکن سرسید کا اثر صرف ان کے اسلوب کی تقلید تک نہیں ہے۔ مولانا کی ابتدائی تربیت قدیم ماحول میں ہوئی مگر قدیم فکر کے دائرے سے سرسید کی تصانیف نے نکالا۔ سرسید کے اثر سے اردو ادب کے چمن میں بہت سے

کیلئے، حالی نے مرغن غذاؤں کے شیدائی کو دال کھچڑی اور بے نمک سالن کی غذائیت [illegible]
متوجہ کیا، نذیر احمد نے ان سے اصلاح [illegible] رموز سیکھے۔ مولوی شبلی کو انشو [illegible]
علامہ شبلی بنا [illegible] کا اثر ایک [illegible] میں [illegible]
[illegible] میدان میں، الہلال اور البلاغ کے اوراق میں، ادب لطیف کے میدان میں
سجاد حیدر کے خارستان اور نیاز فتح پوری اور ان کے نگارستان میں، شاعری میں ایک
[illegible] دوسری طرف عظمت اللہ خاں کے سریلے بولوں میں دیکھے جا سکتے
[illegible]

[illegible] سے پہلے شاعری اور مرصع کاری کے زیور کے بغیر اپنے حسن کی
نمائش نہیں کر سکتی تھی سرسید نے اس پر زور دیا کہ حسن ذاتی تکلف سے بری ہے اور نثر کو
[illegible] زیور کی ضرورت نہیں، مگر نئی مشرقیت جو تقدیر امم کا مطالعہ کر رہی تھی اور ایک طرف
علوم جدیدہ سے اثر قبول کر رہی تھی اور دوسری طرف اپنے ماضی کا نئے سرے سے جائزہ
لے رہی تھی صرف ایک سادہ اسلوب میں اپنے آپ کو مقید نہیں کر سکتی تھی، اس میں ایک
روحانی جوش اور ولولہ تھا اور یہ روحانی ولولہ اپنے موضوع کے مطابق اپنے لئے عربی کی
اصطلاحیں، فارسی کی ترکیبیں یا انگریزی کے خیالات حسب موقع اپنے کام میں لانے پر مجبور
تھا۔ مولانا آزاد کی بنیادی حیثیت ایک مفکر کی ہے یہ مفکر خلوت پسند ہوتا ہے۔ فکر اپنے
اظہار کے [illegible] علمی اصطلاحات لانے پر مجبور رہے۔ مولانا کے یہاں عربی کی اصطلاحات
اسی وجہ سے [illegible] پھر مولانا ایک بہت بڑے خطیب بھی ہیں، خطابت کے لئے رجزیہ لہجہ
ضروری ہے اور سید عبد اللہ نے الہلال کے مضامین کو رجز غلط نہیں کہا ہے۔ پھر مولانا
ایک [illegible] ت ہنگامی واقعات کو بھی آفاقی رنگ دینے پر مجبور رہے۔ ان
[illegible] ں کی مدد سے الہلال اور البلاغ کے مصنف کا کارنامہ سمجھ میں آ جائے گا۔ یہ
[illegible] سرسید اور حالی کی سادہ نثر سے مختلف ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ نثر کا

بہترین نمونہ نہیں ہے۔ مگر اس میں علمی ... سی، مذہبی، تہذیبی موضوعات ... عالمانہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جلال ہے جس میں دلبری و قاہری لیے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک پیمبرانہ انداز ہے جو حق اور باطل، سود و زیاں، نور و ظلمت، صراط مستقیم اور ضلالت کی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ الہلال مولانا کے تربیتی دور (Apprenticeship) کو ظاہر کرتا ہے یہ ترجمان القرآن کی پرواز کے لئے پر تولنے کے مترادف ہے۔ صحافت خطابت سے دامن نہیں بچا سکتی مگر سنجیدہ تصنیف میں خطابت بے جوڑ ہوتی ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا کی نثر کی دوسری منزل ملتی ہے جس میں علمی نثر نے ایک پرسوز تخیل کے سہارے شگفتگی پائی ہے اور غزل کے شوخ اشعار کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتی ہے تا کہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے ترجمان کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ غالب کی انفرادیت اس دور میں رنگ بہار ایجادی بیدل کی مرہون منت نہیں رہی اس نے اپنی راہ پالی ہے۔ مولانا کی حکمت اب خطابت کے طوفان نہیں اٹھاتی، ہاں شعریت کی ہلکی سی موجیں ضرور پیدا کرتی ہے موضوع کی رعایت سے انداز بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں ایک جمالیاتی حس ہے جس کی وجہ سے ایک رعنائی پیدا ہو گئی ہے۔ مفکر کو اظہار خیال کے لئے وسیع میدان ملا ہے، مگر مفکر ذوق جمال رکھتا ہے اس لئے فکر کے پہاڑ نہیں لڑھکاتا ہاں اس کی آب و تاب دکھاتا ہے۔ یہاں صحافت نہیں ہے کہ طوفانی کیفیت پیدا کرے، یہاں ازلی اور ابدی صداقتوں کی تشریح ہے جن کے لئے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نے اس طرح اردو نثر کو برگزیدگی عطا کی ہے۔ سجاد انصاری نے جب کہا تھا کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس کے لئے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی تو ان کا اشارہ اسی برگزیدگی کی طرف تھا۔

لیکن مولانا صرف مفکر یا خطیب یا صحافی ہی نہیں تھے۔ سیاست بھی ان کی زندگی میں بڑا اہم درجہ رکھتی تھی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریک غالب تھی۔ سیاست [illegible] میں سرسید کی سیاست کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہا۔ مگر سرسید کے اسلوب کے [illegible] ان پر واضح کر دیئے۔ چنانچہ رام گڑھ کے خطبے میں ہی ہمیں ان کے اسلوب میں ایک اور ارتقائی مقام ملتا ہے جس سے یہ بات [illegible] ہے کہ الہلال صرف اپنی خطابت کی وجہ سے مقبول نہیں ہوا تھا [illegible] ترجمان القرآن اپنی حکیمانہ نکتہ سنجی اور شگفتگی کی وجہ سے، بلکہ دونوں کے پیچھے ایک بیدار ذہن کی روشنی، ایک پرسوز شخصیت کا گداز، ایک ہمہ گیر مزاج کا شعلۂ طور اور ایک مقدس آتش کی چنگاری تھی جسے خلوت کی تنہائیوں نے ہوا دی تھی اور جو ہجوم میں ان کی رفیق رہتی تھی۔

[illegible] بارِ خاطر کا فرق [illegible] سرائی اس وجہ سے ان کے اسلوب کی ارتقائی شکل کو ظاہر کرتا ہے۔ [illegible] کی خطابت [illegible] ناپنے کی ضرورت نہیں، اس میں وہ اصل اپنے [illegible] تذکرے کی [illegible] ہے۔ [illegible] ادب کی بحث ہو یا داستان بے ستون و کوہکن، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا پھولوں کی بہار کا تذکرہ، موسیقی کے اثرات کی تفصیل ہو یا صلیبی معرکوں کی حکایتیں [illegible] میں مولانا آزاد کا اسلوب ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح ہے، مگر اس کی دلکشی اور دلآویزی [illegible] سمجھنا ہے تو الہلال کے اسلوب کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔

جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی، وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے [illegible] ریزہ دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت دونوں کو اردو میں سمو لینا۔ اور اردو کو عربی اور فارسی [illegible] کلام سے [illegible] معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہو گیا اور اقبال [illegible] سے۔ اب اردو نثر کی ترقی کے لئے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی [illegible] مگر ابھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے [illegible] کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس وجہ سے ابوالکلام آزاد کے جوش قدح سے بزمِ ادب [illegible] چراغاں رہے گا۔

(بہ شکریہ اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

انور صدیقی

جدید شاعری کے کچھ مسائل

[illegible] کی زبانوں میں اردو حساس ترین زبان ہے (اس بات کے کہنے میں جو اعتماد ہے [illegible] [illegible] یہ ہے کہ میں دوسری ملکی زبانوں سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتا)۔ آج کا اردو ادب بہت سی حشر خیز تبدیلیوں سے دوچار ہے۔ تبدیلیاں پہلے بھی آئی ہیں مگر آج ان کی رفتار اور شدت کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ہمارا پورا ادب اس وقت ایک زبردست تبدیلی کی گرفت میں ہے، یہ تبدیلی [illegible] نئے پن کی تلاش کا نام نہیں ہے اس کی پشت پر وہ کائناتی اور تہذیبی تصورات ہیں جو لمحہ لمحہ بدل رہے ہیں۔ فرد اور سماج کے روایتی تصورات ٹوٹ رہے ہیں، زرعی تہذیب کے جمالیاتی تصورات اپنی تمام تر شادابیوں کے ساتھ رخصت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ صنعتی زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ اگر پورے طور پر سامنے نہیں آئی ہے تو رفتہ رفتہ سامنے ضرور آ رہی ہے۔ آدرشوں اور عقیدوں کی شکست و ریخت کا بے رحم عمل ہر طرف جاری ہے۔ خوابوں کے عظیم محل زمیں بوس ہو رہے ہیں۔ مشترک فکر و احساس کی ساری قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ خارجی دنیا میں انسان [illegible] اسے تہذیبی پیچیدگی بخشی ہے [illegible] اس پیچیدگی سے اکتا کر اپنے اندر کی پراسرار دنیا کا محبس بن گیا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کی عکاسی اردو کا نیا ادب کر رہا ہے اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے میں۔ یہ صورت حال کس قدر المناک ہے اس کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کی نظر میں مغربی تہذیب کے مرگ آفریں زوال کے سارے نقوش ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم آج اسی منزل کی طرف ترقی کے فریب کے سہارے چلے جا رہے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہے کہ ہم ایک ایسے مقتل کی طرف جا رہے ہیں جہاں موت بھی اپنی گزشتہ عظمت [illegible]

[illegible] مفہوم سے محروم ہو چکی ہے۔ آج کے اردو ادیبوں نے جدید زندگی کے المیے کو کسی [illegible] بڑی حد تک مغربی ادب اور فلسفے کی وساطت سے سمجھ لیا ہے۔ اس طرح ہمارا نیا شاعر ایک بین الاقوامی [illegible] کا شاعر ہے۔ یہ [illegible] المناک صورت حال کا اظہار کیا ہے اور اس اظہار میں وہ اپنی فنی روایات سے کس حد تک وفادار رہے ہیں یا غیر شعوری طور پر احساس میں [illegible] اظہار نہ تو سارے کا سارا مخلصانہ ہے اور نہ ہی غیر مخلصانہ۔ آپ کو اکثریت ایسی نظموں اور غزلوں کی ملے گی جن میں جذبہ بھی اکتسابی ہے اور طرزِ اظہار بھی۔ اور کہیں کہیں جذبے [illegible] اس [illegible] ہے کہ ناخوشگوار ابہام کا احساس ہونے لگتا ہے مگر یہ کہنا کہ جدید شعراء کی تمام [illegible] بے معنی ہیں، بے بصری ہے۔ سچ یہ ہے کہ نئی شاعری اس عہد کے بیشتر لوگوں کے لئے [illegible] مبہم ہوتی ہے۔ فرانس میں میلارمے، رمبو اور دوسرے علامت پسندوں کی شاعری ان کے ہم عصروں کے لئے مبہم سے زیادہ مہمل معلوم ہوتی تھی مگر آج کے پڑھنے والوں کے لئے ان کی شاعری اپنی تہہ داری کے باوجود بامعنی معلوم ہوتی ہے۔ انگلستان میں ایلیٹ کی شاعری کسی زمانے میں مشکل بھی تھی اور مبہم بھی۔ آج ایلیٹ کے رمز آشناؤں کی کمی نہیں۔ ہمارے ہاں نئی شاعری کے نام پر بہت کچھ خام اور ادھ کچری چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ چونکانے اور سنسنی خیزی کا بھی رجحان ملے گا۔ [illegible] تشدد کا بھی احساس ہوگا۔ یہ سب کچھ ہر ادبی رجحان یا تحریک کے اولین علمبرداروں میں ہوتا ہے۔ علی گڑھ تحریک میں بھی ایسا ہوا ہے، ترقی پسند بھی اس کے شکار رہے ہیں، نئی شاعری کے ولی دکنی، میراجی اور حلقۂ ارباب ذوق کے دوسرے فنکاروں میں بھی کچھ اسی طرح کی افراط و تفریط ملتی ہے۔ اگر نئے شعراء میں کچھ ایسے ہیں جو بے راہ رو ہیں تو ہمیں دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ راہ پر نہ آئیں گے تو زمانہ انھیں گردِ فراموشی کا کفن پہنا دے گا۔

اردو کی نئی شاعری پچھلی شاعری سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔ ہماری گزشتہ شاعری (بالخصوص سرسید تحریک کے بعد سے) افادی نقطۂ نظر کی حامل رہی ہے۔ شاعری کی حیثیت وسیلے کی رہی ہے، اس سے کبھی اصلاح کا کام لیا گیا، کبھی انقلاب کا، کبھی کسی نظریے کے ہراول دستے [illegible]

سکا اور کبھی کام سدھار سکا۔ [illegible] اس کے حکم بردار شاعری سے اس طرح کے کام لینے کے
قائل نہیں ہیں۔ وہ شاعری کو اس کا جائز منصب دلانا چاہتے ہیں، وہ اسے [illegible] سماجی مقصد کی چاکری
[illegible] ذات کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری اپنی لطیف ترین شکل میں
صرف اظہار ذات ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ کیا اس طرح کے اظہار میں بالواسطہ طور پر ہی
دوسری سماجی اور تہذیبی صداقتوں کا اظہار نہیں ہو جاتا؟ دراصل نئی شاعری فرد پر زور دیتی ہے
اس کی شخصیت کو کائنات [illegible] تصور کرتی ہے۔ شاعری اسی کائنات اصغر کے وسیلے سے سب کچھ
سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہے۔ اس کائنات کے اپنے کرب، اپنے غم اور اپنے خواب ہوتے ہیں۔ خارجی
کائنات اس کائنات پر مسلسل حاوی رہتی ہے اور اسے اس کی انفرادیت سے محروم کرنے کے درپے
رہتی ہے اسی ٹکراؤ یا کشمکش سے شاعری جنم لیتی ہے۔ اسی وجہ سے آج کی مغربی شاعری پڑھ کر یہ محسوس
ہوتا ہے کہ شاعر ایک ایسے قلعے میں محصور ہے جس کے باہر نا آشنا فوجیں خیمہ زن ہیں۔ فرانسیسی
انحطاط پسند شاعر ورلین نے کہا تھا کہ "دنیا نے ہمیں جلاوطن کر دیا ہے اور اب ہم دنیا کو جلاوطن
کرتے ہیں۔" آج کا شاعر ہجوم کے فلسفوں خواہ جمہوری مساوات کا فلسفہ ہو یا پرولتاری طبقے کی آمریت
کا فلسفہ سب کو اپنی انفرادیت کے لئے ایک خطرہ سمجھتا ہے اسی لئے وہ سماجی پس منظر سے کٹ کر شعر گوئی
کرتا ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے اس کی کیفیات میں شریک ہوں۔ سوشلسٹ ملکوں کو چھوڑ کر
جہاں بھی آج شاعری ہو رہی ہے اس میں یہی ہجوم دشمن رجحان کارفرما ہے، یورپ میں پہلی جنگ عظیم
کے بعد سے ہی شاعری کی عوامی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ وہاں اس رجحان کی مختلف سماجی اور تہذیبی وجوہات
ہیں) ایک روایت ہے جس کے فروغ میں علامت پسندی، پیکر پرستی، سوریلزم (Surrealism)
اور [illegible] ([illegible]) ایسی تحریکوں یا رجحانوں کا ہاتھ ہے۔ اردو
میں اس طرح کے رویوں کی روایت ابھی بالکل نئی ہے اس وجہ سے ہمیں آج کی اردو شاعری کو پڑھ کر
الجھن محسوس ہوتی ہے اور ہم یا تو لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں یا قبر [illegible] نئی شاعری کے یہ
رجحانات دراصل ردعمل ہیں ترقی پسندی کی افادیت پرستی اور ادب کو سماج کے دستاویز کی حیثیت

[illegible] میکانکی رویے کے خلاف جس [illegible] اقبال کی سطحی رجائیت بھی تھی اور اختر شیرانی کی نسل کی جاہی لیتی ہوئی رومانیت بھی۔ ابتدائی ردّعمل میں توازن نہیں ہوتا۔ ہمارے نئے شعراء [illegible] میں اپنے گزشتہ شعراء کو بہت کچھ کہہ سنا دیے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے لہجے میں زہرناکی اور تلخی بھی [illegible] مگر کیا کیا جائے ہر ادبی نسل پرکھ کے کچھ نئے اصول لیکر آتی ہے اور جب پچھلے زمانے کا جائزہ لیتی ہے تو کچھ بت ٹوٹتے بھی [illegible] ہے۔ آج ہمارے شعراء کی نئی نسل جہاں ایک طرف سردار جعفری جیسے شعراء [illegible] ہیں دوسری طرف اس نے میراجی کی بازیافت بھی کی ہے اور ان کے یہاں بہت سے ایسے عناصر بھی تلاش کئے ہیں جن سے ان کا ذہنی رشتہ ہے۔ انگلستان میں ایلیٹ اور یزرا پاونڈ کی نسل نے انیسویں صدی کے رومانی شعراء کے فنّی، ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی میلانوں کے خلاف بغاوت کی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ سترہویں صدی کے ان شعراء کے احیاء میں معاون ثابت ہوئی جن کے موضوعات محض مابعد الطبیعی تصورات ہوتے تھے اور جن کی ایلزبیتھی شاعری سے بغاوت [illegible] نے اپنی روح کی بغاوت کا عکس دیکھا۔

پرانے شعراء زندگی اور تہذیب سے ہم آہنگی کے نغمہ گر تھے، آج کے شاعر اس ہم آہنگی کی شکست کے نوحہ گر ہیں۔ پرانی صدیوں میں مذاہب اور سماجی تصورات کی وجہ سے عقائد کا اشتراک تھا۔ شاعر [illegible] فکری نظام تہذیب یا سماج سے الگ نہ تھا۔ فنی اظہار کے سانچے مشترک تھے، علامتیں، تلمیحیں اور [illegible] مشترک تھے۔ طرز احساس میں یکرنگی تھی۔ شاعر کے لئے سچائی کی تلاش کا کام مشکل نہ تھا وہ مشترک عقائد کی بیساکھیوں پر چل سکتا تھا۔ وہ جو کچھ لکھتا یا کہتا تھا اس میں پوری تہذیب شریک ہوتی تھی اور علامتیں یا تمثیلیں سب لوگ سمجھتے تھے۔ عظیم شاعری کے لئے ایسے دور ہمیشہ سازگار رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے انسان کا المیہ یہی ہے کہ عقائد کا وہ سرمایہ جس نے صدیوں تہذیبوں کی شیرازہ بندی [illegible] ہوئے نظام ابھرے انھوں نے کچھ خواب تو دکھائے مگر جلد ہی ان کا جادو ٹوٹ گیا۔ وہ فرد کو اس کی انفرادیت نہ بخش سکے۔ نتیجے کے طور پر آج کا [illegible] میں اجتماعی [illegible] کا [illegible] ۔ ہر فرد اپنے طور پر اپنی نجات کا طالب ہے۔ وہ اب ایسے

وسیلوں سے زندگی کو دیکھ بھی نہیں سکتا جو اس کی اپنی طینت وطبیعت کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ شخص
[illegible] بن رہا ہے جس کے شعلوں کا رنگ بھی دوسرے کے جہنموں کے شعلوں کے رنگ سے
الگ ہے اس کے کرب کی نوعیت بھی دوسروں کے کرب سے مختلف ہے، اس کی بے کیفی و دوسروں
کی بے کیفی سے میل نہیں کھاتی۔ ایسا شخص اگر شاعر ہے تو وہ کیا کرے۔ اس کی روح کا کرب اظہار
چاہتا ہے۔ وہ لفظوں کا سہارا لیتا ہے ایسے لفظوں کا جن کے دامن سے صدیوں کے تلازموں کی گرد
[illegible] کا سہارا لیتا ہے، مگر علامتوں کا بھی طویل ماضی ہے، ان کا بھی مانوس
جہان معنی ہے۔ ایسے لفظوں اور ایسی عجیب الطرفین علامتوں کے استعمال کے بعد کیا شاعر کا تجربہ
اپنی ابتدائی یا اولیں تازگی باقی رکھ سکتا ہے۔ کیا اس طرح اس کے محسوسات دوسروں کے محسوسات
میں ضم نہ ہو جائیں گے؟ محسوسات یا تجربات کے ضم ہونے کے بعد شاعر کی انفرادیت کا کیا ہوگا۔
ان خطروں سے بچنے کی خاطر وہ اپنی علامتیں، وضع کرتا ہے۔ مروجہ شعری زبان سے گریز کرتا ہے،
اسی لئے جدید شاعری کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے کہ یہ اپنی پہچان کو باقی رکھنے کی کربناک کوشش کا
نام ہے۔ کربناک یوں کہ یہ بڑا ہی مشکل کام ہے اس میں ابلاغ کا بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور
کربناک یوں بھی کہ ایک فرد دشمن تہذیب میں اپنی پہچان کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرنا مصلوب ہونے
سے کم نہیں ہے، اکثر اس کوشش کا انجام فرد کی تنہائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ
ہے کہ نئی شاعری کی لے المیہ ہے، اس میں نہ تو پچھلی شاعری کی سرمستی ہے اور نہ سرشاری، نہ جمالیاتی
کیف ہے نہ شادابی ـــ اور پھر زندگی ہی میں یہ چیزیں کہاں رہ گئی ہیں؟

ہماری اپنی شاعری کا اب تک جو مزاج رہا ہے یا جس تمدنی مواد کا ہماری شاعری اظہار کرتی
رہی ہے یا ہماری شعری علامتوں یا خیالی پیکروں کی جو فضا رہی ہے وہ جاگیردارانہ ماضی کے [illegible]
افسانہ وافسوں سے ہم کنار ہے۔ وہ صرف ایک مخصوص انداز کے جمالیاتی تجربے کے اظہار پر قادر
رہی ہے۔ حسن کے اظہار کے لئے فارسی کے بعد غالباً اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے اندر
بے شمار اسالیب رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی نحو و دروبست میں ایک طرح کا پھیلا پن اور ہمواری

زندگی کے تاریک تر یا بدہیئت مظاہر کی عکاسی جب بھی ہمارے شعراء نے کوشش کی ہے تو اس کے نتیجے میں بدہیئتی یا بدصورتی کے تاثر کے بجائے غیر متوقع طور پر حسن کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ صنعتی زندگی نے جہاں ایک طرف زندگی کو تزئین کی ... دوسری طرف اس نے انسان کی زندگی کو ... سے انتہائی کھردرا ... ویران بنا کر رکھ دیا ہے، خارجی زندگی کے مظاہر میں بھی ... اور تناسب ... ہے ... صنعتی ... شہروں میں جس طرح زندگی ... بے کیف اور ... ایسی نئی صورت حال ہے جس کی عکاسی یا اظہار کی ذمہ داری نئے شعراء نے لی ہے۔ اظہار کے پرانے سانچے یا اسالیب اپنے تمدنی مواد کی وجہ سے نئے شاعر کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں ــــ وہ ایک نئی صورتِ حال کو نئی اور بعض حالات میں نئی زبان کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے۔ یہ کوشش ابھی ناتمام ہے اور اسی ناتمامی کی وجہ سے ... الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی نئے شعراء کی کوششوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے اندازِ بیان کی تلاش میں ہیں۔

یہ بات فراموش کرنے کی نہیں کہ نئی شاعری ابھی تشکیلی مرحلے سے گزر رہی ہے، لسانی، فنی اور ... سطح پر بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے حل میں وہ ابھی کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ وہ ابھی منفی ردعمل کا شکار ہے مثبت اقدار کی طرف اس کے قدم نہیں بڑھ سکے ہیں۔ ذات کی شاعری بھی بڑی ... ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے فن کار کو اپنی ذات کی توسیع کرنی ہوتی ہے، ہمارے شعراء اظہارِ ذات کا کام انجام دے رہے ہیں مگر یہ ذات انتہائی شکست خوردہ، زخمی اور کچلی ہوئی ہے۔ بڑا فن کار زندگی کی پیچیدگیوں سے دبتا نہیں وہ انھیں اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے منظم کرتا ہے اور وحدت بخشتا ہے۔ ہمارے نئے شعراء تہذیب کی پیچیدگی اور مزاج کو مناسب اور متوازن شکل دینے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے ہیں بعض اوقات کچھ یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعراء اپنے آپ کو اور دنیا کو بیمار سمجھ کر شعر کہہ رہے ہوں۔ اسی وجہ سے ہماری نئی شاعری میں ابھی تلخی، خود ترسی اور کلبیت نمایاں ہے۔ مغرب کی نئی شاعری میں بھی ابتدا کچھ اسی طرح کی اسپتالی فضا تھی مگر آج وہاں کی

Inner Streng[illegible] پیدا ہو گئی ہے۔ تہذیبی بحران کی شاعری بڑی [illegible] وہ اس باطنی قوت کی حامل ہو جاتی جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ [illegible] غالباً صرف ذہنی سطح پر عالمی شاعری کے بہت سے مفروضوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور فرض کر لیا ہے کہ ہمارے ملک میں تہذیبی بحران کی وہی نوعیت ہے جو مغرب میں ہے۔ ہندوستان [illegible] بھی آج بحران سے دوچار ہے اور اس بحران کے نقوش اور مظاہر بالکل وہی نہیں ہو سکتے جیسے کہ یورپ میں ہیں۔ کاش ہمارے نئے شعراء اپنے ردعمل کی ہندوستانی نہج کو پوری فن کاری کے ساتھ پیش کر سکیں۔

"میں کسی نئی ادبی تحریک کو اُس وقت تک عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا جب تک اُس کے علم بردار یہ دعویٰ نہ کریں کہ جو کچھ ان کے عہد میں لکھا جا رہا ہے وہ سب لغو اور بے قدر و قیمت ہے اور جو کچھ اِن سے پہلے لکھا گیا اس کا زیادہ تر حصہ لغو اور بے قدر و قیمت تھا"

—— اسپنڈر

"شاعر غیر وجود سے کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ وجود کو جنم دے۔ ہم سکوت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں تاکہ جواب میں نغمہ سن سکیں۔"

—— اے، میک لیش

چاند نرائن رینہ ہمانند

غزل

[illegible] کی یہ زمیں باقی نہ تاروں کا جہاں باقی
جو کچھ باقی رہے گا تو رہے گا لامکاں باقی

[illegible] دل کی گئی لیکن ابھی بھی حسن [illegible] ہے
[illegible] آتش بجھ گئی لیکن ابھی تک ہے دھواں باقی

[illegible] ہے کاروانِ عشق گو اوجھل نگاہوں سے
ابھی ہے راہِ ہستی میں غبارِ کارواں باقی

جوانی ہی تو تھی روحِ رواں ایوانِ ہستی میں
مکیں جب ہو گیا رخصت تو کیوں ہو یہ مکاں باقی

وہ کیسا سوز تھا نم جس سے اب تک چشمِ عالم ہے
فغاں باقی نہیں لیکن ہے تاثیرِ فغاں باقی

جو ہو شاخِ تخیل پر نہیں ڈر اس کے مٹنے کا
ہزاروں جل گئے لیکن ہے میرا آشیاں باقی

رخِ فطرت سے پردے خود بخود سب اٹھ گئے لیکن
ابھی باریک سا ہے پردۂ چشمِ گماں باقی

[illegible] برسرِ پیکار دنیا کے حوادث سے
ابھی ہے چاند لیکن ایک مرگِ ناگہاں باقی

عبداللطیف اعظمی

یومِ شبلی — ایک رپورتاژ

ہم لوگوں میں — چاہے ہمارا کسی ادبی شعبہ سے یا کسی میدان زندگی سے تعلق ہو — یہ احساس عام ہے کہ ہم اپنے بزرگوں اور رہناؤں کو بھلاتے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ملک و قوم اور اردو زبان و ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے اور جن کی زندگی سے ہمیں بہت کچھ روشنی مل سکتی ہے، ان میں ایک مولانا شبلی بھی ہیں، جن کو یاد رکھنے اور ان کی یاد منانے کی ضرورت ہے۔ شبلی پر تو خیر بہت کچھ لکھا گیا ہے، ان کی ایک مستقل یادگار — دار المصنفین — ہے، جس کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی معیار پر ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، مگر ان کے دور کے دوسرے بزرگوں اور مصنفوں کو تو ہم نے قریب قریب بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت سرسید کی ہے۔ ان کی شخصیت اتنی بڑی اور اہم ہے کہ ان کو بھلانا چاہیں تو بھی نہیں بھلا سکتے۔ مسلم یونیورسٹی میں ان کا ہر سال ۱۷ اکتوبر کو یوم ولادت منایا جاتا ہے اور کم از کم ہفتہ وار ہماری زبان میں اداریہ ضرور لکھا جاتا ہے اور جب تک انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ہے اور ہماری زبان کے مدیر پروفیسر سرور صاحب ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ ضرور باقی رہے گا، البتہ علمی اور تصنیفی لحاظ سے ان کی جتنی عظیم یادگار کی ضرورت تھی، علی گڑھ والوں نے اس طرف توجہ نہیں کی، لیکن حالی پر بہت کم لکھا گیا اور ان کی مستقل کوئی یادگار نہیں ہے۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد کا تو وہ اعتراف بھی نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے اور چراغ علی کو تو موجودہ نسل کے بہت سے لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو ادب کا ماضی سے رشتہ قائم رہے تو پابندی کے ساتھ ان کی یاد منانے کی کوئی صورت نکالنی

امسال علی گڑھ کے ان طالب علموں نے جو اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں، اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن [illegible] ہے اور ان لوگوں [illegible] ہے کہ اعظم گڑھ کے اردو محسنوں کی ہر سال یاد منائیں گے اور ان کی یاد سے اردو زبان و ادب کو کسی نہ کسی طرح فائدہ پہنچانے کی کوش[illegible] گے۔ اس مبارک فیصلے کا آغاز یوم شبلی سے ہوا ہے اگرچہ یہ یوم بہت عجلت میں منایا گیا [illegible] نہیں تھا، جو شبلی کے مرتبہ کے شایان شان ہو، مگر یہی کیا کم ہے کہ ایک اچھے اور مفید کام کی بنیاد پڑ گئی، ان نوجوانوں کے حوصلے اور عزم سے امید ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادے پر استقلال کے ساتھ قائم رہیں گے اور جس مفید کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کو پورا کریں گے۔

یوم شبلی ۲۳ مارچ کو منایا گیا۔ یہ دن نہ تو شبلی کی پیدائش کا ہے اور نہ وفات کا۔ مولانا کا یوم ولادت ۴ مئی ۱۸۵۷ء ہے اور یوم وفات ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء۔ اعظمی ایسوسی ایشن کے کارکن دراصل ۲۵ ویں برسی منانا چاہتے تھے، مگر نومبر میں یونیورسٹی کے حالات نے اجازت نہیں دی، دوسری صورت یہ تھی کہ مئی میں ۱۲۵ ویں سالگرہ منائی جائے، مگر یہ زمانہ امتحان کا ہوگا، جو طالب علموں کے لحاظ سے موزوں نہیں، اس لیے کسی موقع اور مناسبت کا خیال کئے بغیر یہ یوم منا لیا گیا، آئندہ کوشش یہی ہوگی کہ نومبر میں پابندی سے برسی منائی جائے اور اس موقع پر جو مقالے پڑھے جائیں ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

یوم شبلی کا یہ جلسہ یونین کے ہال میں منعقد ہوا، جس میں بارہا شبلی کے خیر مقدم میں جلسے ہوئے تھے اور شبلی نے بارہا تقریریں کی تھیں اور اپنی پراثر آواز اور لہجے میں نظمیں سنائیں اور قصیدے پیش کئے تھے۔ ظاہر ہے یہ اور ہال رہا ہوگا، مگر تھا یونیورسٹی کی یونین کا، اس لیے یونین کے ہال میں یوم شبلی منایا گیا تو شبلی کا دور تازہ ہوگیا اور اس وقت کے مناظر، جو ہمیں کتابوں اور مضامین سے معلوم ہوئے ہیں [illegible] میں پھر گئے۔ جلسے کی صدارت اردو کے ایک سنجیدہ اور نامور محقق ڈاکٹر نذیر [illegible] نے فرمائی۔ تلاوت قرآن حکیم کے بعد سب سے پہلے ایسوسی ایشن

صدر شہاب الدین صاحب نے ایک مختصر خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں موصوف نے ایسوسی ایشن کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور شبلی کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا، آیندہ سال اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر یوم شبلی منانے اور اعظم گڈھ کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا یوم منانے کا وعدہ کیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہ یہ انجمن گروہ بندیوں اور علاقائی تعصبات سے الگ رہے گی موصوف نے فرمایا:

"ہماری ایسوسی ایشن کوئی سیاسی ایسوسی ایشن نہیں ہے اور نہ یہ کوئی وقتی گروہ بندی ہے، بلکہ یہ ایک ادبی اور رفاہی انجمن ہے جو علاقائی ہوتے ہوئے بھی علاقائی تعصب اور تنگ نظری کی دنیا سے کوسوں دور ہے، اس کی منزل مقصود انسانیت اور ادب کی معراج ہے، اس کے مقاصد اس آفتاب کی مانند روشن اور ہمہ گیر ہیں جو طلوع ہوتا ہے بہ حیثیت مشرق سے، مگر شش جہت کو یکبارگی نور بنا دیتا ہے۔ ہماری یہ ایسوسی ایشن

"جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا"

کے اصول پر بنائی گئی ہے۔"

اس خطبے کے بعد، فارسی کے ایک ریسرچ اسکالر جناب کبیر احمد جائسی صاحب نے "باغی شبلی" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون پڑھا، جس میں انھوں نے فرمایا کہ "جب ہم علامہ شبلی کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ان کی پوری کی پوری زندگی بغاوت اور جنگ جوئی کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔" انھوں نے شبلی کے سوانح نگاروں سے شکایت کی ہے کہ انھوں نے ان کے بچپن کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر نہیں کیا ہے، جن سے پتہ چل سکے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے شبلی کی باغیانہ طبیعت کا کیا رنگ تھا؟ ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ علامہ شبلی نے مولانا فاروق چریاکوٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، لیکن ہم اس بات سے لاعلم ہیں کہ ذہین شاگرد اور فاضل استاد میں کس نوع کی گفتگو ہوتی تھی اور ان کو سمجھانے کے لیے استاد کو کتنی کد و کاوش سے کام لینا

پڑتا تھا۔" گھریلو بغاوتوں کا ذکر کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار [illegible] یا کہ جہاں تک اپنے تما[illegible] سے ان کی بغاوت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں بلا تکلف یہ [illegible] ہے کہ ان کی زندگی کا ایک [illegible] بغاوت کی داستان سرا[illegible] مذہب، سیاست، ادب، بود و باش، [illegible] زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جہاں [illegible] بغاوت کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔" مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

"شبلی کی باغیانہ زندگی کا سب سے دلچسپ باب اس کا اختتام [illegible] باغی جب تمام دنیا سے جنگ کرتا، وقت کی مروّج قدروں کی نفی کرتا، اس آستانۂ پاک تک پہنچا جس کو ہم سب [illegible] کا آستانہ کہتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھا:

[illegible] مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

خدا ایسی بغاوت اور بغاوت کا ایسا انجام سب کو نصیب کرے۔"

اس مختصر مضمون کے بعد، ہفتہ وار الجمعیۃ کے اڈیٹر مولوی وحید الدین خاں صاحب نے "مولانا شبلی اور علی گڑھ" کے عنوان سے ایک طویل اور مبسوط مضمون پڑھا۔ "مولانا شبلی (۱۹۱۴ — ۱۸۵۷) کا تعلق علی گڑھ سے [illegible] میں قائم ہوا۔" فاضل مضمون نگار نے یہ بیان کرنے کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "حیات شبلی" سے حسب ذیل طویل اقتباس پیش کرکے یہ دکھلایا کہ علی گڑھ کی زندگی میں مولانا کو کتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا:

"ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشیں عالم، جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں [illegible] انگریزی کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تمدن و تہذیب کے سایے میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح [illegible] کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا... مولانا شبلی کا یہ حال تھا کہ وہ ہر محفل پر چھائے رہتے تھے اور علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا۔ انہوں

نے نہ صرف اپنی ملک علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھایا اور قدیم علوم و فنون کے مرتبے کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کیا [illegible] میں جبکہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور [illegible] ہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھے کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔"

(حیات شبلی صفحہ ۱۴۸)

اس اقتباس کے بعد فاضل مضمون نگار نے فرمایا:

"شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناں گوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجہ میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، کالج کے ہر جلسے اور تقریب میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جزو ہوتی تھی۔"

شبلی کی وسیع تر سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد فاضل مضمون نگار نے اپنے طویل مضمون کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

"مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ شبلی کو علی گڑھ کا بہترین انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گذرے وہ ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔ شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی، جس کا وہ اس وقت بے حد محتاج تھا، اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید عرفان دیا، جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان

اسلامی شخصیت ابھر سکی، جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے "عہد جدید کا معلم اول" [illegible]
[illegible] گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو
وجود میں لاسکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں، جس نے دارالعلوم
[illegible] کی بنیاد رکھی مجو دارالمصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا [illegible]
[illegible] نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ ہیجان اور شعور دیا، جو آج بھی جدید پر قدیم کو
[illegible] کرنے کی امانت اپنے سینوں میں لیے ہوئے ہے۔ زمانہ کی وقتی قدروں پر
اسلام کی دائمی قدروں کو بالا کرنے کے لیے بے چین ہے۔ جس طرح علی گڑھ [illegible]
ہے اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک [illegible]
گے جس طرح وہ ماضی میں ملے تھے۔"

اس کے بعد راقم الحروف کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ میں نے اس معذرت کے بعد کہ وقت کی تنگی اور اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکا، اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو یوم شبلی کے انعقاد پر مبارکباد دی اور اپنا غیر مشروط تعاون پیش کیا۔ میں نے عرض کیا کہ نہ تو میں اس کا قائل ہوں:

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضان تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے

(اقبال سہیل)

جیسا کہ ایسوسی ایشن کے مطبوعہ ہینڈبل میں کہا گیا ہے اور نہ شبلی کی عظمت اور خدمات کے اعتراف کے لیے ان کے ہم عصروں کی تنقیص کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنی کتاب "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں" محمد حسین آزاد، حالی اور نذیر احمد دہلوی سے مقابلہ کرکے شبلی کا مرتبہ متعین کرنے [illegible] ہے مگر یہ دور طالب علمی کے جوش کا نتیجہ ہے، اب اس طریقے کو اچھا نہیں سمجھتا۔
[illegible] یوم شبلی کے منتظمین کو مبارکباد دی کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے ایک بڑے فرض کو

پورا کرنے کی کوشش کی۔ یوں تو شبلی کے احسان اور ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، مگر مسلم یونیورسٹی سے ان کا جتنا گہرا اور دیرپا تعلق رہا ہے، اس کی بنا پر مسلم یونیورسٹی خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ شبلی نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا ہے، اتنا دیا کہ اس کے احسان سے عہدہ برا ہونا آسان نہیں اور سرسید کی اور سرسید کی تحریک کی حمایت کی ہے مدد کی ہے، دامے درمے سخنے ہر طرح۔ انھوں نے اپنے بعض رسالوں اور کتابوں کو جو بہت مقبول تھیں، یونیورسٹی کو دے دیا تھا، جس کا سرسید نے بڑی احسان مندی کے ساتھ ذکر کیا ہے، شبلی کی ایک مثنوی "صبح امید" ہے، جس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادب اردو" میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب ایک زمانہ میں اس قدر مقبول اور علی گڑھ کالج کے طلبا کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔" اس مثنوی میں شبلی نے سرسید کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں سرسید کی خدمات کی کیا عزت اور قدر تھی۔ ملاحظہ ہو:

وہ کشتۂ قوم وہ فدائی — اٹھا لیے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرض حال کرتا — در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم و ہر انجمن میں پہنچا — ہر باغ میں ہر چمن میں پہنچا
کاوش سے غرض تھی نہ کد سے — ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردانِ خدا پرست سے بھی — رندانِ سیاہ مست سے بھی
ہر زاہد و بادہ خوار سے بھی — ملتا تھا وہ گل سے بھی خار سے بھی

ایسے مخلص خدمت گذار کو قوم نے کیا صلہ دیا ؟ یہ شبلی کی زبان سے سنئے:

حنظل پائے شکر کے بدلے — سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے
لعل اس نے دیے، شرار پائے — گل نذر کیے تو خار پائے

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے سرسید اور شبلی کے اختلافات کو بہت نمایاں کرکے پیش کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ [illegible] کے خیالات [illegible] کے عقائد اور دونوں کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا، مگر پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اتنا فرق نہیں تھا جتنا مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت تھانوی نے [illegible] زندگی میں سرسید کی عظمت اور خدمت کا جس طرح اعتراف کیا [illegible] ساتھ مل کر جس طرح کام کیا ہے اور ان کی شخصیت سے جس [illegible] ہیں اسے ہم ریاکاری اور مصلحت پرستی پر محمول نہیں کرسکتے۔ علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کی اس غیر معمولی محبت، ان کے اس بے پایاں خلوص اور ان کے گہرے تعلقات کی بناپر، علی گڑھ کو شبلی کی خدمات کا جس قدر اور جس طرح اعتراف کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا۔ آج یوم شبلی مناکر اس فرض کو ادا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ قابل صد مبارکباد ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ مستقل رہے گا اور آئندہ اس سے بہتر طور پر یہ دن منایا جائے گا۔

میری تقریر کے بعد مولانا سید اکبرآبادی صاحب نے بڑی پرجوش اور پرمغز تقریر کی۔ موصوف نے شبلی کی ہمہ گیری اور جامعیت بیان کرنے کے بعد، اس پر روشنی ڈالی کہ شبلی اور سرسید میں کیا چیز مشترک تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ دونوں بزرگ دوسرے مسائل میں چاہے جو رائے بھی رکھتے ہوں، مگر "تطبیق پسندی" میں دونوں متفق تھے یعنی مسلمانوں کو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنی چاہیے۔ انھوں نے اُس وقت کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نئے حالات پیدا ہوئے، تمام بنیادی قدریں بدل گئیں، اس انقلاب کا اثر پورے ملک پر پڑا، مگر مسلمان خاص طور پر متاثر ہوئے، یہ اثر اتنا شدید تھا کہ سرسید جیسا عزم وہمت کا آدمی بھی مایوس اور بددل ہوگیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اپنے ملک سے ہجرت کرکے باہر چلا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دو رجحانات بہت نمایاں تھے، ایک یہ کہ نئے حالات کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے، دوسرا یہ کہ حالات سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے، مگر ان دو رجحانات کے علاوہ ایک تیسرا رجحان بھی تھا، وہ یہ کہ حالات کا جائزہ لے کر بنیادی قدروں کی حفاظت کی تدبیریں کی

گئیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء تطبیق چاہتے تھے اور انقلاب کو اپنے لیے مفید بنانا چاہتے تھے

تطبیق کی خواہش اور کوشش میں سرسید اور شبلی بنیادی طور پر ایک ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ سرسید بعض معاملات میں اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور شاید ایسا اس لیے ہوا کہ وہ انقلاب سے براہ راست دوچار ہوئے تھے اور ہمہ گیر تباہ کاریوں کو بچشم خود دیکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت کے احساس کمتری کو دور کر کے، ان میں حالات کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور جذبہ پیدا کیا جائے۔ افسوس کہ سرسید کا قدم جادۂ اعتدال سے کہیں کہیں ہٹ گیا اور تطبیق پیدا کرنے میں مرعوبیت کا شکار ہو گئے، خاص طور پر معاشرتی معاملات میں اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں۔ برخلاف اس کے شبلی ان مراحل سے نہیں گذرے تھے، جن سے سرسید کو گذرنا پڑا تھا، اس لیے شبلی کے احساسات اور جذبات وہ نہیں ہو سکتے تھے جو سرسید کے تھے۔ شبلی نے سرسید کے بنیادی مقاصد سے سو فیصدی اتفاق کیا، وہ نہ صرف سرسید کے موید بلکہ قدرداں تھے، مگر ان قدر دانیوں کے ساتھ شبلی مسلمانوں کی ثقافتی انفرادیت کے بھی قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ مکمل طور پر صحت مند اسی وقت ہو سکتی ہے جب مسلمان قدیم ثقافت سے وابستہ رہتے ہوئے، نئے حالات کو قبول کریں۔ شبلی دراصل قدیم وجدید کے سنگم تھے اور دونوں کو ملانے کی انھوں نے مفید اور کامیاب کوشش کی، شبلی اور سرسید کے باہمی تعلقات اور روابط اتنے گہرے اور مضبوط تھے کہ ایک کی تعریف کرتے وقت دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دونوں نے مل کر مسلمانوں کی خدمت کی ہے اور ہم دونوں کے یکساں طور پر مرہون منت ہیں۔

مولوی فضل الرحمٰن صاحب ندوی نے بھی ایک مختصر مگر دلچسپ تقریر کی تھی، میں ان کی تقریر کے نوٹ نہیں لے سکا تھا، اس لیے اس رپورتاژ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ آخر میں ایک ریسرچ اسکالر جناب شمسی طہرانی صاحب نے "شبلی اور سرسید" پر ایک پرجوش نظم پڑھ کر سنائی، نظم سے زیادہ ان کا لہجہ اور آواز پرجوش تھی۔ انھوں نے اس پر بہت زور دیا کہ انھوں نے یہ نظم علالت کی حالت میں کہی ہے، اس پر مولانا سعید اکبرآبادی صاحب نے فرمایا کہ آپ اکثر بیمار ہوا کریں توانائی پرجوش

نظم سننے کو مل جایا کرے گی۔ موصوف کی نظم بہت طویل ہے، اس لیے معذرت کے ساتھ صرف دو بند پیش کرتا ہوں۔ پوری نظم آٹھ بند پر مشتمل ہے، دوسرا بند ملاحظہ ہو:

جب بے حسی حیات کا مفہوم ہوگئی — جب زندگی نگاہ سے محروم ہوگئی
[illegible]دم ہوگئی — گم ظلمتوں میں امتِ مرحوم ہوگئی

سید کو تجھ سا مردِ خود آگاہ مل گیا
[illegible]یت کا ذہن سے کانٹا نکل گیا

ساتویں بند میں [illegible] اس طرح خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے:

بخشا ہے تو نے شعر و ادب کو وہ بانکپن — تا عہد جن سے ہوگا سرافراز علم و فن
ہر شعبۂ حیات [illegible] ہے ضو فگن — شبنم پہ جیسے صبح کے سورج کی ہو کرن

ابھریں گے زندگی سے اشارے نئے نئے
ٹکرائیں گے نظر سے نظارے نئے نئے

بعض لوگ دوسروں کی اصلاح کے ایسے شائق اور خوگر ہوتے ہیں کہ موقع ہو یا نہ ہو، وہ اپنے مشورے ضرور پیش فرما دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے، جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے، فرمایا، نظر سے [illegible] جاتا تھا۔ میں سوالیہ نشان بن کر ان کی طرف متوجہ ہوا تو برجستہ فرمایا:

دیکھیں گے علم و فن کے نظارے نئے نئے

اس پرجوش اور پراثر نظم کے بعد ایسوسی ایشن کے سکریٹری الطاف احمد صاحب اعظمی نے راہ کی مشکلات اور اپنے عزم و ثبات کا ذکر کیا اور آخر میں محمد نعمان صاحب اعظمی نے مہمانوں اور حاضرین [illegible] کے ایٹ ہوم کا اعلان کیا۔

...انصاری

رفتارِ تعلیم

صدرِ جمہوریہ کے خیالات پبلک اسکولوں کے بارے میں:

میوکالج، اجمیر میں تقسیم انعامات کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے پبلک اسکولوں کے بارے میں بہ حیثیت مجموعی اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور یہ کہا کہ "ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے جبکہ زبان پرستی نے ایسی ناگوار صورت اختیار کرلی ہے اور ڈر ہے کہ ملک کی وحدت کو کہیں نقصان نہ پہنچے، ریاستوں کی باہمی مشترک زندگی کے لئے ان سے بہتر اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔؟"

اسی کے ساتھ جناب صدر نے اس اختلاف کا بھی ذکر کیا کہ "آیا پبلک اسکولوں کو ختم کر دینا چاہیئے یا انھیں باقی رکھنا چاہیئے؟ اس کا بہترین جواب، انھوں نے فرمایا کہ "خود ان اسکولوں کی تعلیم دے سکتی ہے۔ اگر یہ اسکول حقیقت میں اچھی تعلیم دیتے ہیں، لڑکوں کو اچھے عادات واطوار سکھاتے ہیں، انھیں لائق اور اچھے انسان بناتے ہیں جو اپنی سماجی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، ان کے لئے ایسے کام اور مشترک زندگی کے مواقع فراہم کرتے ہیں، جن سے وہ اپنے گرد و پیش کے عوام کو اٹھا سکنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور ان میں ایک سماجی ذمہ داری کا احساس پیدا کرسکتے ہیں، تو پھر انھیں ہرگز ختم نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ طبقاتی اختلافات کو اور بڑھاتے اور انھیں نمایاں کرتے ہیں اور طلبا کو ایسا بناتے ہیں جنھیں اپنی امارت پر گھمنڈ ہو اور وہ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوں، تو پھر انھیں ضرور ختم کر دینا چاہیئے۔"

لیکن انھیں صرف اس وجہ سے بند نہیں کر دینا چاہیئے کہ وہ بہت خرچیلے ہوتے ہیں اور صرف

[illegible] ذریعے سے لوگ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو ان اسکولوں [illegible]۔ اگر ہمارا سماج ہماری [illegible] اسکول مہیا نہیں کر سکتا [illegible] کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو لوگ اپنے بچوں کے لئے اچھی تعلیم چاہتے ہیں، انھیں ایسی تعلیم کا موقع نہ دیا جائے۔"

سہ لسانی [illegible] زبانوں کے مسئلہ کا واحد حل:

کیرالا کے [illegible] ای ایم ایس نمبودری پد نے ابھی حال میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ایک ملاقات کے دوران میں یہ کہا ہے کہ وہ ہندی بولنے والے لوگوں پر یہ زور دیں کہ وہ سہ لسانی فارمولا مان لیں اور اپنی ہٹ کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے اخباری نمائندوں کو بیان دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ زبان کے مسئلہ پر سمجھوتہ کی جو کوشش کی گئی تھی، اسے ہندی بولنے والے لوگوں نے اندر اندر ختم کر دیا۔ اگر وہ اپنی اس ضد پر قائم رہے تو مختلف ریاستوں کے درمیان آج جو رشتہ وحدت ہے وہ ٹوٹ جائے گا اور ہندی بولنے والے لوگ ہمیشہ کے لئے پیچھے رہ جائیں گے۔ چیف منسٹر نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی والے دوسری علاقائی زبانوں کو بھی برابر کا درجہ دیتے بجائے اس کے کہ ان پر ہندی تھوپیں، اور بین الاقوامی معاملات کے لئے انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان کی ضرورت کو سمجھتے تو ہندی آج ہمارے ہندوستان میں ایک متحدہ زبان کی حیثیت سے رفتہ رفتہ تسلیم کر لی گئی ہوتی۔

تعلیم میں پلاننگ:

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ دہلی میں ایک ادارہ ہے، جس کا موجودہ نام ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن ہے اور اسے صرف نام ہی میں بڑا نہ سمجھئے بلکہ کام بھی اس کا بہت بڑا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت کی تھوڑی سی تشریح اس کے موجودہ ڈائرکٹر جناب خواجہ غلام السیدین [illegible] جو انھوں نے اپنے ایک استقبالیہ میں ابھی حال میں ظاہر فرمائے ہیں، وہ

[illegible]

تعلیمی پلاننگ کے [illegible] صرف ماہرین تعلیم کے ہاتھوں ہی صحیح اور مناسب طریقہ پر حل نہیں کئے

جا سکتے ہیں، بلکہ یہ ایک ایسا بڑا اور مشترک کام ہے جس میں بہت سے شعبوں، بہت سی وزارتوں اور ایجنسیوں کو، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی شامل ہیں، مل کر کام کرنا چاہئے اور یہ کام بڑے عزم اور ہمدردی سے ہونا چاہئے۔ ایک ایسا انتظامی اور مالیاتی نظام جس میں حصہ والے یا تو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں، یا پھر ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتے ہوں، اس مقصد کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اتفاق و اشتراک عمل کی یہ فضا خواہ یہاں یا دنیا کے کسی اور ملک میں پیدا ہو گئی ہے۔ اختلافات کی خلیج خواہ چھوٹی ہو یا بڑی لیکن ان کے درمیان آمد و رفت کے لئے پل بنانا ہی پڑے گا تاکہ انسانی ترقی کا کام ہوتا رہے۔ اختلافات میں اتحاد و یگانگت کی یہ تلاش بہت سے تخلیقی کاموں کا باعث رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پلاننگ اس قسم کا تخلیقی کام ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب تک اس کے مختلف اجزا میں اتفاق و اتحاد نہ ہوگا، اس وقت تک پلاننگ کبھی اپنی منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتی ہے۔ اچھا اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے مختلف اجزا کیا ہیں؟ اس کے لئے کوئی نمونہ نہیں بتایا جا سکتا ہے جو کسی ایک ملک میں موجود ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیمی پلاننگ میں تعلیمی کام کرنے والے کو سب سے پہلے پلاننگ کمیشن، اس کے بعد وزارت مالیات، پھر وزیر اعظم کے دفتر اور غالباً اس کے بعد پھر زراعت، صنعت اور دوسری وزارتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ پھر ہمیں سب سے زیادہ اس بات کا خیال کرنا ہے کہ ان وزارتوں اور محکموں سے تعاون حاصل ہو اور ان میں باہم اشتراک عمل ہوتا ہے ان چیزوں کی بارے قومی کاموں میں ابھی بہت ضرورت ہے۔ اس سیمینار میں زیادہ اسی پہلو پر بحث ہوگی۔

یونیورسٹی عوام کی تعلیم کے لئے:

یونیورسٹی کی تعلیم کا بڑا مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ملک کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی قیادت کے لئے اشخاص پیدا ہوں، لیکن یونیورسٹی کا یہ کام کہ وہ عوامی خدمات کے سلسلہ میں بھی کچھ کر سکتی ہے، ہندوستان میں نسبتاً نیا خیال ہے۔ ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس خیال

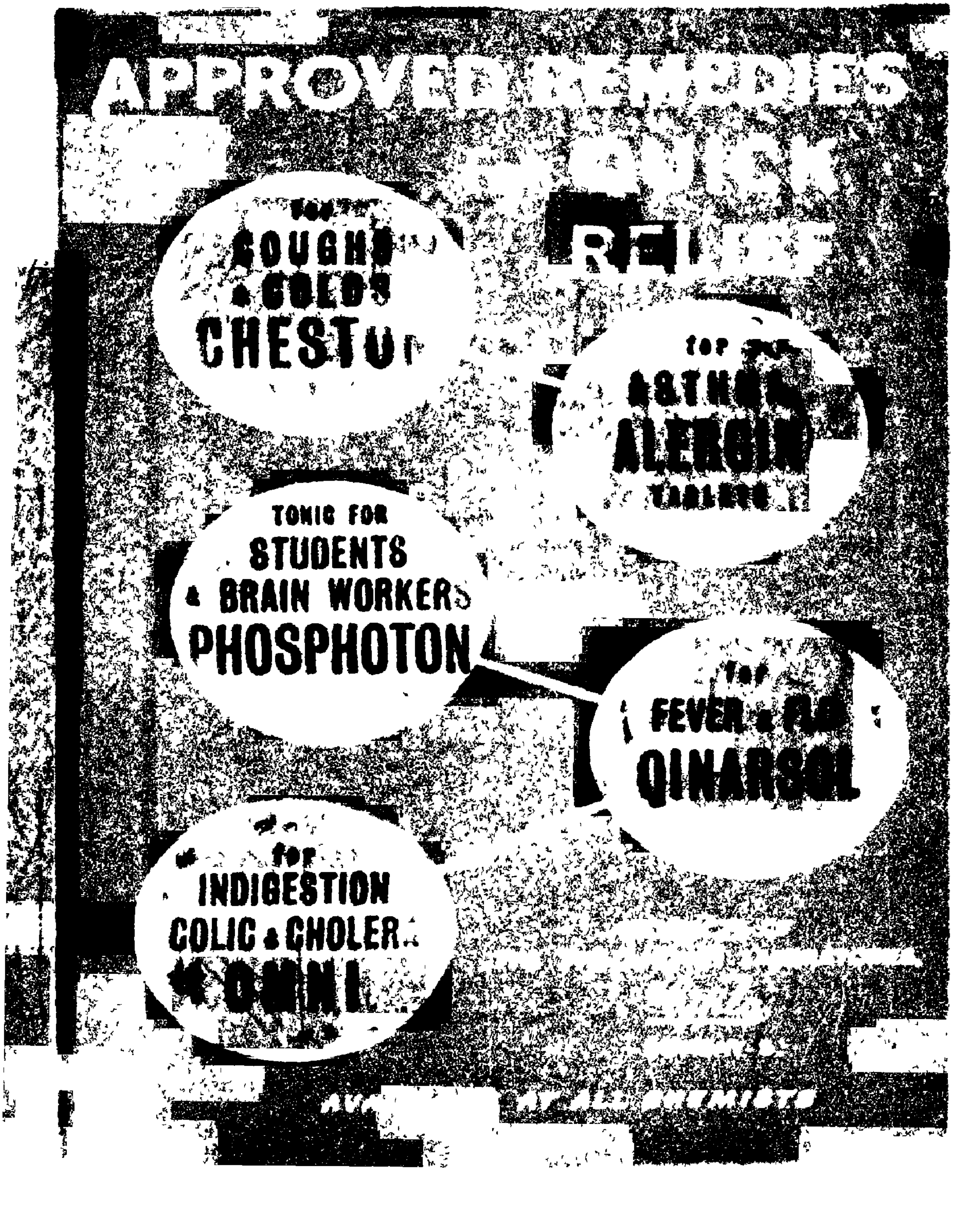
کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس [illegible] ہے کہ یونیورسٹی کی یہ تصویر کہ وہ علمار کی ایک [illegible]ت انجام دیتی ہے، ایک قصۂ ماضی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ دیوار جو علما اور جہلا کے درمیان حد فاصل تھی، ٹوٹ کر گر چکی ہے اور اب یونیورسٹی اور عوام دونوں کی [illegible] پیدا ہو گیا ہے۔ کم سے کم ایک میدان ایسا ہے اور وہ عوام سے بے تعلیمی اور جہالت دور کرنے کا ہے، جہاں ہماری یونیورسٹیاں بہت کچھ کر سکتی ہیں، اور اس کام میں علاوہ حکومتوں کے [illegible] رضاکارانہ جماعتیں بھی مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ ان میں منتظمان تعلیم گاہوں کے لوگ بھی شامل ہیں، ان میں طلبا اور فارغ التحصیل لوگ لئے جا سکتے ہیں، غرض ملک میں اس کام کے لئے ایک عام مہم چلائی جا سکتی ہے، اس سلسلہ میں مہاراشٹر کا دوری والوں کی تعلیم کے لئے ایک مہم چلا کر بڑی اچھی راہ دکھائی ہے جو سب نوجوانوں کے لئے قابل تقلید ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً تین چوتھائی آبادی یعنی وہ بالغ لوگ جنھیں رائے دینے کا حق دیا گیا ہے، بے پڑھی لکھی ہے اور زندگی کی ضروری معلومات اور واقفیتوں سے بے بہرہ ہے۔ اس لحاظ سے ملک کے اندر اس بے تعلیمی کو ختم کرنا ہمارا سب سے بڑا کام ہے جو ہماری یونیورسٹی اور کالجوں کے نوجوانوں کو کرنا ہے۔"

[illegible] ہیں جو ملک کے ایک مایۂ ناز اہل علم اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر [illegible] نے ابھی حال میں شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور کے کنووکیشن میں ظاہر [illegible]

Regd. No. D - 769 April, 1968

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

برہان

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۷ | بابت ماہ مئی ۱۹۶۸ء | شمارہ [illegible]

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

[illegible] احساس بڑا قوی اور شدید ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ساتھ رہتے صدیاں [illegible] زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے میل جول سے مشترک زندگی کے رنگا رنگ مظاہر سامنے آئے [illegible] روایتیں قائم ہوئیں، رسم و رواج اپنائے گئے، زبان اور تمدن پر ایک [illegible] اثر پڑا، لیکن [illegible] افہام و تفہیم کا کوئی مستقل معیار آخر دونوں فرقوں کے درمیان [illegible] نہیں قائم ہو سکا؟ ہمیں معلوم ہے کہ صوفیوں کے سلسلوں اور بھگتی تحریک کے سادھو سنتوں نے من و تو اور [illegible] کی منزل سے گذر کر، اور انسانیت کو معیار قرار دے کر، روحانی اتحاد کے گیت گائے اور ان کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے شمار لوگ ایک دوسرے سے قریب آئے لیکن یہ کیا بات ہے کہ تاریخ کے اہم فیصلوں کے وقت ہم مجموعی طور پر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ پاتے رہے ہیں؟ اس گتھی کو اگر ہم سلجھا لیں تو شاید ہندو مسلم مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر نکل سکے۔

[illegible] مختلف پیچ ہو سکتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کے مختلف اسباب بتائے جا سکتے ہیں [illegible] نزدیک ایک اہم سبب یہ ہے کہ خالص ذہنی سطح پر مسلمانوں نے ہندو دھرم کو اور ہندوؤں نے اسلام کو اس طرح نہیں سمجھا جیسا کہ اس کا حق تھا، بلاشبہ دونوں فرقوں میں ایسے منتخب افراد ملیں گے [illegible] کوشش کی کہ وہ اپنے ہمسایے کے مذہب کو سمجھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے [illegible] جتوں کا پڑھا لکھا طبقہ صرف اسی حد تک ایک دوسرے سے واقف ہو سکا جتنا [illegible] حالات کے تحت [illegible] تھا۔ ظاہر ہے کہ خالص ذہنی سطح پر افہام و تفہیم کے لئے محض افادی [illegible]

سے کام نہیں چل سکتا، یاد رہے کہ اس سلسلے میں میں خالص ذہنی سطح پر زور دے رہا ہوں، ورنہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے صدیوں سے ہندو مسلم ایک ساتھ رہتے آئے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شادی اور مسرت کے موقعوں پر باہم دگر دوست اور ساتھی، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں ایک دوسرے کے دوش بدوش، لیکن کیا کہا جائے کہ یہی سادہ فطرت لوگ ضرورت پڑی تو مذہب کے نام پر بانٹ دئے گئے، اور انھیں کو جب متوسط طبقہ کے کسی شخص نے مذہب کا واسطہ دے کر پکارا تو وہ اپنے مذہب والے کے ساتھ چل پڑے، بارہا ایسا دیکھنے میں آچکا ہے اور اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، قیادت تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھوں میں رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے مجموعی طور پر ایک دوسرے کے مذہب اور اس کی بنیادی باتوں کے پیچھے جو روح ہے اس کو سمجھنے کی دیانتدارانہ کوشش نہیں کی۔

میرا یہ احساس پرانا ہے اور رہ رہ کر اس کی چبھن محسوس ہوتی رہی ہے، ابھی حال میں مولانا آزاد کے یہاں اسی طرح کا ایک احساس پاکر یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس مسئلہ کو قارئین جامعہ کے سامنے رکھا جائے، ہو سکتا ہے کہ کسی اور نے بھی اس مسئلہ پر غور و فکر کیا ہو، وہ اپنے نتیجۂ فکر سے ہم سب کو مطلع کر سکتا ہے۔ ذکر آزاد (مرتبہ مرحوم عبدالرزاق ملیح آبادی) میں صفحہ ۲۷۵ پر مولانا آزاد کی ایک تحریر (غالباً ۱۹۲۲ء کی) کا اقتباس ملاحظہ ہو: "دنیا کی تمام قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دائمی اور حقیقی اتحاد ہو سکتا ہے، بشرطیکہ باہم دگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور امریکہ کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا جو صدیوں سے اس کے ہمسایے میں موجود ہے۔" مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب میں نے سر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل 'فلاسفی آف انڈین ہسٹری' دیکھا جو موڈرن ریویو میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی بجائے خود معبود بن گئے ہیں، کرشن، مسیح اور چیتنیہ کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں، یعنی کرشن

اور مسیح کی طرح محمدؐ بھی مسلمانوں میں معبود کی طرح پرستش کیے جاتے ہیں! میں نے کہا کہ ہندوستان کا عظیم الشان شاعر امریکہ کی سیاحت سے واپس آ رہا ہے لیکن اُسے اُن لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی معلوم نہیں جو [illegible] گھر میں بستے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے، وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہتا۔۔۔ اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو باوجود اس تعریف کے جو اُن کے [illegible] ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے اُن کی بے خبری پر متعجب ہو ہو کے رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ ایک امریکہ [illegible]

یہ بات بھی عام طور پر مسلمانوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ سے ناواقف ہی رہتے، غلط فہمیوں کی ایک بڑی وجہ ناواقفیت اور بے خبری ہوتی ہے۔ بلکہ تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں [illegible] اپنے مذہب سے اور ہندو اپنے مذہب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، دونوں جماعتوں کے لوگ اگر مذہب کی مشہور و معلوم سچائیوں ہی سے واقف ہو جائیں تو بگڑی بہت کچھ بن سکتی ہے، ہم ہندو اس لئے ہیں کہ یہ ہمارا موروثی مذہب ہے، ہم مسلمان اس لئے ہیں کہ ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، ہندو دھرم عالمگیر سچائیوں کے بارے میں کیا کہتا ہے اس سے ہم واقف نہیں، اسلام آفاقی صداقتوں کے بارے میں کیا کہتا ہے اس کی ہمیں جانکاری نہیں، ہاں، ہم اپنے موروثی مذہب کے نام پر کٹ مرنے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کیلئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، یہ زندگی کوئی اور زندگی ہو سکتی ہے مہذب اور سچے مذہبی آدمی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مسلمانوں میں سوشل سروس (سماجی خدمت) کی کوئی مستحکم بالشان روایت کیوں نہیں [illegible] بات روکے نہیں رُک رہے ہیں میں نے یہ دیکھا ہے کہ مسلمان شانتی سینا اور سرودے سماج کے [illegible] کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کے متمنی رہتے ہیں کہ حق کی آواز ان کی طرف سے بلند ہو، شانتی سینا اور [illegible] کے رضا کار فساد زدہ علاقوں میں جا کر سماج سیوا کا کام کرتے ہیں، مظلوموں کی ڈھارس بندھاتے ہیں اور جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ پوچھنا غلط ہوگا کہ شانتی سینا اور سرودے سماج کے سیوکوں

کی صف میں کتنے مسلمان شامل ہیں ؟ کتنے مسلمان ہیں جو دنوبا جی کی تحریک میں شریک ہیں ؟ افسوس اور رنج کی بات ہے کہ جس جماعت میں [illegible] صالحہ کو اس قدر ضروری قرار دیا گیا ہو، وہ عمل صالح کو محض انفرادی فعل سمجھ کر جی میں آئے تو کرے ورنہ آپ اپنی دنیا میں مگن رہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اجتماعی اعمال صالحہ کی مثال نہیں ، اسی ہندوستان میں صوفیا کی خانقاہیں اس کا مرکز رہی ہیں ، اسی ملک کے قلب میں بیٹھ کر سلطان الاولیا حضرت نظام الدین ؒ نے لازم عبادت کے مقابلہ میں متعدی عبادت کا مرتبہ بلند بتایا ہے ، ہمارے شیوخ تن تنہا دور دراز اور اجنبی علاقوں میں جا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے تھے اور خدمت خلق کے ذریعہ مرجع خلائق بن جاتے تھے ، آج مسلمانوں کے یہاں یہ طریقہ نہیں ملتا ، وہ خود اس پر عمل کیا کرتے اُن کے ساتھ بھی جانے کے لئے تیار نہیں جو اس طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں ، وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی ایک بہت بڑی بنیادی بات جو ایمان کے بعد اہمیت کے لحاظ سے اول درجہ پر ہے بھلا دی ہے ، اور وہ بات ہے عمل صالح ، مجھ سے ایک مخلص سماجی کارکن نے بڑے دکھ سے کہا کہ فسادات کے وقت جب ہم لوگ فساد زدہ علاقوں میں جاتے ہیں تو مسلمان ہمارے ساتھ آجاتے ہیں ، لیکن اس کے علاوہ کسی اور موقع پر اُن علاقوں میں ہماری موجودگی کی انھیں خبر نہیں ہوتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کی پوری جماعت کے لئے باعث شرم ہے ، اِس سے بڑی غفلت اور بے حسی اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اِس ملک میں اگر زندہ اور خود دار جماعت کی حیثیت سے رہنا ہے تو اور باتوں کے علاوہ مسلمانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت سماج سیوا کا کام کرنا چاہئے ، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ، ملک میں جو انجمنیں اور تنظیمیں اس طرح کا کام کر رہی ہیں اُن میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہونی چاہئے ، انہام و تفہیم کے لئے فضا ہموار کرنے اور اپنا اعتبار قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو اس میدان میں بھی پیش قدمی کرنی ہوگی ، اوروں کے لئے تو یہ محض وطنی اور انسانی فریضہ ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے لئے تو یہ وطنی ، انسانی اور دینی فریضہ بھی ہے ۔

ڈاکٹر نذیر احمد

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی ایک جامع حیثیات بزرگ تھے، وہ محقق، مورخ، ادیب، انشار پرداز، متکلم، شاعر، ماہر تعلیم سبھی کچھ تھے۔ اسی وجہ سے حقیقی معنوں میں وہ ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ وہ عہد جدید کے علم الکلام کے بانی تھے۔ وہ قدیم و جدید کے ایسے سنگم تھے جن میں دو دریاؤں کے دھارے آکر ملتے تھے۔ وہ قدیم مذہبی رنگ کے عالم بھی تھے اور جدید علوم سے کسی حد تک آشنائی بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی شخصیت میں بڑا تنوع اور ان کے غیر معمولی اثرات میں ان کی شخصیت کی بوقلمونی کو بڑا دخل تھا۔

مولانا شبلی کثیر التصانیف بزرگ ہیں ان کی تصنیفات کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما تھا۔ ان کے اکثر مطالعات مستشرقین کے اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہیں جو انھوں نے اسلامی تاریخ و تمدن کے بعض اہم ابواب پر کئے تھے۔ یورپ میں اسلامی علوم کے پھیلنے کے جو اسباب و مقاصد تھے ان میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد مستشرق اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کو ہدف اعتراض بنائیں۔ یہ کام بڑی تیزی کے ساتھ شروع ہوا اور عام تعلیم یافتہ نوجوان اس سے بہت جلد متاثر ہونے

یہ مضمون مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فروری ۶۹ء میں 'یوم شبلی' کی ایک تقریب میں پڑھا گیا۔

لگے۔ خصوصًا وہ نوجوان جو یورپ کے تعلیم یافتہ تھے ان کو اپنی تاریخ میں طرح طرح کی خامیاں نظر آنے لگیں۔ مولانا شبلی کو اس کا بڑی شدت سے احساس ہوا اور انھوں نے اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کی۔ ان کا قلم اسلامی علوم وفنون اور تاریخ وتمدن کے دفاع میں پوری قوت کے ساتھ رواں ہوا اور اس طرح ان کی تحریروں کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے شاندار واقعات اور کارہائے نمایاں دنیا کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کی مقصد کی یہ تھا کہ اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اس طرح پیش کی جائے کہ قوم کے افسردہ دلوں میں ازسرنو تازگی اور امنگ پیدا ہو۔ وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے جس میں علماء کے ایسے گروہ ہوں جو اسلام کے نئے تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔

یورپ میں اورنیٹلزم (استشراق) کی بنیاد محض اخلاص پر نہ تھی بلکہ اس کا مقصد بڑی حد تک سیاسی تھا۔ مشرقی علوم اور خصوصًا علوم اسلامی میں تخصص حاصل کر کے یورپی مستشرق اسلامی تاریخ اور تمدن کے روشن چہرے کو اس طرح مسخ کرنا چاہتے تھے کہ خود مسلمانوں کو اپنے اسلاف سے نفرت ہو جائے۔ اور یورپ کے کارناموں کے سامنے انھیں اپنے تمدنی مذہبی کارنامے ہیچ نظر آئیں۔ اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے جسد بے جان ہو جائے۔ اسی کے نتیجہ میں مستشرقین نے سرور کائناتؐ، خلفاء راشدینؓ، صحابۂ کرامؓ اور مسلمان سلاطین کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا۔ یہ مستشرقین یورپ کے فضلاء میں شمار ہوتے تھے وہ علمی تحقیقات کے نام پر مسلمانوں کی کتابوں سے ایسا مواد نکالتے تھے جس سے ان کی مطلب برآری ہو سکے۔ عربی اور فارسی کی نادر کتابوں کی تلاش اور نہایت قیمتی مواد فراہم کرتے اور ان سے اسلام اور اسلامی روایت کی بیخ کنی کرتے۔ ان حریفوں کے مقابلے میں مولانا شبلی نے بڑی قوت سے صف آرائی کی۔ انھوں نے جواب میں وہی طریق استدلال اختیار کیا جو اہل یورپ کا تھا جزیہ پر مولانا نے جس طرح کی تحقیق کی اس سے تمام معترضین کی زبان بندی ہو گئی۔ ان کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے یعنی اسلامی

ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے اس لئے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے [illegible] جب خلفائے راشدین [illegible] نے [illegible] غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی [illegible] سے مستثنیٰ قرار دے گئے [illegible] ان کا کتابچہ "حقوق الذمیین" اس بات کو پایۂ تحقیق تک پہنچاتا ہے کہ اسلام [illegible] عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ عیسائیوں نے [illegible] یہ قائم کیا تھا کہ انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا کر خاک کر دیا۔ مولانا کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ بلکہ اس مشہور کتب خانہ [illegible] ہی نے صدیوں پہلے برباد کر دیا تھا۔ اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے مولانا [illegible] کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور انھوں نے اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے یہ تصویر [illegible] دلپسند طور پر کھینچی۔ "الفاروق" اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ایک [illegible] تصویر ہے۔

مولانا بحیثیت مصنف کے ایک مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس پر کسی کی نقالی کا الزام عاید کیا جا سکے۔ وہ تحقیق کی موشگافیوں سے واقف تھے اور استدلال [illegible] ڈھنگ ایجاد کرتے تھے۔ ان کے قلم نے اسلامی موضوعات کو جس طرح سے روشناس کرایا ہے ہندوستان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بلکہ بعض اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ شاید عالم اسلام میں بھی وہ اپنی بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے سب سے ممتاز نظر آئیں۔

مولانا کی ہر تصنیف اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے اور وہ ان کے شہرت دوام کی ضامن ہے۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، سیرت النعمان، سفرنامہ، الفاروق، الغزالی، علم الکلام، [illegible] دبیر، شعر العجم، اورنگ زیب عالمگیر، سیرت النبی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایسی گرانقدر تصنیف ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اتنے متنوع موضوعات پر مولانا نے جس طرح سے قلم اٹھایا ہے کسی نے نہ اٹھایا ہوگا اور پھر ان میں جس طرح سے داد تحقیق

دی وہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ اپنی تصنیف کے اعتبار سے علم کے ایسے روشن منارے ہیں جس سے صدیوں تک رہروانِ منزل کو رہنمائی ہوتی رہے گی اور حق یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اہلِ یورپ نے مولانا کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، ان کی کتابوں کے ترجمے جو مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں وہ اسی کا اعتراف ہے، ان تصانیف سے اردو ادب کا دامن مالا مال ہوا اور مولانا کی وجہ سے اردو زبان اس درجے تک پہنچی ہے کہ اب بڑے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اردو اسلامی علوم کے اعتبار سے عربی، فارسی اور ترکی سے ہرگز پیچھے نہیں۔

مولانا نے اردو زبان و ادب کی جس طرح خدمت کی ہے اس کا صحیح احساس اب تک لوگوں کو نہیں ہوسکا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بڑے درجے کے انشاء پرداز ادیب اور نقاد تھے اور اسی اعتبار سے ان کی کتابیں اعلیٰ درجے کے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں، موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم اردو اور فارسی کے اعلیٰ نصاب کی متداول ترین کتابیں ہیں۔ لیکن یہ تصویر کا محض ایک رخ ہے، دوسرا رخ عالمی اقدار کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے اردو میں اسلامی تاریخ و تمدن پر اتنا زیادہ مواد اکٹھا کر دیا ہے کہ اردو زبان بجا طور پر اسلامی علوم کی زبان متصور ہوسکتی ہے۔ عام طور پر اسلامی زبانیں تین سمجھی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی۔ ان کے اسلامی قرار دیئے جانے کی وجہ محض یہ نہیں کہ اکثر مسلمانوں کی یہی زبانیں ہیں، بلکہ یہ کہ اسلامی علوم و فنون کے ذخائر کا اجارہ داری انھیں کے حصے میں آئی ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر اردو بھی انھیں کے ذیل میں آتی ہے۔

مولانا کی عہد آفریں شخصیت، علم کی اس روایت کو جس کے ذریعے بڑے معرکے سر ہوئے بارآور کیونکر رکھتی۔ انھوں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے بعد علماء کا ایسا گروہ چھوڑ جائیں جس کے ذریعہ زمانہ مابعد میں اسلام کے نئے نئے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ اس کو انھوں نے اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیا۔ ندوۃ العلماء کا استحکام، دار المصنفین

[illegible] کی تشکیل اسی مقصد کے پیشِ نظر عمل میں آئی۔ ندوہ کے ذریعہ علماء جدید تقاضوں سے آشنا [illegible] ئے، اور بحمد اللہ یہ سلسلہ جاری [illegible] اس ادارہ نے اپنے [illegible] پید اکے جو [illegible] مولانا کی روایت کو آ[illegible]اب کے ساتھ قایم رکھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی [illegible] می تاریخ ے [illegible] فراموش نہیں کر سکتی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے علمی و عملی کارنامے دنیائے اسلام کو جس طرح متاثر کئے ہوئے ہیں وہ ہر شخص پر بخوبی روشن [illegible] یات پر بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔

[illegible] ہندوستان کی وہ اکیڈمی ہے جس نے اسلامی تاریخ اور علوم پر ایسے [illegible] ہیں جو اپنی کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ مولانا نے اسلامی تاریخ [illegible] کا جو خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا تھا اور جس کے نمونے خود ان کی حیات میں سامنے [illegible]۔ اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگردوں اور ندوہ کے سپوتوں کے ذریعہ ہوتی رہی ہے۔ سیرت نبوی، سیرت صحابہ، صحابیات، تابعین و تبع تابعین، تاریخ اسلام وغیرہ کے جو سلسلے دار المصنفین نے شائع کئے وہ ایسی گرانقدر تصانیف ہیں کہ ان سے تاریخ اسلامی کے نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کو اس ادارے پر بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے۔ دار المصنفین کے علمی رسالہ 'معارف' نے علمی و تحقیقی دنیا میں جو شہرت حاصل کی وہ ہر شخص پر منکشف نہیں۔ آج بھی وہ رسالہ اس پابندی کے ساتھ نکلتا ہے جس طرح نصف قرن پہلے نکلتا [illegible] کی اہم ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس رسالے میں جتنے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اس اعتبار سے ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران کا کوئی رسالہ اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

مولانا شبلی بڑی باکمال شخصیت کے حامل تھے ان کے کارنامے نہایت شاندار اور [illegible] ل ہیں۔ اسلامی تمدن اور اسلامی تاریخ پر ان کا بڑا احسان ہے۔ ان کی بہترین یادگار یہ ہے کہ ہم ان کی روایت کو آگے بڑھائیں اور جن اداروں کے ذریعہ [illegible] روایت

کو تقویت پہنچتی ہے ان کو تقویت پہنچائیں۔ دارالمصنفین ان کا محبوب ادارہ ہے، وہ جو خدمت انجام دے رہا ہے لائق صد ستائش ہے لیکن اسلامی علوم کے شناسا روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں اور ہم اپنی تہذیب سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اچھے اور ذہین لوگ ان علوم کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں۔ ایسے حالات میں یہ اندیشہ ہے کہ شبلی کی شاندار روایت زیادہ دیر تک قایم نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس کریں اور یہ سمجھیں کہ اسلامی تہذیب اور اقدار کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح سائنسی اقدار کی۔ ان دونوں میں صحیح طور پر ہم آہنگی ہونی چاہئے اگر ہم آہنگی نہیں ہوگی تو ہم ان اعلیٰ اقدار سے محروم ہو جائیں گے جو ہماری روایت کا شاندار اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ عزت و احترام کے لحاظ سے اسلامی تہذیب کے خدمتگار کسی طرح پیچھے نہیں۔ مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی، ابوالحسن ندوی اور ان کی طرح کے لوگ جس شہرت اور اہمیت کے مالک ہیں وہ کسی پر چھپی نہیں ہے۔ آج بھی شبلی اور سید سلیمان ندوی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن قوم و ملت میں اس کا احساس پیدا ہو کہ یہ علوم ضمنی توجہ سے زندہ نہیں رہ سکتے، ان کا بھی اپنا مقام ہے، ان کی بھی اپنی حیثیت ہے۔ اگر یہ احساس قوم میں پیدا ہو جائے تو یقیناً ہماری درسگاہیں پھر چمک سکتی ہیں اور اسلامی علوم کے سچے سپوت پیدا کر سکتی ہیں۔

آج اسلام اور اسلامی علوم پر پہلے سے زیادہ یورش ہے۔ اسلامی تاریخ و تمدن کا مطالعہ اس وقت یہودیت اپنا اولین مقصد قرار دے چکی ہے۔ ہزاروں یہودی فضلا جو علوم مغربی و مشرقی کے منتہی ہیں، اپنے زبردست وسائل سے ایسے ایسے مواد فراہم کر رہے ہیں جو ہماری دسترس میں نہیں ہیں، ان میں اسرائیل کے علاوہ یورپ اور امریکا کے فضلا بھی شامل ہیں ان میں سے بعض اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں ایسے مواد کو سامنے لانے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے اسلام اور اسلامی تاریخ کی تابناکی مدھم ہو جائے۔ اس لئے اس وقت اور بھی ضرورت ہے کہ ہمارے ذہین لوگ اس طرف بطور خاص متوجہ ہوں، ایک طرف اسلام اور اسلامی

علوم و تاریخ کا مطالعہ کریں تو دوسری طرف اسرائیلیت اور عیسائیت کو اپنا موضوع تحقیق بنائیں
[illegible] اسلامی اور دوسری متعلقہ زبانیں اور ان کے علوم کا ماہر [illegible] کسی
آدمی کے کرنے کا نہیں [illegible] کا کام ہے۔ قوم و ملت کا فرض ہے کہ وقت کے
اس اہم تقاضے کے پیش نظر اعلیٰ در [illegible] تحقیقاتی ادارے قایم کرے جن میں ملت کے
بہترین افراد اسلام اور اسلامی تاریخ کے دفاع میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں۔ اس
طرح کے [illegible] ہوگی اور وقت کی اہم ضرورت بھی پوری
[illegible]

ڈاکٹر مشیر الحق

کالی قومیت: تاریخ اور پس منظر

امریکہ کے تقریباً [illegible] ملین (ایک کروڑ ۹ لاکھ) حبشی النسل مرد اور عورتیں اگرچہ وہاں کے دستور کے مطابق دوسرے امریکی شہریوں کے برابر ہیں، لیکن صدہا برس کی غلامی کے باعث ان کی بہت بڑی اکثریت سماجی اور معاشی حیثیت سے دور غلامی سے بہتر زندگی نہیں گذار رہی ہے۔ اگرچہ روز بروز بڑھتی ہوئی تعلیم ان میں یہ احساس پیدا کرتی جاتی ہے کہ انھیں سماجی اور معاشی حیثیت سے سفید فام امریکیوں سے اگر بلند نہیں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہونا ہے۔ اس مقصد کے لئے امریکہ میں حبشیوں کی مختلف انجمنیں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ایسی تمام جماعتیں اس بات پر تو متفق ہیں کہ انھیں سیاہ فام امریکیوں کے مفاد کے لئے کام کرنا ہے، لیکن وہ مفاد ہے کیا، اور اسے کس طرح حاصل کیا جائے، اس پر شدید اختلاف ہے۔

"حبشی مفاد" کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے ان کے موجودہ سماجی طبقات پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ ۱۹ویں صدی ہی سے شمالی امریکہ میں بسنے والے سفید فام لوگوں کو سیاسی دور اندیشی کی وجہ سے اس علاقے کے حبشیوں میں تعلیم اور روزگار میں آزادانہ مقاومت کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہونے لگا تھا جو ۲۰ ویں صدی تک پہونچتے پہونچتے جسمانی طور سے کالا ضرور تھا لیکن طرز رہائش اور انداز و گفتار میں سفید سماج کا ایک حصہ بن جانے کو اپنا مطمح نظر سمجھتا تھا۔ اس طبقہ کے کی نظر میں حبشی مفاد کا حصول سیاہ اور سفید سماج کے ادغام پر تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سفید اور سیاہ سماج کا نہیں بلکہ سفید سماج میں سیاہ سماج کا ادغام تھا۔ اس

[illegible] کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور معاشی حالت [illegible] کا یہ طبقہ خود اپنی ذات سے ایک نیا سماج بن گیا، جسے سفید سماج پوری طرح [illegible] اپنانے پر تیار نہیں تھا اور خود اپنے پس ماندہ [illegible] سے یہ طبقہ ملنے کو آمادہ [illegible] حیثیتوں میں معاشی اور سماجی حیثیت سے (اعلیٰ طبقہ کے وجود [illegible] طبقہ تو پیدا ہو گیا لیکن کالے سماج کی بھاری اکثریت [illegible]

[illegible] ویں صدی کے شروع میں اکا دکا طریقے سے کچھ ایسی تحریکیں بھی ابھریں جن کا پورا زور سفید میں سیاہ کو مدغم کرنے کے بجائے "سیاہ قومیت" کی انفرادیت پر تھا۔ یہ تحریکیں اس بات کی مدعی تھیں کہ سفید اور سیاہ میں نہ تو کبھی کوئی وجہ مماثلت [illegible] میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ سفید سماج بطیب خاطر سیاہ سماج کو برابری [illegible]۔ اس تحریک کے لیڈروں کے لئے سب سے بنیادی بات یہ تھی کہ وہ ان نقاط کی نشاندہی کریں جو سفید اور سیاہ سماج کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے بجائے ایک دوسرے کے بالمقابل مدعیانہ حیثیت سے کھڑا کر سکیں، کیونکہ اس کے بغیر سفید فام امریکہ میں "سیاہ قومیت" کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

سیاہ فام لوگ جب افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے تھے اس وقت وہ امریکہ کے سفید فام لوگوں سے اپنی تہذیب، زبان، مذہب، نسل، غرضیکہ ہر چیز میں مختلف رہے ہوں گے، لیکن [illegible] پہونچتے پہونچتے یہ تمام امتیازات ختم ہو چکے تھے۔ کالوں کی اپنی تہذیب کبھی کی مردہ ہو چکی تھی۔ زبان دونوں سماجوں کی انگریزی بن گئی تھی۔ مذہب عیسائیت تھا۔ رہ گئی نسل کی بات، تو سفید سماج شاید اپنی نسلی "پاکیزگی" کا غلط یا صحیح پروپگنڈا کر بھی سکتا تھا لیکن کالوں کی رگوں میں "سفید" "سرخ" "سیاہ" "زرد" تقریباً ہر رنگ کا خون دوڑ رہا تھا۔ لے دے کر اگر کوئی امتیاز ان کے پاس بچا تھا تو وہ ان کا ظاہری رنگ تھا ـــ سیاہ رنگ! اور یہی رنگ "سیاہ قومیت" کا [illegible] قرار پایا۔

[redacted]

ایک بار جب جداگانہ "سیاہ قومیت" کا تصور سامنے آگیا تو جداگانہ تہذیب، جداگانہ مذہب اور جداگانہ زبان کو تاریخ کے اوراق سے ڈھونڈھ نکالنا زیادہ مشکل نہ رہ گیا۔ سیاہ قومیت کا اصلی وطن امریکہ کے بجائے افریقہ قرار پایا، جہاں سے ان کے آبا و اجداد بجولاں لائے گئے تھے۔ کچھ دنوں تک تو افریقہ "جغرافیائی معنوں میں استعمال ہوتا رہا لیکن جب افریقی النسل امریکیوں کا مذہب عیسائیت کے بجائے اسلام قرار پایا تو لفظ "افریقہ" بھی ایک مخصوص جغرافیائی علاقے کے بجائے "مشرق" (EAST) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ عیسائیت جسے ابھی تک کالے اور گورے دونوں اپنا مذہب مانتے آرہے تھے اچانک صرف گوروں کا مذہب بن کر رہ گئی، اور اسلام جو مشرق سے پھیلا تھا کالوں کا قومی مذہب بن گیا۔ قومی مذہب کے معاملے میں امریکہ کے کالے مسلمانوں نے اس حد تک شدت برتی کہ ان میں سے اکثریت نے عقیدہ کے طور پر یہ بات تسلیم کرلی کہ سفید فام اگر اسلام قبول بھی کرنا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بعد میں جب ان کالے مسلمانوں کا واسطہ مشرق کے کچھ ایسے مسلمانوں سے پڑا جو رنگ کے اعتبار سے امریکی گوروں سے کہیں زیادہ گورے تھے تو انھوں نے "سیاہ" اور "سفید" کی ایک نئی توجیہہ کرلی۔ "سفید فام" کا مطلب "اینگلو سکسن نسل کے لوگ" ہوا اور بقیہ دنیا "سیاہ فام" قرار پائی خواہ وہ چین میں رہتی ہو یا ہندوستان میں، روس ہو یا افریقہ۔

پہلی جنگ عظیم کے لگ بھگ زمانہ میں امریکی حبشیوں میں کچھ ایسی پراسرار کالی شخصیتوں کا پتہ چلتا ہے جو کالی قومیت کو عیسائیت سے الگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے جو "روحانی باپ" (FATHER DIVINE) کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۱۵ کے لگ بھگ اپنی تحریک شروع کی۔ "روحانی باپ" نے اپنے کو پہلے پیغمبر (MESSENGER) کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن جلد ہی وہ "خدا کا بیٹا" اور خدا کا رسول (PROPHET OF GOD) بن گیا۔ "روحانی باپ" کا پیغام یہ تھا کہ کالا سماج اپنے کو سفید سماج سے بالکل الگ کرلے۔ اس کا اور اس کے ماننے والوں کا عقیدہ تھا کہ خدا ہر شخص میں ہے۔ لیکن جب معتقدین کی تعداد زیادہ

ہو گئی تو خدا کے "وجود ہر مکان" عقیدہ کو اس طرح محدود کر دیا گیا کہ وہ ہر شخص میں ہونے کے بجائے صرف "روحانی باپ" میں [illegible] بدیع کا مجموعہ، جیسا کہ خود روحانی باپ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا، یہ کہ [illegible]

> [illegible] سیاہ ہے، اور میں سیاہ فام ہوں۔ اس لئے خدا بھی
> [illegible] فام ہے۔ خدا سے برتر اور کوئی نہیں ہے اس لئے
> "سیاہ" ہر ایک سے برتر ہے۔

روحانی باپ کی مذہبی تعلیم اور مابعد الطبیعاتی عقائد کچھ اس قدر پراسرار تھے کہ اسے کوئی اثباتی مذہب نہیں کہا جا سکتا۔ عیسائیت اور حبشیت کی تفریق پر زور ہونے کی وجہ سے ہم اسے [illegible] منفی مذہب کہہ سکتے ہیں۔

[illegible] دو اور شخصیتیں سامنے آئیں۔ ایک امریکی حبشی تموتھی ڈریو (TIMOTHY DREW) [illegible] تھا اور دوسرا ویسٹ انڈیز کا رہنے والا ایک حبشی مارکس گریوی (MARCUS GRAVY) تھا۔

تموتھی ڈریو، جس نے بعد میں اپنا نام نوبل ڈریو علی (NOBLE DREW ALI) رکھا یا تھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہے، ۱۸۸۶ میں شمالی کارولینا (N. CAROLINA) میں پیدا ہوا [illegible] ۱۹۱۳ء میں وہ ایک مذہبی مبلغ کی حیثیت سے نیوارک (NEWARK) شہر کے حبشی محلوں میں نوبل ڈریو علی کے نام سے گھومتا ہوا پایا گیا۔ وہیں اس نے سب سے پہلے ایک عبادت [illegible] (TEMP[illegible]) قائم کی۔ آنے والے ۱۲ سال کے عرصہ میں اس نے مختلف شہروں [illegible] عبادت گاہیں قائم کیں۔ یہ عبادت گاہیں در اصل کلچر ہال تھے جہاں علی اور اس کے [illegible] حبشیوں کو ان کے "اصلی" مذہب یعنی اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اور انہیں ان کی اس تاریخ سے آگاہ کرتے تھے جسے "سفید شیطانوں" نے کتابوں سے نکال دیا تھا۔ اس تاریخ کی رو سے [illegible] تھے جسے "سفید فام شیطانوں" نے "نیگرو" [illegible]

دیا تھا۔ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی ہر عبادت گاہ کا نام "مراکشی امریکی سائنسی عبادت گاہ" (MOORISH - AMERICAN SCIENCE TEMPLE) رکھا۔

نوبل دریو علی کے اس نادر انکشاف نے بعد میں ایک دلچسپ اور مضحکہ خیز بحث یہ پیدا کر دی امریکہ کے حبشیوں کو کس نام سے پکارا جائے۔ ابھی تک وہ "نیگرو" یا اور زیادہ حقارت آمیز انداز میں "نیگر" (NIGGER) تھے لیکن "کالی قومیت" کا احساس پیدا ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے کو نیگرو کہنے سے انکار کر دیا کیونکہ لفظ "نیگرو" ان کے "سفید آقاؤں" کا ایک عطیہ تھا۔ امریکہ کے سیاہ فام لوگوں پر ادھر چند برسوں میں جو تحقیقاتی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ان کے لئے مختلف نام استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً؛ افروامریکی (AFRO - AMERICAN)؛ افرامریکی (AFRAMERICAN)؛ افریقی درمسافرت (AFRICAN - ABROAD)؛ افریقی النسل (PERSON OF AFRICAN DESCENT)؛ ایشیائی (ASIATIC)؛ افریقی یورپی امریکن انڈین (AFRICAN - EUROPEAN - AMERICAN - INDIAN) - یہ نام مختلف مصنفین نے اپنی کتابوں میں امریکہ کے تمام (بلا تفریق مذہب) حبشیوں کے لئے استعمال کئے ہیں۔ لیکن خود ان میں سے جو مسلمان ہو چکے ہیں وہ اپنے میں اور غیر مسلمان حبشیوں میں فرق کرتے ہیں۔ وہ اپنے کو "سیاہ مسلمان" (BLACK MUSLIM)، "اسلامی قوم" (NATION OF ISLAM) یا "بازیافتہ گم شدہ قوم" (LOST-FOUND NATION) کہتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں اگر وہ لفظ نیگرو استعمال کرتے ہیں تو اس کے ساتھ "نام نہاد" (SO - CALLED NEGRO) کا اضافہ ضرور کر دیتے ہیں۔ "نام نہاد" کے بغیر جب کبھی بھی وہ "نیگرو" کا لفظ استعمال کریں گے تو اس کا مطلب "غیر مسلم نیگرو" ہوتا ہے۔

نوبل علی کچھ خاص پڑھا لکھا شخص نہیں تھا لیکن اسلام کے بارے میں اس نے کچھ الٹی سیدھی

---

* انڈین سے ہندوستانی نہیں، بلکہ امریکہ کے اصل انڈین باشندے مراد ہیں

باتیں اِدھر اُدھر سے سن کر ایک نیا اسلام امریکی حبشیوں کے سامنے پیش کیا۔ اور غالباً علی پہلا امریکی حبشی تھا جس نے کھل کر یہ بات کہی کہ حبشیوں میں اتحاد اور ان کی ترقی صرف اسلام کے ذریعہ ممکن ہے۔ علی کے حالات زندگی ابھی تک پردہ راز میں ہیں، لیکن اس کے بارے میں جو کہانیاں اس کے معتقدین سناتے ہیں ان کے مطابق اس نے شمالی افریقہ کا سفر کیا تھا جہاں پر آسے مراکش (حبشی) بادشاہ نے امریکہ کے حبشیوں کو اسلام کی طرف واپس لانے پر مامور کیا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق علی کی یہ ماموریت شاہ مراکش کے بجائے شاہ مصر سے ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علی نے صدر امریکہ (نام کی صراحت نہیں ہے) سے ملاقات کر کے حبشیوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے اجازت نامہ مانگا تھا جس کے جواب میں صدر نے کہا تھا کہ حبشیوں کو مسلمان بنانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا گھوڑوں کو پتلون پہنانا۔ (اگر یہ روایت صحیح ہو تو موجودہ صورت حال کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ گھوڑوں نے پتلون پہننا سیکھ لیا ہے)

علی کی تعلیمات ایک خفیہ کتاب میں جمع کی گئی ہیں جسے اس کے حلقہ میں "قرآن مقدس" (HOLY KORAN) کہا جاتا ہے۔ جن چند مصنفین کی رسائی اس خفیہ کتاب تک ہو سکی ہے ان کے بیان کے مطابق علی کا یہ "قرآن مقدس" قرآن شریف کی کچھ آیات کے ترجموں، بائبل کے کچھ حصوں اور خود اس کے فرمودات پر مشتمل ہے۔ علی کی تعلیمات کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ کے سیاہ فام اپنے کو نیگرو کہنے کے بجائے "ایشیائی"، "مراکشی" یا "مراکشی امریکن" کہا کریں۔ مراکش کو اپنا وطن سمجھیں اور عیسائیت کے بجائے اسلام کو اپنا مذہب مانیں۔ علی کے کہنے کے مطابق دنیا میں صرف دو قومیں ہیں: سفید فام (اینگلو سکسن) اور ایشیائی۔ اور صرف ۲ مذاہب ہیں: عیسائیت۔ عیسائیت گوروں کے لئے اور اسلام ایشیائیوں کے لئے۔

علی نے حبشیوں کی معاشی سدھار کے لئے امداد باہمی کے انداز پر چھوٹے موٹے کاروبار شروع کرائے اور اس بات کی تلقین کی کہ حبشی صرف اپنے بھائیوں کی دوکانوں سے سامان خریدا کریں۔ علی کا یہ اقدام تبلیغی حیثیت سے زیادہ کامیاب رہا۔ لیکن کامیابی اپنے دامن

میں قیادت کے لئے باہمی رقابت کو بھی لائی۔ علی کا ایک حریف ۱۹۲۹ء میں ایک صبح مردہ پایا گیا۔ پولیس نے قاتل کے شبہ میں علی کو گرفتار کرلیا، لیکن مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے ہی جبکہ علی ضمانت پر رہا تھا وہ اپنے مقتول حریف کی طرح مردہ پایا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ضمانت پر رہا ہونے سے پہلے جیل میں تھا پولیس نے اسے اس قدر جسمانی اذیت دی تھی کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حریف گروہ کے کسی شخص نے اسے قتل کر دیا۔

امریکہ کا دوسرا لیڈر مارکس گاروی (۱۸۸۷ ـ ۱۹۴۰) تھے جو "سیاہ موسیٰ" (BLACK MOSES) کے نام سے بھی مشہور ہے، جداگانہ سیاہ قومیت پر پورا زور دینے کے باوجود "جداگانہ مذہب" کے تصور کی بہت زیادہ ہمت افزائی نہیں کی۔ جہاں تک افریقہ کو وطن ماننے کا مسئلہ تھا، وہ اس معاملہ میں علی سے چند قدم آگے ہی تھا۔ علی کے یہاں وطن کا جو تصور عقیدہ کی حد تک تھا مارکس کے یہاں وہ عمل ہی عمل تھا۔

۱۹۱۴ کے لگ بھگ مارکس نے اپنی تحریک جس میں "وطن کی طرف واپسی" پر زور تھا، شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ چند ہی برسوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد (یقیناً مبالغہ کے ساتھ) کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ۱۹۲۰ء میں مارکس نے نیویارک میں دنیا کے سیاہ فاموں کی بین الاقوامی کانفرنس (INTERNATIONAL CONVENTION OF THE NEGRO PEOPLE OF THE WORLD) کا اہتمام کیا۔ کانفرنس کی کارروائیوں اور دھوم دھام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کانفرنس نے مارکس کو "اعلیٰ حضرت شہنشاہ" (HIS HIGHNES THE POTENTATE) کے شاہانہ لقب کے ساتھ "جمہوریہ افریقہ" کا صدر منتخب کیا۔ صدر افریقہ کی حیثیت سے ۲۲ ہزار ڈالر سالانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ صدارت کا عہدہ قبول کرنے کے بعد مارکس نے ۱۸ ممبروں کی ایک اعلیٰ انتظامی کونسل بنائی جس کے ہر ممبر کو ۲ ہزار سے لے کر ۱۰ ہزار ڈالر تک سالانہ اعزازی الاؤنس دینا طے کیا گیا۔

جمہوریہ افریقہ کے صدر کی حیثیت سے مارکس گاروی نے جو معاشی پروگرام اپنی قوم کے سامنے

پیش کیا اس میں ایک جہاز راں کمپنی (BLACK STAR STEAMSHIP COMPANY) اور ایک نیگرو فیکٹری کا قیام شامل تھا۔ چار پرانے جہاز بھی خرید لئے گئے۔ یہ کمپنی خاص [illegible] کی گئی تھی کہ امریکہ کے حبشیوں کو اپنے آبائی وطن واپس جانے میں سہولت [illegible] نے افریقہ [illegible] تعلقات بڑھانے اور استوار کرنے کی خاطر ایک تجارتی [illegible] لائبیریا کو بھیجا۔ اور بھی کئی ایک چھوٹے بڑے معاشی منصوبے قائم کئے گئے لیکن ناتجربہ کاری [illegible] [illegible] کامیاب نہ ہوسکا۔

۱۹۲۵ء میں امریکہ کی حکومت نے مارکس گریوی پر دھوکہ بازی اور خیانت مجرمانہ کے مقدمات [illegible] دو سال کے لئے جیل بھیج دیا۔ حکومت [illegible] اس اقدام کے بارے میں امریکی حبشی کا یہ [illegible] مارکس گریوی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ڈر کر حکومت نے اسے جعلی مقدمات کے [illegible] مارکس گریوی چونکہ امریکی شہری نہیں تھا اس لئے ۱۹۲۷ء میں جیل سے رہا ہوتے [illegible] سے جلاوطن کر دیا گیا، کیونکہ قانوناً اب وہ حدود امریکہ میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہاں سے وہ جمیکا، پھر لندن چلا گیا، جہاں ۱۹۴۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لندن کے دوران [illegible] مارکس نے اپنی تحریک کو زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہو سکی۔

[illegible] علی اور مارکس گریوی، دونوں کی تحریکیں اگرچہ خاص طور سے حبشی عوام کو مخاطب کرتی تھیں لیکن مارکس کے مقابلے میں علی کو پائدار کامیابی اس وجہ سے زیادہ ہوئی کہ اس کے یہاں زور [illegible] تھا کہ چونکہ ان کا اصل وطن (افریقہ) سفید فاموں کے ہاتھوں ان سے چھوٹ چکا ہے [illegible] اب وہ سفید فاموں کے وطن سے ایک ٹکڑا لے کر اپنا آزاد وطن بنائیں۔ مارکس گریوی کے یہاں زور ہجرت پر تھا جس سے نچلے طبقہ کو خاص فائدہ پہونچنے کی امید نہیں تھی۔ سب سے [illegible] تھی کہ جذباتی حیثیت سے افریقہ کو اپنا وطن سمجھنے کے باوجود امریکی حبشی وہاں واپس [illegible] نہیں تھا کیونکہ افریقہ کے بارے میں وہ بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ وہاں "آدم خور وحشی" [illegible] کی نظر میں سیاہ و سفید کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

(۲)

[illegible] گریوی کے خاتمے کے بعد امریکہ کی کالی سیاست میں کچھ دنوں کے لئے ایک جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ اور خوشحال حبشیوں کی رفاہی اور سیاسی جماعتیں [illegible] بھی تھیں لیکن چونکہ ان میں اور ان کی قوم کے نچلے طبقے کے درمیان ایک [illegible] خلیج پیدا ہو چکی تھی اس لئے ان کی باتوں پر حبشی عوام زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ [illegible] کے یہ معتدل لیڈر، نچلے طبقے کے انتہاپسندوں کی نظر میں "سیاہ جسموں میں سفید شیطان" تھے۔

امریکی حبشی فطرۃً طور سے جذباتی واقع ہوا ہے۔ سیکڑوں برس تک اس نے جس قسم کی [illegible] زندگی گزاری ہے اس نے اس میں سیماب وشی کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اسے [illegible] ٹھنڈے اور منطق استدلال متاثر نہیں کر سکتے — اپنی اس قومی عادت کی وجہ سے امریکی حبشی نوبل ڈریو علی، مارکس گریوی یا اسی قسم کے انتہاپسند لیڈروں کے پیچھے چل سکتا ہے۔ ان دونوں لیڈروں کے اسٹیج سے ہٹ جانے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ایک تیسری پراسرار شخصیت فرد محمد کے نام سے سامنے آئی۔

فرد محمد نے شروع میں اپنے معتقدوں کو یہ یقین دلایا کہ نوبل ڈریو علی کی روح "سفید شیطانوں" سے تنگ آ کر اپنا پرانا جسم چھوڑ کر اس کے جسم میں آ گئی ہے، اس طرح درحقیقت وہ فرد محمد نہیں بلکہ نوبل ڈریو علی ہے، لیکن "شیطانوں" کی وجہ سے اپنا پرانا نام استعمال نہیں کر رہا ہے۔ بعد میں اس نے اپنے ایک خاص معتقد کے سامنے اپنے کو "مہدی" کی حیثیت سے پیش کیا جس کا دنیا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن یہ بات مہدویت ہی پر ختم نہیں ہوئی۔ بعض مواقع پر اس نے اپنے کو خدا (God) اور "اللہ" کی حیثیت سے بھی پیش کیا۔ غرضیکہ وہ مختلف حلقوں میں حسب [illegible]

---

* ہندوستانی مسلمان God اور اللہ میں اگر کوئی فرق سمجھتے ہیں تو صرف یہ کہ ایک انگریزی کا لفظ ہے اور ایک عربی کا۔ لیکن امریکہ کے کالے مسلمانوں اور (شاید انھیں کے اثر سے) وہاں پر بسے ہوئے (باقی صفحہ ۲۴۷)

[illegible] مختلف ناموں سے مشہور رہے:

۱۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ فرد (W. D. [illegible] FARRAD)؛ ۲۔ والی فرّاد؛ [illegible] پروفیسر [illegible] فراد [illegible]۔ محمد علی؛ ۶۔ مہدی؛ ۷۔ خدا (God)؛ ۸۔ اللہ۔

[illegible] کے خاندانی اور ذاتی حالات ابھی تک پردۂ گمنامی میں ہیں۔ ان کے معتقدین کے حلقے میں [illegible] مشہور ہیں ان کی رو سے ان کے باپ ایک سیاہ فام قریشی عرب [illegible] خود فرد کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ پیدائش اور ابتدائی تعلیم مکہ میں ہوئی تھی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم انگلینڈ اور امریکہ میں جنوبی کیلیفورنیا اور لاس انجلس کی یونیورسٹیوں میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے مملکت حجاز کی طرف سے انھیں سفارتی کاموں کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کہ [illegible] کے لئے انھیں چن لیا، اور ان کے مادی جسم کے [illegible] اپنے منتخب [illegible] سفید اقوام کی مدد کے لئے شمالی امریکہ میں آ گیا۔

سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں فرد ڈیٹروائٹ (DETRIOT) کے حبشی محلوں میں گھر گھر پھیری کر کے کپڑے بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو کپڑے وہ بیچتے تھے ان میں کوئی خصوصیت نہیں تھی لیکن ان کپڑوں کی جو تاریخ وہ بتاتے تھے اس کی وجہ سے حبشی مرد اور عورتیں ہر صبح شام بے چینی سے ان کا انتظار کیا کرتے تھے۔ فرد کے کندھوں پر لدے ہوئے کپڑے، ان کے کہنے کے مطابق، امریکی نہیں بلکہ افریقی تھے جن میں امریکی حبشیوں کے افریقی بھائی بندوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶) اکثر ایشیائی (جذباتی) مسلمانوں کی نظر میں اللہ اور God میں بہت بڑا فرق ہے۔ اللہ سے مراد وہ ذات ہے جس کا تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔ جس ذات کا تصور عیسائیوں نے پیش کیا ہے اسے وہ God کہتے ہیں۔ (دوسرے لفظوں میں "اللہ" مسلمانوں کا اور God عیسائیوں کا خدا ہے) God اور اللہ کا فرق اس مضمون میں باقی رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے اللہ کے بالمقابل "God" کے لئے میں نے اردو زبان کا دوسرا معروف لفظ "خدا" استعمال کیا ہے۔

بن کر تیار کیا تھا۔ نوبل دریو علی اور مارکس گریوی کی یاد حبشیوں کے دلوں میں ابھی تازہ تھی اور [illegible] چیز جو افریقہ سے تعلق رکھتی تھی اس سے انھیں محبت تھی۔ اس طرح فرد گھر گھر گھوم کر امریکی [illegible] جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب اور جداگانہ تہذیب کی کہانیاں سنایا کرتے [illegible] شوق اور دلچسپی، پھر آہستہ آہستہ جذباتی تسلی کی خاطر دھیان سے سنتے تھے۔ چند ہی برس کے عرصے میں فرد نے ڈیٹروائٹ کے حبشیوں کے دلوں میں اتنی جگہ پیدا کر لی کہ لوگ اپنے گھروں پر ان کا انتظار کرنے کے بجائے ایک جگہ اکٹھے ہونے لگے تاکہ فرد [illegible] کے آباء اجداد ان کے شاندار کارناموں سے واقف کرا سکیں جنھیں "سفید شیطانوں" نے [illegible] کی طرح تاریخ کی کتابوں سے محو کر دیا تھا۔

ابتدائے آفرینش کی کہانی جو فرد نے انھیں سنائی وہ کچھ ایسی تھی جسے امریکہ کے حبشیوں (اور یقیناً دنیا کے کسی شخص نے بھی) کبھی نہیں سنا تھا:

دنیا کے ابتدائی باشندوں کا اصلی رنگ سیاہ تھا۔ فطرتاً وہ لوگ نیک اور راست باز تھے، اور مکہ میں رہتے تھے چونکہ اس وقت ان میں رنگ و نسل کا کوئی فرق نہیں تھا اس لیے زندگی پر اطمینان تھی۔ اس طرح رہتے رہتے جب کچھ دن گزر گئے تو اللہ نے اپنے بندوں کا امتحان لینا چاہا۔

مکہ سے تقریباً ۲۰ میل دور (حضرت) موسیٰ کی پیدائش سے لگ بھگ ۲ ہزار برس پہلے ایک مشہور سائنسدان یعقوب نامی پیدا ہوا۔ یعقوب قسم قسم کے سائنسی تجربات کیا کرتا تھا۔ پے درپے کامیابیوں نے اُسے مغرور بنا دیا۔ (حضرت) ابراہیم جو صالحین کے سردار تھے۔ یعقوب کو غرور اور خدا سے سرکشی نہ کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد یعقوب نے اللہ کے بالمقابل ایک سفید نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بات سے ناراض ہو کر (حضرت) ابراہیم اور آبادی کے دوسرے لوگوں نے یعقوب کو اور اس کے پانچ ہزار نوسو ننانوے سیاہ فام متبعین کو شہر بدر کر دیا۔ یعقوب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ

[illegible] غیر آباد جزیرہ میں اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ یعقوب اپنے سائنسی تجربات کی وجہ سے جانتا تھا کہ انسانی جسم میں ایسے مختلف رنگوں کے خلیے ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک کو مردہ کر دے [illegible] میں تبدیلی لائی [illegible]۔ کچھ دنوں کے تجربے کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ جزیرہ میں پیدا ہونے [illegible] تین بچوں میں سے ایک بچے کا رنگ بادامی ہوتا تھا۔ [illegible] جوان ہوئی تو یعقوب نے یہ [illegible] کالے لڑکے اور لڑکی کی شادی آپس میں نہ کی جائے۔ میاں بیوی دونوں یا کم از کم ایک کا بادامی ہونا ضروری تھا۔ ایسی شادیوں سے جو بادامی بچے پیدا ہوتے ان کی اچھی دیکھ بھال کی جاتی لیکن جو سیاہ [illegible] پیدا [illegible] انہیں زچہ خانہ ہی میں یہ کہہ کر مروا دیا جاتا کہ وہ فرشتے بن کر اپنی ماں کے واسطے [illegible] گئے ہیں۔ یعقوب نے اپنی زندگی میں اپنے تجربہ کو بالکل کامیاب ہوتے نہیں دیکھا لیکن باہمی شادیوں کے جو اصول اس نے بنائے تھے ان کا اثر یہ ہوا کہ اس کے [illegible] سال بعد جزیرہ میں صرف بادامی رنگ کے لوگ رہ گئے۔ مزید دو سو سال [illegible] نسل بھی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ سرخ رنگ کی ایک نسل پیدا ہو گئی سرخ رنگ سے [illegible] دو سو سال اور لگے۔ اس کے بعد دو سو سال کے اندر زرد نسل، سفید نسل میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح مکہ سے نکلنے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد سفید فام نسل [illegible] نے سفید فام نسل تو پیدا کر دی لیکن جس خلیے کو مردہ کر کے اس نے [illegible] تبدیلی پیدا کی تھی وہی خلیہ درحقیقت "احساس حیا" پیدا کرتا تھا۔ جب وہ خلیہ ہی نہیں رہا تو سفید نسل میں شرم و حیا کا احساس کہاں سے پیدا ہوتا۔ سفید عورتیں اور سفید مرد ننگ دھڑنگ وحشیوں کی طرح جزیرہ میں زندگی گذار رہے تھے، جبکہ ان [illegible] اور اس کے ارد گرد مہذب زندگی بسر کر رہے تھے۔

[illegible] آپ کو انسانی ارتقا کی یہ کہانی چانڈو خانے کی گپ معلوم ہو لیکن امریکہ کے [illegible] پر، جو روایتی طور سے مذہباً عیسائی اور بائبل کے مختلف [illegible]

[illegible] اپنے [illegible] عام کے بلسے میں ان کا نظریہ بھی تو بائبل ہی کی
[illegible]یوں تک محدود تھا جو آدم وحوا اور موسیٰ و ابراہیم کی حکایتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنی اس کہانی
کو فرد بہت [illegible] کے کرداروں سے ملا دیا کرتا تھا۔ مسلمان جس شخصیت کو حضرت
آدم کے نام [illegible] ہیں وہ، فرد کی روایت کے مطابق اس کہانی کے یعقوب ہیں۔ جنھوں نے
[illegible] کے حکم سے سرکشی کی اور جنت سے نکالے گئے۔ وہ جنت، جس سے آدم (یعقوب) اور ان کی
اولاد نکالی گئی تھی، کہیں آسمان پر نہیں بلکہ اسی سرزمین پر مکہ میں تھی۔ جب آدم کی سفید فام اولاد
سیکڑوں برس تک جاہلی اور حیوانی زندگی گزار چکی تو اللہ کو ان پر رحم آیا اور انھیں تہذیب
کی دنیا میں واپس لانے کے لئے (حضرت) موسیٰ کو ان میں پیدا کیا گیا تاکہ وہ اپنی قوم کو (سفید)
اندھیرے سے نکال کر (سیاہ) اجالے میں لاسکیں۔ (حضرت) موسیٰ کے بعد (حضرت) عیسیٰ آئے
لیکن یعقوب نے جس بنیادی خلئے کو مردہ کر کے رنگ میں تبدیلی کی تھی وہ دوبارہ زندہ نہ ہوسکا
اور اسی وجہ سے مختلف پیغمبروں کی کوششوں کے باوجود سفید فام اقوام کی اصلاح نہ ہوسکی۔
اور نہ ہوگی۔

فرد نے امریکی حبشیوں کی نفسیات کو سمجھ کر "سیاہ" اور "سفید" کے تضاد پر اتنا زور دیا ہے
کہ اس کا ہر ماننے والا اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ "سیاہ" بہرصورت "سفید" سے بہتر ہے۔
کالے مسلمانوں کے ایک مشہور لیڈر مرحوم ملکم ایکس (MAZCOM X) نے جو بعد میں قرآن کے
مطالعہ اور دوسرے ایشیائی مسلمانوں سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد اپنے انتہا پسندانہ "اسلامی"
خیالات سے تائب ہوگئے تھے، سیاہ و سفید کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا تھا:

> سفید کوئی رنگ نہیں ہے۔ سیاہ ایک رنگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں سفید "نفی" ہے
> اور سیاہ "اثبات"۔ سفید کو جتنا بھی صاف کرو اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا وہ ہمیشہ
> سفید ہی رہے گا۔ لیکن اگر سیاہ کو صاف کرو تو اس سے مختلف درجات میں مختلف رنگوں
> کا ظہور ہوگا۔ ہوتے ہوتے ایک درجہ ایسا بھی آئے گا جہاں سیاہ صاف ہوتے ہوتے

سفید ہو جائے گا — بالکل سفید ... یہ ...

...س میں قوت تخلیق نہیں ... سیاہ "اثبات" ہے اور قوت تخلیق کا حامل ... کے ذہن میں نفسیاتی طور سے ان کی نسلی برتری کا احساس پوری ... کی نظر میں اس کی اپنی حیثیت ایک مافوق الفطرت ہستی کی ہو گئی تو اس ... شروع کیا۔ خدا (God) اور "خدا کے بیٹے" کی جگہ "اللہ" کر دی گئی۔ ... علاوہ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار پایا۔ کر تبلہ بند اور کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، اور تجارت و ملازمت کے آداب و اصول متعین کئے گئے۔ اس طرح امریکہ میں کالے اسلام کا موجد ... ایک دن ۱۹۳۳ کے آخر یا ۱۹۳۴ کے شروع میں "اللہ" یا "اللہ کا بندہ" ... پراسرار طریقہ سے امریکہ آیا تھا، اس طرح غائب ہو گیا۔ آج تک یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ اس شخص کا انجام کیا ہوا۔ فرد کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے متبعین ۲ گروہ میں بٹ گئے۔ اکثریت کا خیال ہے کہ وہ "اللہ" تھا اور اپنے بندوں کی مدد کے لئے امریکہ آیا تھا۔ یہاں اس نے انہیں صحیح راستے پر ڈال کر اور انہیں آنریبل جناب الیاس محمد (HON BL. MR ILIJA MUHAMMAD) کے ہاتھوں میں سونپ کر مکہ کو (جہاں سے وہ آیا تھا) واپس چلا گیا۔ دوسرا اقلیتی گروہ (جو اب تقریباً نہیں کے برابر ہے) فرد کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔ اس گروہ کے بقول فرد محمد انسان تھا، لیکن "سفید شیطانوں" نے اسے بھی نوبل ڈریو علی کی طرح اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر خفیہ طریقہ سے ختم کرا دیا۔

اس طرح اس صدی کے نصف حصہ تک امریکہ کا حبشی ہر اس کالے شخص کے پیچھے چلتا رہا جو "سیاہ قوم" کا جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا تھا لیکن حقیقت اس کی جذباتی تشنگی صرف ان لیڈروں سے ہوتی تھی جو پورے زور سے یہ کہنے کی جرأت رکھتے تھے کہ سیاہ ... الگ ہیں اور ان دونوں کا امتزاج ناممکن ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ نوبل ڈریو علی اور اس کے بعد فرد محمد ... نے جداگانہ قومیت کے ساتھ ساتھ جداگانہ مذہب پر زور دیا۔ فرد محمد اپنی تحریک کے پودے کو ایک تناور درخت بنے دیکھ سکے لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں الیاس محمد کے ایسا مستقل مل گیا تھا جس نے ان کے ... اور خیالات کو امریکہ کی ایک ہمہ گیر تحریک میں بدل کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر محمد

مسلمانوں میں حقّہ نوشی

حقّہ، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ایک گول ڈبے کے ہیں جس میں جواہر یا ادویہ وغیرہ رکھی جائیں اور کنایۃً دہن کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جب یہ لفظ فارسی کے دوسرے الفاظ سے مرکب ہوتا ہے تو اس کے مختلف معنی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، حقّۂ آتش، ایک قسم کا راکٹ یا گولا جو جنگ کے موقع پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی قسم کے حقّوں کے ڈھیر پر آگ لگنے سے شیر شاہ کی موت ہوئی تھی[۱]، حقّۂ بے مغز، (احمق)، حقّۂ سبز (فلک)، حقّۂ کلوس (فن موسیقی میں ایک راگ)، حقّۂ مینا فام (کرۂ آسمانی) اور حقّۂ مینا (آسمان)۔ فارسی زبان میں چند محاورے بھی لفظ حقّہ کی ترکیب سے وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً حقّہ بازی، (بازی گر، مداری، مجازاً بہ معنی عیار اور مکّار) حقّہ بردار (حقّہ بھرنے اور پیش کرنے والا) وغیرہ

مگر اس بات کی تحقیق مشکل ہے کہ لفظ حقّہ کا استعمال معروف آلۂ تمباکو نوشی کے معنوں میں کب سے شروع ہوا۔

غالباً ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں میں حقّہ پینے کا رواج نہیں تھا اور حقّہ نوشی کا یہ شوق اُنھیں ہندوستان سے ملا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ترکوں کے عہد میں مسلمانوں میں حقّہ نوشی کا رواج شروع ہو چکا تھا یا نہیں، اگر شروع ہو چکا تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[۱] عباس خاں سروانی۔ تاریخ شیر شاہی (اردو ترجمہ، پاکستان ۱۹۶۳ء) ص ۱۲۸ - ۱۲۹

وقت حقہ میں کیا پیا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد کی یہ روایت بھی کہ امیر خسرو حقہ پیتے تھے [illegible] لکھا ہے:

[illegible] ایک بڑھیا ساقن کی دوکان تھی، چنانچہ اس کا نام تھا شہر کے [illegible] پیا کرتے تھے، جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تشریف [illegible] تو وہ بھی سلام کرتی، کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی یہ بھی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔[1]

موٴرخوں کا خیال ہے کہ تمباکو امریکی لفظ ہے اور یہ لفظ اور تمباکو دونوں اکبری عہد میں ہندوستان پہونچے۔ اوّل اوّل تمباکو پرتگالیوں کی وساطت سے ہندوستان آیا۔ جزائر ہند اور دکن میں پہلے پہونچا[2]۔ مگر شمالی ہند میں اواخر عہد اکبری تک نہیں آیا تھا۔ شیخ ابو الفضل کا ملازم اسد بیگ [illegible] سال تک ان کی خدمت کرچکا تھا، اپنے وقائع میں لکھتا ہے کہ ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) کے قریب اکبر بادشاہ نے اس کو دکن بھیجا۔ بیجاپور کے قیام کے زمانے میں اس نے تمباکو دیکھا جو شمالی ہند میں بالکل ناپید تھا۔ اسد بیگ کا بیان ہے کہ اس نے تھوڑا سا تمباکو خرید لیا۔ ایک جڑاؤ حقہ تیار کروایا، جس پر میناکاری کا کام تھا اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ عقیق یمنی کی ایک خوبصورت مہنال خریدی۔ سونے کی چلم تیار کرائی اور چاندی کی نے لی، جس پر مخمل چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ان چیزوں کو بڑے سلیقے سے سجا کر مع دیگر تحائف کے اکبر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب بادشاہ کی نگاہ حقے پر پڑی تو وہ حیران ہوا۔ اس نے غور سے تمباکو دیکھا جو ایک چلم کی مقدار میں علحدہ علحدہ جما ہوا رکھا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ سب کیا ہے؟ اسد بیگ نے عرض کیا کہ اس کا نام تمباکو ہے۔ چونکہ مکہ اور مدینہ میں مروّج ہے اور اعلیٰ حضرت کے واسطے

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات (فیض آباد) ص ۸۷ [2] بقول پینانٹ ۱۶۷۱ء میں تمباکو [illegible]ستان پہونچا۔ ملاحظہ ہو The View of Hindastan جلد دوم، ص [illegible]

بطور دوا لایا ہوں" بادشاہ نے اسے حقّہ بھرنے کا حکم دیا۔ جب حقّہ تیار ہو گیا تو بادشاہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے پینا شروع کیا۔ اُدھر سے شاہی حکیم نے منع کرنا شروع کیا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے فرمایا "ہمیں اسد بیگ کی خاطر سے پینا چاہیے"۔ یہ کہہ مہنال منہ میں لے لی اور دو تین کش لگائے۔ بعد ازیں اسد بیگ کی طرف حقّہ بڑھا دیا۔ اس نے بھی دو گھونٹ لیے۔

[1] اسد بیگ کا بیان ہے کہ وہ تمباکو اور حقّے کافی مقدار اور تعداد میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے تھوڑا تھوڑا تمباکو اور ایک ایک حقّہ مختلف امیروں کی خدمت میں بطور تحفہ بھیج دیا۔ انھیں ایسا شوق لگا کہ ہر امیر نے تمباکو پینا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کی تجارت ہونے لگی اور تمباکو پینے کا چلن عام ہو گیا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے کبھی اس کی عادت نہیں ڈالی۔

[2] بھنڈاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اکبری سے پہلے تمباکو نوشی کا عام رواج نہ تھا۔ حکمار اور اطبّار کچھ امراض کے علاج کے سلسلے میں تمباکو پینے کا مشورہ دیتے تھے لیکن کچھ مخصوص افراد ہی برائے تفریح پیتے تھے۔ اس وجہ سے فرنگستان سے بہت کم مقدار میں تمباکو کی در آمد ہوتی۔ آخر کار ہندوستان میں بھی اس کی کاشت شروع ہوئی اور دیگر اجناس کی نسبت تمباکو پر زیادہ ٹیکس لگایا جانے لگا۔ جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) تک تمباکو کی کاشت کا عام رواج ہو چکا تھا؛ اور ہر کس و ناکس تمباکو استعمال کرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ امرار، وزرار، شرفار، نجبار، صلحار، زہدار، فضلار، شعرار، فصحار، حکمار اور فقرار سب کے سب اس کی طرف راغب ہو گئے تھے؛ اور دیگر اشیائے خوردنی اور نوشیدنی پر اسے ترجیح دینے لگے تھے۔ مہمان نوازی اور اظہار خلوص کا یہ ایک واحد ذریعہ بن گیا۔ تمباکو پینے کی لوگوں میں ایسی عادت پیدا ہو گئی تھی کہ اس کے عادی کھانا پینا ترک کر سکتے تھے مگر تمباکو ترک کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ عام طور پر ایک شخص

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسالہ تاریخ اسد بیگ (قلمی) ص ۳۶-۳۷ [2] سب سے پہلے تمباکو کی کاشت گجرات کے علاقے میں شروع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو The View of Hindustan. جلد دوم، صفحہ

... ہن سے کراہیت کرتا تھا اگر تمباکو پیتے وقت ایک شخص کسی دوسرے کا کھو جاتے
بغیر ایک ہی مہنال سے اُس کا حقہ پیتے

... م رواج ہو گیا۔ چھوٹے بڑے، امیر فقیر سب ہی اس ... نے ۱۶۱۷ء میں ایک حکم نافذ کر کے تمباکو پینا قانونی طور پر ممنوع ... جہانگیری میں لکھتا ہے:

چوں اسطعہ از ساد تمباکو کہ در اکثر مزاجہا و طبیعت با مقرر است، فرمودہ بودم کہ ہیچکس متوجہ ... برادرم شاہ عباس نیز بہ ضرر آں مطلع گشتہ، در ایران می فرماید کہ ہیچکس مرتکب کشیدن ... نگردد۔ چوں خان عالم بعداوت کشیدن تنباکو بی اختیار ... امر قیام و اقدام می نمود، یادگار علی سلطان ایلچی دارائے ایران ... می نماید کہ خان عالم یک لحظہ بی تنباکو نمی تواند بود۔ جواب ... ازیں بیت مرقوم می سازد ؎

رسول یار میخواہد کہ کند اظہار تنباکو — من از شمع وفا روشن کنم بازار تنباکو

خان عالم نیز در جواب بیتے گفتہ فرستادہ است

من بیچارہ ... عاجز بودم از اظہار تنباکو — زلطف شاہ عادل گرم شد بازار تنباکو

چونکہ عوام اس تمباکو نوشی کے بے حد عادی ہو چکے تھے لہٰذا شاہی حکم بھی انھیں اس فعل سے باز نہ رکھ سکا اور وہ شاہی حکم کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور رہے[5]۔ ایسے مجرموں کو شہر میں گشت

---

[1] سبحان رائے ... خلاصۃ التواریخ (دہلی ۱۹۱۸ء) ص ۴۵۴

[2] شاہ عباس، ایران کا بادشاہ اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ اس نے ۱۵۸۸ء تا ۱۶۲۹ء ایران پر حکومت کی تھی۔

[3] عہد جہانگیری کا ایک امیر جسے بادشاہ نے اپنا سفیر بنا کر شاہ عباس کے دربار میں بھیجا تھا۔

[4] تزک جہانگیری (فارسی)، ص ۱۸۳۔ نیز ملاحظہ ہو۔ بھنڈاری۔ خلاصۃ التواریخ ص ۴۵۵

[5] تزک جہانگیری (انگریزی ترجمہ) ج اول ص ۳۷۰.

کرایا جاتا تھا اور اس جرم میں بعض لوگوں کے ہونٹ تک کٹوا لیے گئے تھے مگر اس سختی کے باوجود یہ مرض روز بروز بڑھتا ہی رہا[۱]۔

[illegible] سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ تمباکو کا استعمال کتنا عام ہو چکا تھا۔ اس [illegible] نے میں وہ ملتان میں مقید تھا اس کے نگہبانوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ انھیں کچھ روپے عنایت کرے تاکہ وہ لوگ تمباکو خرید کر حقہ پی سکیں۔ [illegible] [illegible] منظور کرنی پڑی[۲]۔

[illegible] بہت مقبول ہو گیا تھا اور وہ لوگ اس کے بری طرح عادی ہو چکے تھے [illegible] کھانے کے بعد حقہ پینا ان کا مرغوب ترین مشغلہ تھا، اور یہ شغل فطرت ثانیہ بن چکا تھا[۳]۔

لہٰذا تمباکو کی کھپت اتنی بڑھ گئی تھی کہ صرف دہلی شہر سے بطور ٹیکس پانچ ہزار روپے کی روزانہ آمدنی ہوتی تھی۔ منوکی بڑی حیرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ قارئین اس سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ [illegible] بڑے ملک نے تمباکو کے ٹیکس کی صورت میں سرکاری خزانہ کو کتنی بڑی رقم حاصل ہو گی[۴]۔ بعد [illegible] اورنگ زیب نے تمباکو سے محصول اٹھا لیا تھا۔ اس سے تمباکو پینے والوں کو بے حد اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی تھی اور اس سے غریبوں کو بہت فائدہ پہنچا تھا[۵]۔

چونکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں حقہ خاص و عام میں مرغوب خاطر تھا اس وجہ سے شاعروں اور ادیبوں نے تمباکو اور حقہ کی تعریف و توصیف میں طبع آزمائی کی ہے، جو اس کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ لعل چند منشی نے ذیل کے اشعار تمباکو کی تعریف میں کہے ہیں:

---

[۱] سجان رائے بھنڈاری۔ خلاصۃ التواریخ ص ۴۵۴ [۲] منوکی۔ سفرنامہ (انگریزی) ج دوم، ص ۵۴
[۳] منوکی۔ سفرنامہ انگریزی ج دوم ص ۱۷۵، نیز ملاحظہ ہو۔ کرویس۔ سفرنامہ۔ ج اول، ص ۱۴۹
[۴] منوکی۔ سفرنامہ۔ (انگریزی) ج دوم، ص ۱۷۵
[۵] ایضاً ج دوم، ص ۱۷۵

[illegible] زہے نامش کہ تنباکو نہادند [illegible]
[illegible] کس شادمانی   بہ کیفش انبساط دو جہانی
[illegible] بجز ابر بہاری   کند بر باغ دلہا آبیاری
[illegible] کس سرمایۂ عیش   نہ یارا آں کہ بازم کم از بیش[1]

[illegible] مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں حقہ مقبول تھا اور اکبر بادشا[ہ کے عہد میں مس]لمانوں میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، اِن صدیوں سے دونوں قوموں کے امیر و غریب افراد بڑے چاؤ سے اس کا شغل کرتے تھے۔ مذہبی اور غیر مذہبی جشنوں کے موقعوں پر مہمانوں کی حقے سے تواضع کی جاتی تھی[2]۔ شاہانِ مغلیہ، امرا اور یہاں تک کہ غربا بھی سفر اور حضر میں حقہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مغلیہ سرکار میں "تنبول خانہ" ایک علیٰحدہ شعبہ تھا اور اس کا انتظامی عملہ داروغۂ تنبول خانہ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ تیونگ نے ایک امیر کا ذکر کیا ہے جو حقے کا شیدائی تھا اور ایک رتھ پر سفر کر رہا تھا۔ اور حقے کے کش بھی لگاتا جاتا تھا۔ آٹھ یا دس فٹ لمبی ایک پیچوان ایک حقہ کے چاروں طرف سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ نیچے برتن نما ایک تلا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کش لگانے پر دھواں اس پانی سے گزرتا تھا جس کی وجہ سے ٹھنڈا اور صاف ہو جاتا تھا۔ رتھ کے ساتھ ایک شخص اس آلے کو ہاتھ پر لیے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا[3]۔

بادشاہوں کی طرح امرا بھی اپنی مخصوص محفلوں میں حقے سے شغل کرتے تھے۔ طباطبائی نے [illegible] خان کی مجلسوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رات کو نواب اپنی مسند پر جلوہ افروز

---

[1] بھنڈاری نے تنباکو کی بہت تعریف کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ ص ۵۵۴، بعد میں، اس نے [illegible] مذمت بھی کی ہے۔ ایضاً ص ۵۵۴   [2] ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔ ص ۲۹

[3] Travels in [illegible] ص ۱۳۶

ہوتا تھا۔ اس کے فوراً بعد میر معصوم فاضل، نقی قلی خاں، حکیم ہادی خاں اور مرزا احتشام صفوی ... بعد ازیں سب کے سامنے حقے بھر کر رکھ دیے جاتے تھے۔ وہ لوگ حقے پیتے باتیں کرتے رہتے تھے۔[1]

... امیر بادشاہوں اور اعلیٰ درجے کے امیروں کا بڑا احترام کرتے تھے ... نہیں پیتے تھے۔ اسی طرح لڑکے اپنے والدین کے سامنے اس شغل سے باز رہتے تھے۔

دو قسم کا تمباکو حقے میں استعمال ہوتا تھا۔ پہلی قسم جلسہ تھی جو پتوں کو سکھا کر چلم میں بھر دی جاتی تھی اور دوسری مصنوعی جو دیگر اشیا کو، مثلاً گڑ وغیرہ، ملا کر تیار کی جاتی تھی اور خمیرہ کہلاتی تھی۔ ... اور خمیرہ کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ حقہ پیتے وقت پہلے ٹھنڈے پانی سے حقہ تازہ کر لیا جاتا ہے بعد ازیں چلم میں تمباکو جما کر، اس پر انگارے رکھ کر، چلم حقہ پر رکھ دی جاتی ہے۔ سودا نے اس ضمن میں ایک پہیلی کہی ہے:

اگر تیرے جل بھری سر پہ لاگی آگ   باجن لاگی بانسری سونکسن لاگے ناگ

حاتم

کرے ہے غسل وہ ہر دن مکرر   ہمیشہ ... ہے تازہ و تر

چونکہ چلم میں آگ رکھنے پر وہ ٹھنڈی ہونے لگتی تھی اس لیے مسلمانوں نے سرپوش ایجاد کیا۔ یہ سرپوش چاندی کی ایک زنجیر سے باندھ دیا جاتا تھا تاکہ ضرورت کے وقت تلاش نہ کرنا پڑے۔ حاتم نے اپنے شعر میں یوں بیان کیا ہے:

یہ کیا سرپوش کی تقصیر ہے گی   گلے میں اس کے کیوں زنجیر ہے گی

بناوٹ کے لحاظ سے حقے کی صدہا قسمیں ایجاد ہوئیں مگر دو طرح کے حقے عام طور سے استعمال

---

[1] سیر المتاخرین (فارسی) ص

کیے جاتے ہیں۔ چھوٹا حقہ، تلی یا قلیان، یا گڑگڑی کہلاتا ہے۔ [illegible]
اور اسے ہاتھ میں لے کر پیتے ہیں۔ دوسرا حقہ، جسامت میں تلی سے بڑا ہوتا ہے۔ اسے حقہ کہتے
ہیں۔ بادشاہوں [illegible] چاندی کے بنے ہوتے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے حقے
کی مہنال کی تیاری میں پانچ ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر
[illegible] حقہ بھی لے گئے تھے اور وہاں بھی ضروری سامان مہیا کر لے [illegible]
[illegible]

[illegible] رھویں اور انیسویں صدی کے ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی حقہ
[illegible] پر میلے ٹھیلے کے موقعوں پر جب وہ باغوں اور دیگر سیرگاہوں میں [illegible]
[illegible] اور اراذل کی مستورات حقہ بھی ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ [illegible]
بھی محفل رقص میں حقے کے کش لگایا کرتی تھیں۔ یہ انداز بڑا دلکش اور دلفریب ہوتا تھا۔ شاہی
[illegible] میں بھی اس وبا سے محفوظ نہ تھیں۔ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی سحر البیان میں اس
کی طرف اشارہ کیا ہے:

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لے　　　چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

مختصر یہ کہ ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں میں حقہ نوشی کا رواج تھا، یہاں تک کہ بیرونی ممالک
کے باشندے [illegible] ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بھی حقہ پینے لگے تھے ریٹوننگ اپنے ساتھ کچھ حقے
[illegible] لے گیا تھا۔

[illegible] حقے کا اتنا شیدا تھا کہ اس نے جعفر علی خاں زکی سے حقے پر مثنوی لکھنے
کی فرمائش کی [illegible] مکمل نہ کر سکے اور بادشاہ نے شاہ حاتم کو حکم دیا کہ اسے تمام
[illegible]

[illegible] علی خاں زکی کے ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں:

حاکم کو نہ جانوں کیا سبب ہے　　　ملا ہے گڑ سے اور کیوں گڑ طلب [illegible]

طلب گُڑ کی اسے ہے اس سبب سے [illegible] لائے گُڑ آسے پیارے کے لب سے

شاہ حاتم کی [illegible] مثنوی "در وصف[1] تنباکو وحقہ" نقل کی جاتی ہے کیوں کہ اس کے استعمال سے [illegible] عام استعمال پر روشنی پڑتی ہے ، اور اس عہد کی معاشرتی زندگی میں دلچسپی رکھنے [illegible] نہایت اہم ماخذ بھی ہے ۔

مثنوی در وصف تمباکو وحقہ

تنباکو[2] نہ جانوں[3] کیا سبب ہے — ملا ہے گُڑ سے اور کیوں گُڑ طلب ہے
طلب ہے گُڑ کی اس کو اس سبب سے — ملا دے گُڑ آسے پیارے کے لب سے
اگر[4] تب گُڑ اکو نام پایا — سبھوں نے چاہ[5] سے تب منہ لگایا
کہ ہے تلخ پر میٹھا ہے گُڑ سے — مٹھائی گُڑ کی ہے گی اس میں دہر دکندا سے
کہے حقہ[6] تنباکو کیوں جلے ہے — کہ گنگا جل[7] ترے پاؤں تلے[8] ہے
اگن کو آب نے[9] سے لے بجھا دے — دگرنہ باعث جلنا بتا دے
ہوا ہوں سوکھ کر میں خشک اور زرد — یہی صورت[10] ہے میری دیکھ بے درد

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ، ص ۱۴۴ [2] مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ آیا یہ مثنوی شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ سے اخذ کی گئی ہے اور متن کے قائم کرنے میں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی نشان دہی ہر جگہ لازماً نہیں کی گئی [3] تماکو [4] جاننا۔ اب یہ لفظ متروک ہے [5] گُڑ ملا پینے کا تنباکو [6] شوق [7] حقا۔ اس زمانے میں حقہ الف سے لکھا جاتا تھا۔ اب الف سے لکھنا متروک ہے۔ [8] گنگا کا پانی ، حقے کا پانی [9] نیچے [10] آگ [11] حقے کی وہ نلی جس کے ایک سرے سے چلم رکھتے ہیں اور دوسرا پانی میں ڈوبا رہتا ہے

کبھی رو رو کے میں ہوتا ہوں تر نم — کبھی میں بھڑک [illegible] ہوں غم سے ہر دم

کبھی گویا کبھی خاموش ہوں میں — انگاروں سے کبھی گلپوش ہوں میں

سرا اوپر [illegible] — ازل سے مجھ کو جلنے کی ہوا ہے

قدم سے میرے محفل ہوئی ہے باغ [illegible] — چمن میں رشک سے لالہ کو ہے داغ

[illegible] — نمونہ دود کا ہر [illegible] ہے سنبل

[illegible] صف اپنے دودماں کا — ہر ایک بندا ہے میرے خانداں کا

کبھی ہر آن ہے احوال میرا — کہ جیسے عشق ہے مہمان میرا

مجھے تو یار کے لب سے ملا دے — جلا دے، پھونک دے یا پھر جلا دے

مری صحبت سے آتشتاب لئے ہے — اگرچہ نام اس کا آب [illegible]

کہو فوارہ آتش بار اس کو — بجز جلنے، نہیں کچھ کار اس کو

چلم گل آب لئے، ڈنڈی بسم ہے — ہوئی نے نل، دمن اس پر چلم ہے

اگن میں پھول اور ڈنڈی ہے جل میں — گل خورشید ہے شکل کنول میں

کنول میں کوئلہ مثل بھنور ہے — بھنور پر پنجرۂ سرپوش زر ہے

[illegible] سرپوش کی تقصیر ہے گی — گلے میں اس کے کیوں زنجیر ہے گی

یہ چنبر رنگ [illegible] خ چنبری ہے — کہ جس کی آوٹ میں آتش بھری ہے

چلم [illegible] بھری خواہاں کھڑے ہیں — انگارے لعل کے جوں نگ جڑے ہیں

تنباکو کا سنا حقے نے احوال — ہوا یکبارگی نالاں و بے حال۔

---

۱ کبھو۔ اب اس کا استعمال متروک ہے ۲ تر اور نم۔ بھیگنا ۳ بولنا، آواز کرنا ۴ چلم کے اوپر رکھنے کا آلہ [illegible] سرپوش ۵ غلام ۶ رقت، لمحہ، لحظہ ۷ آتش دان ۸ آتش دان [illegible]، یا بھری ۱۱ چلم کا ڈھکنا ۱۲ چرخ، آسمان۔ چنبر، حلقہ۔ آسمان کا حلقہ

کہا نیچے سے تب سو آرزو سا تھ　　کرے گا کام ہم سب کا ترے ہاتھ
[illegible] پیچ کما کر　　جبیں پر چیں چڑھا سینہ [illegible]
[illegible] کی خبر رکھ　　ان اپنے دل جلوں اوپر نظر رکھ
[illegible] بان حقہ پلایا　　اکرم کر، لے کے نیچا مُنہ لگایا
لگا کر لب سے تب یکدم میں پینے　　عزیز اب کر دیا عالم میں [illegible]
کی محبوب کے جس وقت گھونٹ نے　　وہاں شرمندہ ہو پانی ہوئے [illegible]
لگا مُہنال تب حق حق پکارا　　کہ جوں منصورؒ آیا پھر دوبارا
کبھو حق حق کبھی ہُو ہُو کہے ہیں　　کبھی دم کھینچ کر چپ ہو رہے ہیں
[illegible] میں صدای سر سری جان　　کنہیّا ہاتھ گویا بانسری جان
بجایہ ہاتھ وحقہ دینے لی ہے　　چوں مطرب ہاتھ چلّی دارنی پکڑ کرلیا
[illegible] سر سالوی بڑا ہاتھ [illegible]　　یہ کالے پر تو کالی کینچری بوجھ
بڑا نیچوں میں نیچا پیچوان ہے　　کہ سب رو ہمسر زلف بتاں ہے
بہار گلشن و رشک ارم ہے　　سراپا تاک جوں پُر پیچ و خم ہے

ٖلہ محبوب ٖلہ محبوب ٖلہ منہ ٖلہ وحدت الوجود کے فلسفہ کی تاریخ میں ابوالمغیث حسین بن منصور حلاج کو دار پر چڑھائے جانے کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اَنا الحق، کہنے کے جرم میں ۲۴ ذیقعد ۳۰۹ھ میں منصور کو بغداد میں سولی پر چڑھایا گیا تھا برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ داراشکوہ، سفینۃ الاولیا (اردو ترجمہ) ۱۸۳، ۱۸۴، خزینۃ الاصفیا۔ ج دوم۔ ص ۱۷۸ - ۱۸۳

Encyclopaedia of Religion and Ethics VI. PP. 480-482

ٖلہ کرشن بھگوان کو کنہیا بھی کہتے ہیں۔ وہ بانسری بجانے کے فن کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی بانسری مرلی کہلاتی ہے ٖلہ [illegible]

قیس اور غم نہ پوچھو دستگی ہے ... رشتہ دل بستگی ہے
جلوس دست محبوباں ... ہے نیچا
بھوڑ کی پان کی بو سے رچا ہے گلاب و مشک و عنبر میں بسا ہے
نہیں ہے حقہ گر ... ہے کہ چیرا کو چکی ...
... خورسند ہے گا عجب معشوق کلغی بند ہے گا
بجا ... ہو گر اس کا میداں کہ حقہ گوشئے اور ئے ہے چوگاں
... آتش بسر ہے قدمے نہیں اس کی سوراخ جگہ ہی (کذا)
یہاں گلدستہ لانے کیا چلی ہے تنباکو گل ہے اور ... گل ہے
کہ ... ہے طعنہ اب حقہ فلک پر کہ میں ہوں خوبتر تجھ سے معد
... شکوہ ہر اک جا میرے مشتاق ہیں اعلیٰ و ادنا
... گھرے مجکو تزئیں بنا ہوں موتیوں سے عقد پڑوین
... معشوق ملناز کہ ہوویں ایک دم رہ مجھ سے دمساز
زمین پر جا بجا کرتے نظارے جھڑیں ہیں فیض سے میرے ستارے
اگر تارے نہ ہوتے آسماں میں سہانا کس طرح لگتا جہاں میں
اسے دن رات مہرو مہ جلا ہے مرا بھی چاند سورج خوانچا ہے

۱؎ معطر ہونا ۲؎ نہیں اصل نسخہ میں ۳؎ ڈھال یا آفتابی ۴؎ ایک قسم کی منقش پگڑی ... تاج ۔ ٹوپی یا ... کے خوشنما ... ۸؎ گینڈ ... ۹؎ عقد ثریا ۔ بنات ... چھوٹا خوان ، تھال ...

[illegible] انڈوی یہ زردوزی کی [illegible] — [illegible] پاؤں میں ہے خلخال [illegible]
سحر خورشید کا کردار (کذا) بنایا — ستارا صبح کا مجھ پاس لایا
[illegible] یہ میں پیش کش لایا ہوں بھیجو — اسے حقے کا زیر انداز کیجیو
[illegible] گروہ ہو انڈوی کے ہمراہ — کہ جس کی جوت سے تاریک ماہ
[illegible] اس گرد کروی کی سراسر (کذا) — گویا خورشید نکلا ہے زمیں پر
ہے حقہ یار، یاروں دل جلوں کا — ہے حقہ درد میں مونس سبھوں کا
[illegible] کو اس کا پینا سود ہے گا — دھواں طفلاں کے حق میں دودھ ہے گا
[illegible] آپ سے جب تک نہ بولو — کھلے نہیں پیچ سے جب تک نہ کھولو
[illegible] جس کے پاس یکدم آ رہتا ہے — وہی اس کے تئیں سلگا رہتا ہے
مزا اس تلخ وش کا آئے اس کو — جو کڑوا گھونٹ پی لے جائے اس کو
کسو نے اس کی کیفیت نہ جانی — کہ کیوں کر ایک جا ہیں آگ و پانی
مخالف طبع اور باہم ہیں یکجا — تماشا ہے، تماشا ہے، تماشا
[illegible] ان دونوں سے وہ بولے گڑگڑ — ملے ہیں بلکہ اس میں چار عنصر
تعمق کی نگہ سے دیکھ دم کش — جمع ہیں خاک و باد و آب و آتش
ہوا ہے جیسے پیدا وہ عدم سے — جلے ہے دم بدم سر تک قدم سے
ہے از بس آگ میں جلنے کو موجود — دل پُر سوز و نالاں سینہ پُر دود

[illegible] انڈوا (مذکر) انڈوی (مؤنث) پرانے کپڑے یا بان کا حلقہ۔ اس کو سر پر رکھ کر بوجھ اٹھاتے ہیں اور گھڑوں اور مٹکوں کے نیچے بھی رکھتے ہیں۔ حقے کے تلے کے نیچے بھی رکھی جاتی تھی تاکہ اس کا پیندا ادھر اُدھر کھسکانے پر نہ گھسے [illegible] پازیب [illegible] تحفہ [illegible] روشنی [illegible] ہے۔ اب یہ لفظ متروک ہے [illegible]
اب یہ لفظ متروک ہے [illegible] کڑوا [illegible] چار اصل جزو۔ خاک، ہوا، پانی اور آگ۔ [illegible] غور

غلام اس کے تجرد میں [illegible] — کنیزک اس گھرانے کے جیتے ہیں (کذا)

[illegible] — سدا ہے [illegible]

[illegible] ہے کا درویشی کے فن میں — اُسے خلوت ہے ہر دم انجمن میں

[illegible] لیا یار بشش ہے — کہ ہر دم جس کے تئیں پاسِ نفس ہے

ہے [illegible] کے دم کی دن [illegible] — ممدّ ہم حیات، ہم فرحت ذات

ہے سب کے مذہب و مشرب آگاہ — ہے ہر یک محفل اندر اس کے تئیں راہ

جہاں [illegible] — کیا ہر دخل جا کر کفر و دیں میں

[illegible] آشنا دونوں سے یکساں — طلبگار اس کے ہیں ہندو مسلماں

بتاں سے ہے کبھی ہر دم و ہم آغوش — کبھی جوں برہمن زنار بر دوش

ہے [illegible] مجلس و مجلس کا صاحب — جہاں دیکھو تہاں سب کا مصاحب

[illegible] اہلِ معنی ہے سراپا — مثالِ چنگ ہے خاموش گویا

[illegible] عاشق سیرت و معشوق صورت — ملے ہے نیک و بد سے بے کدورت

[illegible] ہر دم ہے یار سب کا — شب تنہائی میں غمخوار سب کا

قبولِ خاطرِ شاہ و گدا ہے — بہفتاد و دو ملت آشنا ہے

کرے ہے غسل وہ ہر دن مکرر — ہمیشہ سے رہے ہے تازہ و تر

حکیم اس کو اگر کہیے بجا ہے — کہ ہر یک مرض کو اس سے شفا ہے

کوئی حقہ، کوئی تلیاں کہے ہے — کوئی حکمت میں صحت جاں کہے ہے

[illegible] لے صاحب اللہ اک — بقدر حوصلہ معجون و تریاک

---

۱ صوفیوں کی اصطلاح میں بآواز بلند یادِ الٰہی کو "ذکر جلی" کہتے ہیں ۲ کافی ہے ۳ مددگار ۴ سے ۵ مانند [illegible] مسلمانوں کے [illegible] ۶ ایک خاص قسم کی معجون جو زہر کے اثر کے دفع کرنے کیلئے بناتے ہیں۔

کوئی پیوے، کوئی سونگھے، کوئی کھائے — جہاں دیکھو وہ ہے موجود سب جائے
کوئی چھوٹا جہاں میں اس (سے) کم ہے — تنباکو گر نہیں گڑ کا دم ہے
تنباکو خوب سے جیسا ہے — وگرنہ اور تو کچھ کھیل سا ہے
... تو دختہ ہیچ ہے گا (گنا) — بجز دونوں کے سب کچھ ہیچ ہے گا
وحقہ لائق شاہاں بنا ہے — ... گڑگڑی کا آشنا ہے
... سبھی تیئں سب برابر — کوئی ہو کیا غریب اور کیا تونگر

تمام عالم میں حاتم ڈھونڈھ آیا
پر ایسا دوسرا ہمدم نہ پایا

حقہ سازی کی صنعت

حقے کی مقبولیت کی وجہ سے ہندوستان میں حقہ سازی کا فن بھی ایک آرٹ بن گیا۔ اور یہاں کے چھوٹے بڑے شہروں اور دیہاتوں کے بازاروں میں عمدہ منقش حقے یا چلمیں اور تعلیاں بکتی تھیں۔ ٹیونگ نے دہلی کے چاندنی چوک کی ایک دوکان کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

"ایک دکان کو دیکھ کر جہاں حقے کی قغلیاں بکتی تھیں، میں نے اس کی طرف اپنا گھوڑا بڑھایا۔ دکاندار نے کئی قغلیاں میرے سامنے رکھ دیں، میں نے عمدہ فنکاری کے نمونے چن لیے، کیوں کہ دہلی اس صنعت کے لیے بہت مشہور ہے۔"

مختصر یہ کہ مسلمانوں نے حقے سے متعلق کئی اختراعات کیں۔ حقہ، ویچوان، سٹک،

۱۔ جگہ ۲۔ ایک قسم کا بھر بھرا تنباکو ۳۔ ایک طرح کا چھوٹا حقہ

فتح پیچ، (ایک قسم کے حقے کا نیچہ) مداریا (سٹک، پیچوان، ایک قسم کا چھوٹا حقہ) ہردم تازہ اور فرشی وغیرہ اصطلاحیں بنائیں۔ چلم پر ٹوپی رکھی، مہنال اور زنجیر کا اضافہ کیا۔ موسم گرما میں اس کو خس سے ٹھنڈا کیا۔ عطریات سے بسایا، خوشبودار خمیرے تیار کیے۔

آج کل شہروں سے حقہ پینے کا رواج اٹھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہاں کی زندگی تگ ودو کی شکار ہے اور شہریوں کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اطمینان کے ساتھ حقے کے چند [illegible] لہٰذا سگریٹ، سگار اور بیڑی سے کام چلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دیہات میں اب بھی حقے کا رواج ہے۔ اس لیے کہ حقہ کا اہتمام جس سکون کا طالب ہے وہ مشینوں کے ساتھ [illegible] زندگی میں نہیں مل سکتا۔ سگریٹ، اور حقے میں ظاہر اور باطن کے اعتبار سے جو فرق ہے وہی در اصل انیسویں اور بیسویں صدی کی معاشرت اور اقدار کا بھی فرق ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

بچے کو مدرسے سے گھر لوٹنے میں کچھ دیر ہوئی اور ماں کو گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں کھیل کود میں چوٹ نہ لگ گئی ہو، کسی سے لڑائی جھگڑا نہ ہو گیا ہو [illegible] استاد [illegible] مدرسے کی لاری، راستے میں نہ ٹکرا گئی ہو۔ بچے کو معمولی سا نزلہ زکام ہوا [illegible] اور باپ کی پریشانی بڑھی۔ اسے بلاؤ، اُسے دکھاؤ۔ یہ احتیاط، وہ پرہیز۔ جتنا کوئی عزیز ہوتا ہے، اتنی ہی اس کی فکر بھی ہوتی ہے۔ جس قدر کسی کام کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کے بارے میں طبیعت پریشان رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ناخوشگوار بات سوچنے کے لیے ہمارا ذہن ہر دم مستعد رہتا ہے اور سیدھی سادی صورت حال سمجھنے کے لیے ذرا مشکل ہی سے آمادہ ہو پاتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ موقعے کی نزاکت، گھبراہٹ پیدا کرتی ہے اور جب گھڑی ٹل جاتی ہے یا بات بن جاتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ دل بھی چین سے ہو جاتا ہے۔ یوں کچھ نہ کچھ پریشانی کبھی نہ کبھی ہر ایک کو ہو جاتی ہے۔ کوئی دل "بے خلشِ مدعا" نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خارِ حسرت کی چبھن اور شکست آرزو کی دُکھن کا مزہ چکھے بغیر ہی زندگی بسر ہو جائے۔ لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہر وقت حیران، پریشان رہتے ہیں۔ وہ حالات کی اونچ نیچ پر نہ تو ٹھنڈے دل سے سوچتے ہیں اور نہ مناسب کارروائی کرتے ہیں بلکہ امکانات کے دھندلکے میں ٹامک ٹوئیے مارتے رہتے ہیں۔ محض سوچ سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ ماحول کی گرانی کو دور کرنے کے لیے کچھ کرتے نہیں، صرف کڑھتے ہیں۔ فکروں کو دُور کرنے

کی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے اُن میں گھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب یہ رجحان طبیعت میں طرح بس جاتا ہے احساس کا رنگ گہرا ہوجاتا ہے تو مزاج [illegible] زندگی اندیشہ ہائے دور دراز سے عبارت ہوتی [illegible] کیفیت، اپنی لیاقت اور صلاحیت سے پورا [illegible] اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ اپنے گرد ایک سوگوار فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ناکامی محرومی کا احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اپنی نگاہوں میں اپنی قدر گھٹنے لگتی ہے۔ نکماپن روز بروز بڑھتا [illegible] کو گھن لگ گیا، فکر کا گھن!

پریشانی دراصل [illegible] جذباتی ردِعمل ہے جس سے ذہنی کشاکش کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا آدمی بوکھلایا ہوا [illegible] ہے اور اضطراری کیفیات کا مرتکب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بلاوجہ ہاتھ ملے جاتا ہے، کوئی ہونٹ چباتا ہے، کوئی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگتا ہے، کوئی چہل قدمی ہی کیے جاتا ہے۔ [illegible] کی دنیا بھی ہیجان سے خالی نہیں ہوتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، خون کا دباؤ [illegible] اور جسم کے اندر مختلف رطوبتیں خارج ہونے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی بے چینی کے کرب میں دورے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جوشِ وحشت میں آدمی اپنے آپ ہی کو جھنجوڑ ڈالتا ہے یا جس پر بس چلتا ہے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑ پڑتا ہے۔ مثلاً جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی چھت سے [illegible] ہے تو کوئی اپنے معصوم بچے کو ہی پٹخ دیتا ہے۔ اس لمحے ہوش کی دنیا اتنی سکڑ کر رہ جاتی ہے کہ اپنی سُدھ بُدھ ہی باقی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریشان [illegible] ات میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس کے لیے دنیا کے تماشے میں کوئی کشش ہی نہ [illegible] طرح بسر کرنے لگے جیسے خود اپنا ہاتھ پکڑ کر چل رہا ہو اور اُس کا وجود بے حسی کی گرد میں اَٹ کر رہ جائے۔

[illegible] اکثر محرومی پر ایک نقاب بھی ہوا کرتی ہے۔ جب زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور سنبھالے [illegible] وہم پریشانیوں کو گلے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر معمولی سا واقعہ ایک حادثہ سمجھ لیا جاتا [illegible] مرحلہ بن جاتا ہے۔ زندگی کی ساری اُدھیڑ بُن ہی یہ ہو جاتی ہے کہ کسی طرح

فکروں سے نجات حاصل کی جائے۔ گویا پریشانی سے بچنے کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ متفکر ذہن دراصل ایک ہی وقت میں حال اور مستقبل دونوں زمانوں میں رہنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر واقعی کوئی سانحہ قسمت میں لکھ گیا ہے اور رونما ہو کر رہے گا تو پھر تردد بے جا سے کیا حاصل ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ فکرمندی کی بدولت اس سانحے کا غم ایک بار نہیں بلکہ دو بار [illegible] ہے۔ پہلی مرتبہ اُسے سوچ کر اور دوسری مرتبہ اُسے جھیل کر۔ ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ جاگتے ہوئے ہم اچھا کیوں نہ سوچیں۔ خواب تو بُرے بُرے آ سکتے ہیں کیونکہ اُن پر اپنا قابو نہیں ہے لیکن بیٹھے بٹھائے امکانی خطرے مول لیتے رہنے کو کس نے کہا ہے۔ مگر فکروں کے جالے کو اپنے ذہن پر لپیٹ کر ہم ناکامی کے اقرار کی ذلت اور کامیابی حاصل کرنے کی ذمہ داری دونوں سے بزعم خود بَری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

ذرا غور سے دیکھیے تو یہ بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ پریشانی کی تہہ میں خوف چھپا ہوا ہے۔ ہمیں یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اتنے اچھے نہیں ہیں جتنا آج تک اپنے آپ کو سمجھتے رہے ہیں یا اپنے [illegible] سے آس لگائے رہے ہیں۔ ہمیں گھبراہٹ ہوتی ہے کہ جو چاہتے ہیں اُسے حاصل نہ کر سکیں گے۔ پے در پے ناکامیاں، حوصلہ پست کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت اپنے اوپر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ صحت، دولت، عزت، آل اولاد سب ہی کی طرف سے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ فکروں میں گھلنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ محض امکانی خطرات کے انتظار میں گھڑیاں گنی جا رہی ہیں۔ خوف اور فکر میں صرف اس قدر فرق کیا جا سکتا ہے کہ وہ صورت حال پر مبنی ہوا کرتا ہے اور یہ مآلِ کار سوچ سوچ کر بڑھتی ہے۔ متفکر ذہن، خواہ پریشانی میں الجھا ہوا ہو یا بے حسی میں کھویا ہوا، بہرحال انجام کے خیال سے سہما ہوا ہے۔

یوں تو خوف مناسب اور واجب بھی ہوتا ہے۔ پچھلا تجربہ یا حالات کا جائزہ بجا طور پر احتیاط برتنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ناگوار نتائج یقیناً جھجک پیدا کرتے ہیں۔ لیکن "بے بات سا ڈر" اور بات ہے جبکہ کسی مخصوص چیز یا صورتِ حال سے بلاوجہ، شدید ڈر لگنے لگتا ہے اگرچہ

چیز یا صورتِ حال بذاتِ خود ایسی ڈراؤنی یا نقصان دہ بھی نہیں ہوتی ۔ مثلاً بادل دیکھے اور دل دھڑکنے لگا ۔ بجلی چمکی اور جان سوکھی ۔ کشتی [illegible] ائی میں حواس گم اونچائی سے نیچے نظر کرنے کی تاب نہیں ۔ جب تک سب دروازے [illegible] کھڑکیاں بند نہ کر لی [illegible] [illegible] اندھیرے سے وحشت ہونے لگی ۔ اندھیرے میں دل ڈوب جائے ۔ غرضیکہ [illegible] ہے کہ کونسی چیز ، ڈرا نہیں سکتی ہے ۔ اور لطف یہ ہے کہ ایسے کسی احمقانہ ڈر میں گرفتار [illegible] کا ڈر قطعی فضول [illegible] موقع واردات پر اس کی وہی حالت ہوتی ہے ۔ اب اگر کسی کی زندگی میں کوئی فضول کا ڈر ایسا غلبہ حاصل کر لے کہ وہ روزمرہ کے کاموں میں دخل اندازی کا باعث بن جائے تو پھر وہ شخص صحیح معنوں میں اُس خوف کا مارا ہوا کہلا [illegible]

[illegible] ڈر بچپن کے کسی حادثے کی یادگار کے طور پر جیون ساتھی بن جاتے ہیں ۔ اگرچہ اصل محرکات یا واقعات کا پتہ تک نہیں ہوتا تاہم ان کے کچھ لوازمات یا نشانات کسی طور ہمیشہ کے لیے ذہن [illegible] طرح محفوظ ہو جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی وہی جذباتی کیفیت پیدا کرتی ہے جو نقشِ اوّل کے وقت ہوئی تھی ۔ سب ہی جانتے ہیں کہ چھاج پھونک پھونک کر کون پیتا ہے اور رسی سے کون ڈرتا ہے ۔ لیکن کچھ فضول ڈر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اوٹ میں واقعی کوئی حقیقی [illegible] چھپا ہوتا ہے ۔ ان کی حیثیت محض علامتی ہوتی ہے ۔ جب من میں جھانک کر دیکھا جاتا ہے تو پتہ [illegible] ہے ۔ مثلاً تنہائی اور تاریکی سے خوف کھانے والوں کے بارے میں عموماً یہی پتہ چلتا ہے [illegible] زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں بظاہر جس [illegible] سے ڈر لگا کرتا [illegible] ہرگز ڈرنے کے لائق نہیں ہوتی لیکن اُس کو ذہن کی کارفرمائی نے کسی اہم اور حقیقی ڈر کا قائم مقام گردان رکھا ہے ۔ لہٰذا جہاں وہ علامت سامنے آئی اور [illegible] زور کے ساتھ [illegible] طاری ہوا ۔

ایک ڈر وہ [illegible] دہشت زدگی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ کسی خاص حادثے یا واقعے کی دہشت [illegible]

سمجھا جاتی ہے۔ جیسے جنگ کی ہولناکی بعض ذہنوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کر ڈالتی ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں، وقت گزر جاتا ہے لیکن تاثر ایک مدت تک برقرار رہتا ہے اور اضطراب کا باعث بنتا ہے۔ محاذ پر ایک ہی وقت میں لڑنے والے سب ہی فوجیوں کے ذہن پر یکساں دباؤ نہیں ہوا کرتا کیونکہ ہر ایک کا کارخانہ طبیعت جدا ہوتا ہے۔ پہلے سے جو زائد حساس ہوتا ہے اور جس نے سامنے زندگی کا کچھ رابطہ ضابطہ تیار کر رکھا ہے، اسے حالات کی خواری اتنا ستاتی ہے کہ برداشت نہیں کر پاتا۔ کبھی کبھی دہشت زدگی کی بنا پر ذہن قطعی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، یا کوئی فضول خیال میں بیٹھ جاتا ہے جس کی حیثیت علامتی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کو بھی گھبراہٹ اور پریشانی کا ہی مدین سمجھنا چاہئے کیونکہ جتنی فکر زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی ردّ عمل، شدید ہوا کرتا ہے۔

دہشت زدگی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جسم کا کوئی عضو معطّل ہو کر رہ جائے۔ مثلاً کوئی ہاتھ بے جان ہو کر رہ جائے یا پاؤں سو جائیں۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں یا کوئی اور روگ لگ جائے۔ بعض اوقات ذہنی کشاکش کا دباؤ بھی کچھ ایسی ہی 'جسمانی معذوری' کی شکل میں نمودار ہوا کرتا ہے۔ جہاں من کا بوجھ تن پر آ پڑتا ہے۔ ذہن اپنا تناؤ کم کرنے کے لیے یہ چال چل جاتا ہے۔ لیکن یہ جسمانی عذر ایسا عام اور بدنام ہے کہ مشکل سے کسی کو اس پر اعتبار آتا ہے۔ عموماً یہی گمان گزرتا ہے کہ ڈھکوسلہ بازی کی گئی ہے، ڈھونگ رچایا گیا ہے گویا اسے محض 'عذر لنگ' ہی سمجھا جاتا ہے جبکہ لنگ واقعی ہوتی ہے۔ بظاہر 'جسمانی معذوری' اور 'عذر لنگ' میں فرق دشوار ہے۔ بہروپیے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی صورتِ حال کا جائزہ لینے سے حقیقت کا انکشاف ہو ہی جاتا ہے۔ عام بات ہے کہ امتحان کا بخار اچھے خاصے لوگوں کو چڑھ جاتا ہے، بلکہ اس سے واقعی سر میں درد ہونے لگتا ہے، غیر دلچسپ کام کا نام ہی سن کر تھکن محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسی تمام صورتوں سے ذہنی دباؤ کے جسمانی اثرات کا صاف پتہ لگتا ہے اگرچہ ان سے سلامت روی میں کوئی ایسا فرق نہیں آتا ہے لیکن جب یہی ذہنی دباؤ اور تناؤ اتنا شدید ہو جائے کہ 'جسمانی معذوری' پیدا کر دے تو وہ 'مریضانہ تدارک' کی حیثیت رکھتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نقش، دل میں اس طرح بیٹھتا ہے کہ پھر اٹھتا نہیں۔ گرفت ایسی سخت ہوتی ہے کہ کسی طور نہیں چھوٹتی۔ ہمارے [illegible] خیالات کے سمجھنے [illegible] کہتے ہیں خیال تکلیف دہ یا نازیبا ہوتا ہے، ہم اسے ہرگز ہرگز سوچنا نہیں چاہتے مگر بغیر سوچے رہا نہیں جاتا۔ گویا ہماری مرضی کے خلاف ہمارے ذہن میں لگاتار [illegible] کہانی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کو رہ رہ کر یہی خیال ستاتا ہے کہ وہ اگلے سال مر جائے گا کیونکہ اسی عمر میں اس کے بھائی کا انتقال ہوا تھا۔ کوئی اس [illegible] ہے کہ اس کا [illegible] باپ کا قاتل بننے کے لیے کہتا رہتا ہے۔

اب ایسے برے برے خیالات ہی نہیں ستاتے بلکہ مختلف توہمات بھی پریشان کرتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] عادت پڑ جاتی ہے جو فضول اور باعث شرم ہوتی ہے مگر چھوڑنے سے چھٹتی نہیں۔ مثلاً جب تک [illegible] وقت گھر کے ہر ایک صندوق میں تالا نہ لگا دیا جائے، [illegible] نیند [illegible] اپنے بدن کا کوئی کپڑا چھو جائے تو اسے [illegible]۔ چھپا چوری دوسروں کے خط پڑھے بغیر تسکین نہ ہو۔ جب تک اپنا [illegible] نہ آئے۔ جیسے کوئی معافی مانگنے کی علت میں گرفتار ہو جائے۔

ایک صاحب کو دیکھا [illegible] سے معافی مانگتے پھرتے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دفعہ کی ملاقات میں تو ان کی اس روش کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن اسے کیا کہا جائے کہ اگر دن بھر میں ان سے دس بار ملاقات ہو تو دس بار معافی مانگیں۔ لوگوں سے خط لکھ لکھ کر معافی [illegible] اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہیں کہ اپنے مرحوم عزیزوں کی طرف سے بھی معاف کر دیجیے۔ جب سمجھاؤ کہ بلاوجہ کیوں معافی مانگتے رہتے ہو تو بڑے اطمینان سے فرمائیں کہ ہاں ایسا نہیں کرنا چاہیے [illegible] لیکن جب رخصت ہونے لگیں تو بغیر معافی مانگے، رہا نہ جائے۔ اب خواہ خیال کی مجبوری ہو یا فعل کی، سچی بات یہی ہے کہ یہ خطا جان کر نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو وہمی، مراقی، خبطی کہہ کر [illegible] کہا جاتا ہے، لیکن وہ بیچارا کیا کرے، اپنے بس میں خود نہیں ہوتا۔ نہ اسے اپنے خیالات کی لپیٹ سے نکل پاتا ہے اور نہ اپنی روش چھوڑ پاتا ہے۔ ایسا کر کے پچھتاتا ہے اور بغیر کیے

بھی رہا نہیں جاتا !

آپ نے دیکھا کہ خواہ بے بات کا ڈر ہو یا ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہونے والی جسمانی معذوری۔ خیال کی مجبوری ہو یا عمل کی، سب کی سرشت ایک ہے، یعنی فکر و اندیشہ تمام خرابیوں کی جڑ ہیں۔ ایسے تفکرات ان کی زد میں آ جانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ظاہر طور اور چھپے دبے آزار ہم اپنے لیے مول لے بیٹھے ہیں جن کا مدعا اور مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم چین سے اپنے ذہن کی تعمیری قوتوں سے کام نہ لے سکیں۔ ہماری زندگی میں جتنا ان کا نفوذ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر ہماری کارکردگی گھٹتی جاتی ہے اور ان کے ہاتھوں ہم ایسے مارے جاتے ہیں کہ کوئی رونے والا بھی نہیں ملتا بلکہ الٹی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ ہم اپنے 'سوزِ غم ہائے نہانی' میں بھسم ہوتے رہتے ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ 'آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں' لیکن سماج سے جملے بازی، طنز، ٹھٹول، مخول کے چھینٹے ہی نصیب ہوتے ہیں جن سے غم کی آگ کچھ اور بھڑک اٹھتی ہے، الجھنوں میں اضافہ ہوتا ہے، کڑھن بڑھتی ہے اور بڑھتے بڑھتے بے حسی طاری کر دیتی ہے۔ غرض زندگی کا سارا خون، فکر کا گھن چاٹ لیتا ہے اور بدن کے کھنڈر باقی رہ جاتے ہیں جہاں رنج و مایوسی کی گھنگھور گھٹائیں برستی ہیں، شرمساری اور خواری کی کائی چڑھتی ہے اور اعصابی خلل کی گھاس پھوس اگتی رہتی ہے۔

ہر وقت اپنی پریشانیوں کے خیال میں رہنے کی وجہ سے انسان، اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شعوری طور پر اپنے دھیان کو ادھر ادھر منتقل کرتے رہا کریں۔ ذرا سوچیں کہ یہ دنیا کتنی حسین ہے اور اس کے لوگ کتنے پیارے ہیں۔ چوبیسوں گھنٹے اپنے دھندے میں لگے رہنے اور اپنا رونا رونے کے بجائے ذرا اپنوں کی زندگیوں سے لگاؤ پیدا کریں۔ دوسروں کے غم میں شریک ہوں۔ کچھ خدمتِ خلق، دوستی کی مسرت حاصل کریں۔ اپنی دلچسپیوں کا دائرہ بڑھائیں۔ غرضیکہ اس دنیا میں رہنے کا حق ادا کریں۔ اس کے علاوہ اقدار اور ایمان کی حرارت و قوت سے اپنے دل کو گرمائیں اور تقویت حاصل

کریں۔ زمانہ یہ تو سوچیے کہ ایسا کون ہے جس کے دل کو کبھی ٹھیس نہ لگی ہو۔ دکھ درد ہر ایک کے ساتھ ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم جیسا دکھیارا اس سارے جہاں میں کوئی دوسرا نہیں ہے اور میں بھرے بازار میں تنہا کھڑا ہوں۔ یہ تنہائی [illegible] کرتے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال۔ اس طرح 'خلوت' میں بھی 'انجمن' کا مزا مل سکتا ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر تو دیکھیے اردگرد کتنے لوگ جمع ہیں اور لطف کا کیا کیا سامان میسر ہے۔ بے تکلف دوست ہیں، پر لطف [illegible] دلچسپ ماحول ہے۔ معصوم بچوں کی مسکراہٹ ہے، ان کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے کا مزا ہے۔ بیوی [illegible] کا ساتھ بنایا ہے، اس کے راز و نیاز کی عزت اور [illegible] بیوی، اپنے شوہر کی شریک زندگی ہے، اس تعلق کا اطمینان اور اعزاز ہے۔ بزرگوں کی شفقت ہے۔ چھوٹوں [illegible] ہے، جو کہیں ہے؟ ان سب کی زندگیوں سے وابستگی پیدا کرنے سے زندگی خوشگوار [illegible] کیسی فکر، کہاں کی پریشانی!

اپنے مسائل کو سمجھنے اور ان کا معقول حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو لوگ اس آزمائش سے بچ کر بھاگتے ہیں، ان کی طبیعت میں بل پڑ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہی بل اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ ذہنی آسودگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا شاہراہ حیات پر چلنے کے بجائے، زندگی کی چور گھاٹیوں میں پناہ ڈھونڈی جاتی ہے۔ ایسے ہی شخص کو 'خللِ اعصاب' کا مریض کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں وہمی، سنکی، مراقی، خبطی اور نہ جانے کن کن القاب و آداب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایسا آدمی در اصل تین بنیادی حقیقتوں یعنی سماج، کام، اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو نبھانا نہیں چاہتا ہے۔ وہ ان سے کترا کر نکل جانے کی غرض سے مختلف قسم کے پاپڑ بیلتا ہے لیکن اس دوڑ دھوپ میں اس کی زندگی پٹری سے اتر جاتی ہے۔ اس صورت حال کو عام لوگوں [illegible] مختلف بنانے والی چیز شدت اور مدت ہے۔ معقول اور نامعقول میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی زندگی میں وہ کیفیات عارضی، کم اور نرم ہوتی ہیں اور دوسرے کی زندگی

میں مستقل، کثیر اور سنگین۔ فکریں س[illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible] کردار کی اونچ نیچ ہر جگہ ملتی [illegible]، باطل سیدھا کوئی بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں اتنا جہ[illegible] ہو کہ صورت ہی مسخ ہو کر [illegible] ہے۔ ایسا شخص ذہنی طور پر اتنا اپاہج ہوتا ہے [illegible] [illegible] زندگی کے تقاضے بخوبی پورا کر سکے۔ ایسے کشاکش [illegible] ہی طبیب نہیں ہو پاتی ہے اور زندگی کا قرینہ اس سے چھن چکا ہوتا [illegible] وہ اپنے سرلبس زندگی کی تہمت اٹھائے ہوتا ہے اور اس کا وجود دیدۂ عبرت [illegible] کے لئے صرف [illegible] رہ جاتا ہے کہ میں ہوں اپنی شکست کی آواز [illegible]

[illegible] انصاری

نیشنل یوتھ سروس

ڈاکٹر پی۔ بی گجیندر گڈکر نہ صرف سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں بلکہ تعلیمی دنیا میں [illegible] اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور آج کل وہ بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت [illegible] ابھی حال میں انھوں نے دربھنگا [illegible] یونیورسٹی میں جو کنووکیشن ایڈریس دیا [illegible] انھوں نے حکومت ہند کی ایک تازہ اسکیم پر جو نوجوانوں کی تربیت سے تعلق رکھتی ہے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے، یونیورسٹی کے طلبا کو کسی نہ کسی [illegible] سروس میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ گزشتہ موقع پر جب ہندوستان میں باہر سے حملہ کا اندیشہ تھا، اس وقت تمام یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں این۔سی۔سی بہت زور و شور سے شروع کردی تھی، لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا زور کم ہوگیا۔ ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم لازمی [illegible] میں بڑا سوال ان کی ٹریننگ کے لئے وسائل کا ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں کہ اس [illegible] کو یونیورسٹیوں میں رائج کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جو طلبا فوجی تعلیم حاصل کرنے [illegible] دلچسپی رکھتے ہیں، وہ این۔سی۔سی میں شریک ہوں گے لیکن بقیہ طلبا نیشنل یوتھ سروس میں شریک ہوسکتے ہیں۔ ابھی حال میں یونیورسٹی طلبا میں ہنگامہ و فساد کی ہوا جو پھیل گئی ہے، اس کا علاج یہی ہے کہ ان کے قوار اور ان کی صلاحیتوں کو کسی مفید سماجی خدمت کے کام میں لگانا چاہیے تاکہ ان میں بے چینی، غصہ اور ناکامی کا احساس پیدا نہ ہو۔ اس قسم کے کاموں میں راستے اور سڑکوں کا بنانا، تالاب اور نہروں کی کھدائی [illegible]

بے کار زمینوں کو قابل زراعت بنانا اور اس قسم کے دوسرے کام شامل ہوسکتے ہیں ۔ ان کاموں کا ان کی سالانہ جانچ اور امتحان سے بھی تعلق ہونا چاہئے تاکہ وہ اس میں سنجیدگی سے حصہ لے سکیں۔ نیشنل پریسٹرس سروس کی ایک اپنی خصوصیت یہ ہوگی کہ طلبا کو کچھ وقت باہر کھلی ہوا میں رہنا ہوگا ان کی صحت اور سیرت کی تعمیر میں مدد ملے گی بلکہ اس سے سماج کے دوسرے اور سماجی اور طبقاتی بھید بھاؤ کے دور کرنے میں بھی مدد ملے گی ۔

سائنس کی تعلیم میں نئے میلانات :

آج کل اسکولوں میں سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا جا رہا ہے ، اس لئے کہ اعلیٰ منزل پر سائنس کی تعلیم اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتی ہے ، جب تک نیچے کی جماعتوں سے اس کی تعلیم شروع نہ کی جائے ۔ پھر سائنس کی تعلیم میں نئے نئے طریقے اور جدید آلات سے کام نہ لیا جائے تو اس کی تعلیم کا حق بھی کما حقہٗ ادا نہ ہوگا ۔ چنانچہ ابھی حال میں ''اسکول سائینس'' نامی ایک ماہنامہ میں ''علم کیمیا کی تعلیم میں فلموں کے استعمال'' پر ایک مضمون نکلا ہے جس سے سائنس کی تعلیم میں جدید آلات اور طریقوں کے استعمال کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے گا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ فلموں کے ذریعہ خواہ وہ ساکت ہوں یا متحرک ، ایسے خیالات ، تصورات ، اصول اور نظریے طلبا کے سامنے اس طرح پیش کئے جا سکتے ہیں جو زبانی بیان سے ہرگز ممکن نہیں ہوسکتے ۔ فلم اصل میں کسی لمبی داستان یا کسی طویل عمل کے اختصار کا نام ہے جو ایک قلیل وقت میں اور مختصر انداز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ، بعض حرکتیں جو بہت تیزی کے ساتھ واقع ہوتی ہیں ، جیسے کسی پرندے کا اڑنا ، یا ایسی حرکتیں جو بہت سست رفتار ہوتی ہیں ، جیسے کسی پودے کی نمو یا پھول کا کھلنا ، ایسی چیزیں ان کو سست رفتار فلم یا تیز رفتار فلموں کے ذریعہ دکھایا جا سکتا ہے ۔ مینڈک ، کیڑے مکوڑے ، جنگلی جانور اور پرندوں کی آوازیں یا ایسی حرکتیں جیسے تلب کی یہ سب باتیں فلم کے ذریعہ بچوں کے سامنے لائی جا سکتی ہیں ۔ اسی طرح غیر معمولی باتیں جیسے تیل کے چشمے میں آگ لگنا ، جو بچوں کو کر کے دکھایا نہیں جا سکتا ہے ، لیکن فلم کے ذریعہ انھیں کسی جماعت کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے ۔

لیکن اس کے ساتھ صحیح اور مناسب فلموں کا انتخاب بہت ضروری ہے، فلم بچوں کی استعداد کے مطابق اور موضوع سے متعلق ہونی چاہئیں۔ بہتر ہے کہ فلم دکھانے سے قبل استاد انھیں دیکھ بھی لے اور طلبا [illegible] تیار ہو کر آئیں کہ وہ کس موضوع کی فلم دیکھنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ پھر اس کے ساتھ فلم دکھانے کے [illegible] جماعت میں بحث و گفتگو بھی ہونی چاہئے تاکہ اس کا پورا مقصد حاصل ہو۔ طلبا پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دینی چاہئے کہ تفریحی فلم [illegible] بلکہ کسی تعلیم اور تدریس کی غرض سے دکھائی جارہی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی غرض سے فلم بنانے پر ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے، البتہ بعض ممالک کے سفارت خانوں [illegible] ایجنسیوں [illegible] بہت فلم مل سکتے ہیں، ورنہ اس ضرورت کو پورے طور پر پورا ہونے کے لئے ابھی وقت اور سرمایہ کا انتظار کرنا ہوگا۔

اصلاح تعلیم:

دہلی ایڈمنسٹریشن نے اس پنجسالہ پلان میں یہ طے کیا ہے کہ وہ اگلے سال سے کم سے کم [illegible] اسکول ہر سال ایسے کھولے گی جن کا ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا اور جو اپنے معیار میں پبلک اسکولوں کے برابر [illegible] اور اس طرح وہ ہندوستان سے پبلک اسکولوں کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ ایڈمنسٹریشن کی اور اصلاحات میں ایک کتابوں کا "بینک" ہوگا، ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے لئے حلقہ مطالعہ اور ذہین اور اچھے بچوں کے لئے "گرمائی مدرسہ" کا انتظام ہوگا۔

ماہنامہ جامعہ کے بارے میں ضروری اطلاع

ماہنامہ جامعہ [illegible] پہلی یا دوسری کو شائع ہوتا ہے [illegible] اتفاق سے، کوئی [illegible] اطلاع کردی جائے، اگر بعد میں شکایت کی جا[illegible] وقت پیش آتی ہے۔

۲۔ شکایتوں اور نمونے کے پرچوں کی فرمائشوں کی تعمیل صرف اس وقت کی جاسکے گی جب منفرد [illegible] کو رسالہ پوسٹ کیا جائے گا۔

۳۔ وی پی کی صورت میں کوئی [illegible] زیادہ خرچ ہوتے ہیں، جس کا بار خریدار پر [illegible] منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں خریداروں کا فائدہ ہے۔

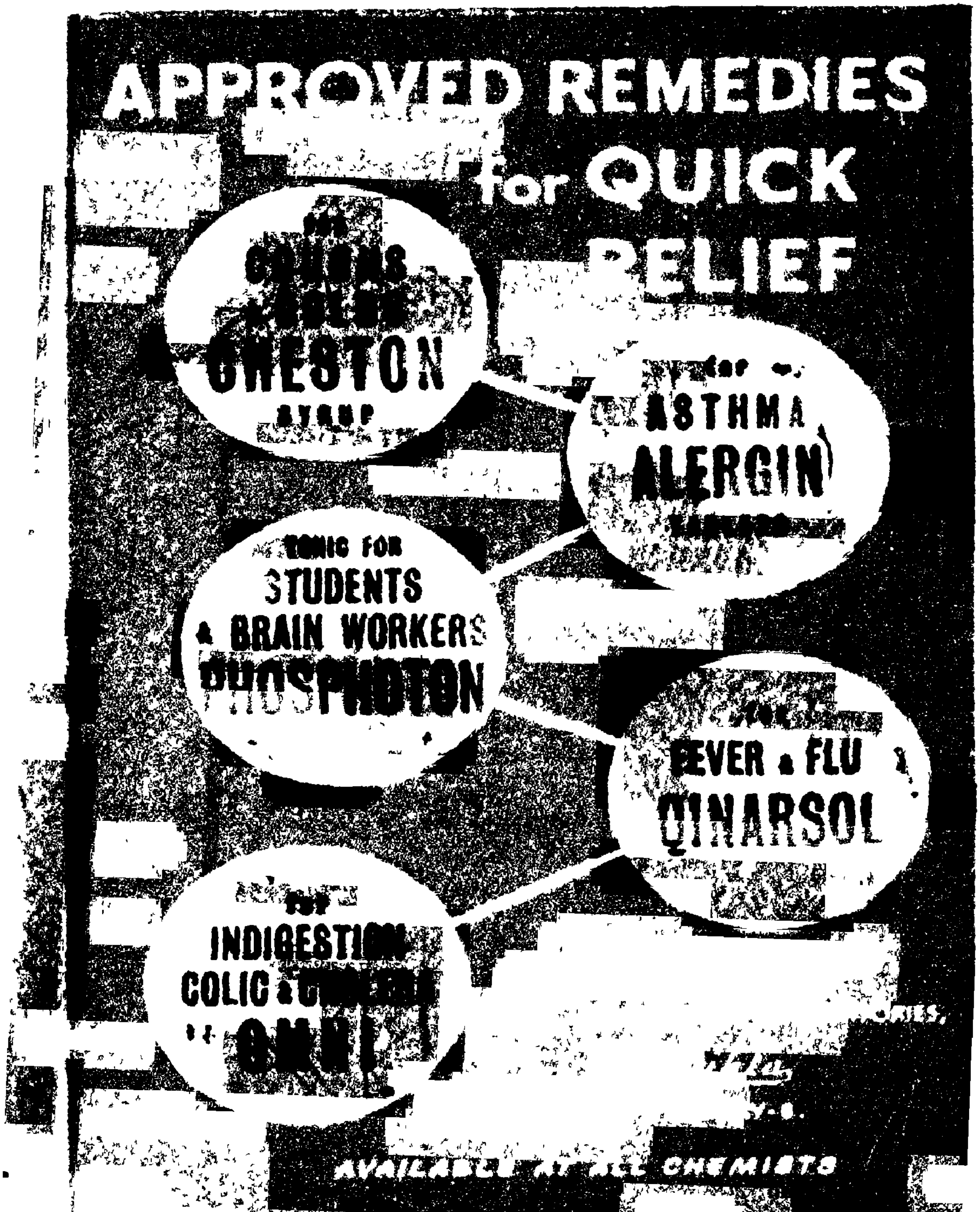
۴۔ اگر چندہ چک کے ذریعہ ادا کیا جائے تو چک ماہنامہ جامعہ کے بجائے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام ہونا چاہئے اور دلی سے باہر کے چکوں میں، اصل رقم کے علاوہ، بنک کا کمیشن اور فیس رجسٹری کی رقم بھی شامل کرنا چاہئے۔

(منیجر)

Regd. No

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

سالانہ چندہ [illegible]

[illegible] پچاس پیسے

جلد [illegible] — بابت ماہ جون ۱۹۶۸ء — شمارہ [illegible]

فہرست مضامین

مجلس ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین [illegible]

ضیاء الحسن فاروقی [illegible] اللہ

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی [illegible]: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: میل پریس دہلی

تنبیہات

اس وقت ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا ضمیر ظلم و عدوان پر بے چین تو ہوتا ہے لیکن وہ جوش پیدا نہیں کرتا جو ہر قیمت پر ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے صالح طبیعتوں کو آمادہ کرتی ہے، ہم نجی صحبتوں میں بگڑے ہوئے حالات کا ماتم تو کرتے ہیں لیکن ان حالات کی اصلاح کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے ... تقریریں اچھی کر لیتے ہیں لیکن اپنی بے عملی کے سبب ٹوٹے ہوئے، مایوس اور ہراساں دلوں میں امید و یقین کی شمع روشن نہیں کر سکتے، یہ صورت حال اخلاقی انحطاط کی وہ منزل ہے جس کے بعد ... بے شمار راہیں کھلتی ہیں، اور تاریخ عالم میں ایسی ان گنت شہادتیں موجود ہیں کہ قومیں اس منزل پر پہنچ کر دائمی ذلت و نکبت کا شکار ہو گئیں۔

... ملک کا حال یہ ہے کہ اگر فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان کا نقصان کتنا ہوا اور ہندو کا کتنا، اگر ہریجنوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو غیر ہریجن اسے اپنا مسئلہ نہیں سمجھتے، کسی شہر میں اگر ایک خاص علاقہ کے باشندوں یا ایک خاص زبان بولنے والوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے، تو دوسرے علاقے یا زبان ... افراد اگر فکے ہیں کہ وہ محفوظ رہے، جہاں ظلم و عدوان ہندو مسلم، ہریجن غیر ہریجن، شمالی اور ... بنگالی اور غیر بنگالی وغیرہ ناموں سے موسوم ہو جائے، وہاں انسانیت اور شرافت کا ذکر کون کرے؟ جہاں چھوٹی چھوٹی علاقائی وفاداریوں کے نام پر بھائی بھائی کا گلا کاٹے وہاں کسی بڑے نصب العین یا کسی بڑی اخلاقی قدر سے وفاداری کا چرچا کون کرے؟ جہاں خود غرضی ہی اوڑھنا بچھونا بن جائے وہاں بے غرضی اور ایثار و قربانی کے لئے کیا گنجائش؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ...

کچھ اسی قسم کے اخلاقی مرض میں مبتلا ہوگئی ہے، ہم اپنے اس مرض کا علاج جتنی جلدی ڈھونڈ لیں اتنا ہی ہمارے [illegible]

اچھا سماج کسے کہتے ہیں؟ ہماری رائے میں اچھا سماج وہ ہے جہاں ظلم کہیں پر ہو، کسی پر ہو، ہر شخص یہ سمجھے ظلم اسی پر ہوا ہے، جب تک اعلیٰ شہریت کی یہ خوبی ہم میں نہ ہوگی، اچھے سماج کی تعمیر کا خوش آئند خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا [illegible] ہم ظلم کو ہندو مسلم کی عینک سے دیکھنا ترک کر دیں گے تب اگر ہندو پر ظلم ہوگا تو مسلمان بے تاب ہو [illegible] مسلمان پر ہوگا تو ہندو تڑپ اٹھے گا، سوال ہے کہ کیا ہماری قوم میں [illegible] صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ظلم کو ظلم سمجھے خواہ وہ اس کے کسی فرد پر ہو؟ ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم کی اکثریت برائی کو برائی سمجھتی ہے ظلم کو پسند نہیں کرتی، حب الوطنی کا جذبہ بھی ہے اس میں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برائی اور ظلم کی ضرب جب تک خود کسی فرد یا طبقہ پر نہ پڑے، وہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ یہاں ایک چھوٹی سی مثال دی جاتی ہے، دہلی کے شہر میں بسیں چلتی ہیں، بسوں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی، کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ چند لڑکے عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں، رکیک فقرے کستے ہیں، گندے اشارے کرتے ہیں، لوگ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں لیکن کچھ نہیں کہتے، ساٹھ ستر آدمیوں کی اس بس میں چند اوباش لڑکے شرافت کا منہ چڑاتے ہیں اور باقی سب لوگ بے بس نظر آتے ہیں، یہی صورت حال بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر دیکھنے میں آتی ہے، لوگوں کی اکثریت جلتی ہوئی دکانوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے مہیب منظر کی تاب نہیں لا سکتی لیکن یہ ہمت یا توفیق نہیں ہوتی کہ نکل کر آگے آئے اور فسادیوں کو للکارے، جب بے حسی یا کم ہمتی کا یہ عالم ہو تو پھر غیرت قومی اور جرأت رندانہ کی بات کیسے کی [illegible]

لیکن غیرت و جرأت [illegible] ان کی یہی [illegible] کوئی نہیں

بچا سکتا، آزادی کے بعد بیس سال کی تیاری کے بعد فسطائی طاقتوں نے مکمل کر، مذہب اور کلچر کی آڑ میں ہندوستانی عوام کے جمہوری حقوق پر حملہ بول [illegible] اس وقت بظاہر یہ طاقتیں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دینے کا منصوبہ لے کر اٹھی ہیں، لیکن یہ یلغار جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کے خلاف ہے، یہ کروڑہا [illegible] کے ہندوستانی عوام [illegible] فسطائیت آ سر چکی ہے پہلے اس نے مذہب، کلچر یا احیائے عظمت ماضی ہی کا نعرہ لگایا ہے، اور پھر اس نے اپنے ملک کے عوام کے جمہوری حقوق کو پامال کیا ہے [illegible] یہاں تک کہ ان کو بے زبان ڈھور ڈنگروں کی حد تک پہنچا دیا ہے ہمارے ملک کی فسطائی طاقتوں کا بھی یہی منصوبہ ہے اور اگر ہم نے ضمیر کی بیداری، دل کی خودداری اور غیرت انسانی کا عمل [illegible] تو ہم ذلت و نکبت کی بڑی تباہی سے دوچار ہوں گے۔ قدرت کا قانون ہے [illegible] میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں، کوئی رو رعایت نہیں۔

[illegible] انسان ایک خاندان کے فرد ہیں، مذہب، رنگ، خون اور نسل کے امتیازات [illegible] سب ابن آدم ہیں، بحیثیت انسان کے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں، اس لئے اس ملک کے [illegible] ہریجن ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم، ان سے کسی قسم کا چھوت چھات کا برتاؤ خدا کی شان ربوبیت انکار کے مترادف ہے، اور ایسے انکار کی سزا چاہے دیر سے ملے لیکن ملتی ضرور ہے اور بھرپور ملتی ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

[illegible] ہمارے بھائی ہیں، ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا چاہئے، ہمارے دستور نے ہریجنوں کو وہی حقوق [illegible] ہریجنوں کے ہیں، پھر ہم خدائی قانون اور خود اپنے بنائے ہوئے دستور کی خلاف ورزی کر کے دہرا جرم کرتے ہیں، کیا اس جرم کی سزا ہم کو نہیں ملے گی؟ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پچھلے [illegible] ایسی خبریں موصول ہوئیں کہ اونچی ذات والوں نے ہریجنوں پر زیادتیاں کیں یہاں تک کہ ایک [illegible] کو زندہ جلا دیا، کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ بیس سال میں ہم نے اخلاقی طور پر ترقی کی ہے؟ ہریجن کو ہریجن کس نے بنایا؟ کیا ایک آدم کی اولاد میں ہریجن اور غیر ہریجن میں بانٹی جا سکتی ہیں، ہمیں یقین

ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس طرح کی تقسیم ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا، یہ تفریق ہم نے کی ہے ہم انسانوں نے اور ہمیں [illegible] نام نہاد تقسیم ہے بھی تو انائی لتی [illegible] تفریق کو باقی [illegible] لئے کوشاں ہیں۔ ہمیں [illegible] کے لئے بھی ان ظلمت پسند [illegible] وں سے نبرد آزما [illegible]

[illegible]

[illegible] ہم جانتے ہیں کہ مایوس نہ ہونا اللہ کی رحمت ہے، اس دنیا میں انسان نے [illegible] پر بڑا ظلم کیا ہے، لیکن خدا انسان سے مایوس نہیں، ہر بچہ جو اس دنیا میں آتا ہے درحقیقت پیغام [illegible] خدائے ذوالجلال کا کہ وہ انسانوں سے مایوس نہیں، اس لئے دل کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ہماری موجودہ حالت میں اصلاح نہیں ہوگی، ہماری قوم کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے کانوں میں ایسی آوازیں آرہی ہیں کہ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، اور ہمیں اسے بچانے کے لئے کچھ کرنا ہے۔ چند سال قبل ایسی ایک یا دو آوازیں ہوا کرتی تھیں، اب ہر طرف سے یہ صدا آرہی ہے [illegible] کا احساس قوی ہوگیا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے لگے ہیں، یہ علامت امید اور حوصلے کی ہے، کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ان آوازوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور جلد اضافہ ہو، یہ منظم ہوجائیں اسی طرح جیسے فسطائی عناصر منظم ہیں، ہم کس طرح کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے، پہلے بدیسیوں کی غلامی کا طوق ہمارے گلے میں تھا، اب ہمارے اپنے ہی ہمیں غلام بنانا چاہتے ہیں، ہمیں مل کر ایسے عناصر کا مقابلہ کرنا ہے اور اس ملک میں شریف انسانوں کا سماج بنانا ہے جو جمہوریت اور انسانیت کا احترام کریں، جو معاشی اور سماجی انصاف کے قیام کے لئے سینہ سپر رہیں، جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھیں اور اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ حقیقی انصاف وہ ہے جو نہ صرف اصولی طور پر انصاف ہو بلکہ عملاً بھی انصاف ہو [illegible]

[illegible]

ضیاء الحسن فاروقی

افکارِ آزاد

چند قومی مسائل

آج ہماری قوم جس اخلاقی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے اور ملک کو جو حالات درپیش ہیں [illegible] طبقہ واقف ہے۔ ایسے میں صورتِ حال پر قابو پانے اور ملک کو حقیقی ترقی، سچی آزادی [illegible] مستقبل کی راہ پر ڈالنے کے لئے ہم مولانا آزاد کی شخصیت و زندگی [illegible] سے کیا روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور روشنی حاصل کر بھی سکتے [illegible] میں نے صحیح سمجھا ہے تو یہی آج کی بحث کا موضوع ہے۔

[illegible] ضروری سمجھتا ہوں کہ دانشوروں کی اس مجلس میں مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی [illegible] ذکر کروں جن کے وہ حامل تھے، وہ خوبیاں گناؤں جو اُن کی عظمت کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں، ان کے علم و فضل، اُن کی فقید المثال خطابت، اُن کے قلم [illegible] اُن کی نورانی فراست، یہ تمام باتیں جانی پہچانی ہیں، ہاں دو ایک باتیں ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ [illegible] اور [illegible] کہ فکر و عمل کی جیسی خوشگوار، فعال اور

نوٹ: یہ مضمون [illegible] اپریل [illegible] کو نئی دہلی کے مولانا آزاد سمینار میں پڑھا گیا تھا اور اس پر بحث و گفتگو بھی ہوئی [illegible] سمینار کی مکمل [illegible] روداد بھی شامل ہو گی۔

خلاق ہم آہنگی ہمیں مولانا کی شخصیت میں ملتی ہے ویسی شاذ و نادر ہی کسی شخص میں ہوتی ہے، فکر و عمل کا اتحاد جب کسی شخصیت کی مرکزی خصوصیت بن جاتی ہے تو اس کے ہاتھوں فکر و نظر کی نئی راہیں کھلتی ہیں، تبدیلی اور انقلاب کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے، زندگی اپنے مقدس تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم کرتی ہے اور چونکہ جوش عمل کے پیچھے فکر کا [illegible] احتیاط اور علم کی حکمت اور بالغ [illegible] ہے، اس لئے مجموعی طور پر اس کا آہنگ مثبت اور تعمیری ہوتا ہے، وہ صرف نفی [illegible] نہیں ہوتا [illegible] اثبات کا مبلّغ بھی ہوتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مولانا کی یہ خصوصیت آج کی بحث کے دوران آپ اپنے سامنے رکھیں۔

دوسری بات یہ کہ مذہب، فلسفہ، شعر و ادب، فکر و فن اور تاریخ عالم پر مولانا کی نظر گہری تھی، اُن میں تاریخی نظر بھی تھی، اسی نظر سے اُن پر یہ حقیقت کھلی تھی کہ اعلیٰ تہذیبی و انسانی قدریں کسی خاص قوم کی امانت نہیں، یہ سب کی ہیں اور ان کی خدمت دنیا کی تمام متمدن اقوام نے، تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں، اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق، کی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے، اس طرح اس تاریخی نظر کی بدولت انسان دوستی سے متعلق اُن کا جو فکر بنا اُسے ہم مولانا آزاد کے ہیومانزم سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بھی ہمارے مدنظر رہے۔

مولانا آزاد ہندوستانی مسلمان تھے، دوسرے لفظوں میں ہندوستانی بھی اور مسلمان بھی، انھوں نے بہت کچھ سوچا، بہت لکھا اور بہت بولے، اب مکتوب شکل میں ان کی جو تحریریں اور تقریریں موجود ہیں، انھیں میں ہمیں اُن کا فکری مواد ملتا ہے، آج کے محدود موضوع بحث کے پیش نظر میں اس فکری مواد کے دو پہلو آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

۱۔ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق پوری ہندوستانی قوم سے ہے، ہمارا پورا [illegible] میں مختلف مذاہب، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے لوگ رہتے بستے ہیں، اُن سب کے میل جول سے ایک مشترک تہذیب تدریجی طور پر پیدا ہوئی، اور سب لوگ ایک متحدہ قومیت کے معنوی رشتہ میں منسلک ہو کر ہندوستانی قوم بن گئے۔

۲۔ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق بظاہر مخصوص طور پر اسلام اور مسلمانوں سے ہے، لیکن بنیادی طور پر ان کا تعلق پوری قوم سے بھی ہے اور اس طرح ہے کہ اگر کوئی طبقہ مذہبی معاملات میں جمود و تعطل اور معاشرتی امور میں علاحدگی پسندی اور ظلمت پسندی کا شکار ہو جائے تو [illegible] قوم کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قومیت اور وطنیت کا مسئلہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں ایک [illegible] میں اس مسئلہ پر کافی ہنگامہ آرائی رہی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی بیشتر اکثریت کا اس سلسلہ میں جو خیال تھا اس کی ترجمانی اقبال کے اس مصرع سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

[illegible] کافر [illegible]

[illegible] میں مولانا آزاد نے جو موقف اختیار کیا وہ مسلم لیگی قیادت [illegible] کے دور میں [illegible] کی اکثریت سے [illegible] مختلف تھا، اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا کے سیاسی رجحان کی تشکیل [illegible] پسند انقلابیوں کی تحریک کا اولین حصہ تھا، بنگال کے انقلابیوں سے اپنے [illegible] نے ہماری آزادی (INDIA WINS FREEDOM) میں بیان کی [illegible] کہانی کے ضروری ٹکڑے درج ذیل ہیں:

[illegible] دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں [illegible] ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں، وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار [illegible] اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں ....۔ انقلابی محسوس کرتے تھے کہ مسلمان حصول آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہیں۱؎

[illegible] شیام سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا اور ان [illegible] نے دیکھا کہ میں خوشی سے ان کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہوں تو انہیں

۱؎ [illegible] ہماری آزادی، صفحہ ۱۵

بہت حیرت ہوئی، شروع میں ان کو میرے اوپر بھروسہ نہیں تھا اور انھوں نے مجھے اپنی خصوصی محفلوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے [illegible] ان کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ میں نے [illegible] ملانا چاہا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے ان کے [illegible] اور یہ مناسب نہیں ہے کہ [illegible] لازموں [illegible] سے جو انھیں [illegible] عام حقیقت مجھ جیسا [illegible] میں [illegible] حاصل کرنے [illegible] انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا [illegible] ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہو جائیں گے اگر ہم ان میں کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر [illegible] میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی حاصل کرنے [illegible] زیادہ دشوار ہو جائے گی، اس لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔

"پہلے تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو یقین نہ دلا سکا کہ میری سیاسی تشخیص صحیح ہے، مگر وقت کے ساتھ ان میں سے بعض میرے ہم خیال ہو گئے۔ اسی درمیان میں میں نے مسلمانوں میں کام شروع کر دیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جو نئے سیاسی منصوبوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کو تیار ہے۔"

یہ واقعہ مولانا کے پہلی بار ہندوستان سے باہر جانے سے پہلے کا ہے۔ اس سے ایک طرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا آزاد علی گڑھ پارٹی کی انگریز دوستی [illegible] کے اس وقت [illegible] مخالف تھے اور قومی تقاضوں کا بھرپور شعور رکھتے تھے، دوسری طرف یہ بات بھی ان [illegible]

[illegible] آزادی، صفحہ [illegible]

روشن تھی کہ مسلمانوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر حصولِ آزادی کا کام بہت دشوار ہوگا۔ اس امر سے ہم واقف ہیں کہ آزادی حاصل کرنا اگر دشوار کام ہوتا ہے تو حصولِ آزادی کے بعد بقائے آزادی دشوار تر ہوتا ہے، اور آزادی جس مقصد سے حاصل کی جاتی ہے اگر وہ مقصد ہی منتشر ہوتا نظر آئے تو نہ صرف یہ کہ آزادی کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے بلکہ وہ آزادی بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔ ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں ان میں ایک حالت وہی ہے جسے ہم ہندو مسلم مسئلہ کہتے ہیں، اس مسئلہ کی جو نوعیت تقسیم سے پہلے تھی اس سے کہیں [illegible] صورت اس نے آج اختیار کرلی ہے، ہندوؤں کی احیائی تحریکوں نے شاید یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گی، انھیں معاشی اور سماجی اعتبار سے پست اور ذلیل رکھیں گی، بس [illegible] اس ملک [illegible] چھوڑیں گی، مولانا آزاد نے ہندو انقلابیوں کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت کو اپنا [illegible] سمجھیں، انھیں اپنا ساتھی اور دوست بنائیں، ان کی تائید اور دوستی کے بغیر آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہوجائے گی، آج مولانا آزاد کے نام پر ہندوؤں کی احیائی تحریکوں سے اپیل کی جاسکتی ہے کہ آزادی کو قائم رکھنے اور اسے بامقصد اور بامعنی بنانے کے لئے [illegible] کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں، ان پر اعتماد کریں، انھیں اپنا ساتھی اور دوست سمجھیں کروڑوں انسانوں کی اس جماعت کو ذلیل اور پست رکھ کر ملک اور قوم کا نام اونچا نہیں [illegible] قوم کی آبرو اور آزادی باقی نہیں رکھی جاسکتی۔

میں خیالات کی رو میں دور نکل آیا، مسئلہ تھا اسلام اور قومیت کا، ۱۹۰۸ء میں مولانا نے ممالکِ اسلامیہ کا دورہ کیا تھا، ان ملکوں میں ان کی ملاقات وہاں کے انقلابیوں سے ہوئی، ان کی سیاسی اور تہذیبی تحریکوں سے ایک حد تک وہ براہ راست واقف ہوئے، وہاں کے اس وقت کے کئی انقلابی رہنماؤں [illegible] کا خیال بھی ہوا، اپنے اس سفر سے جب وہ واپس ہوئے تو یہ یقین اور راسخ سیاسی عقیدہ لے کر کہ ملک کی آزادی کی مہم میں مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کا ساتھی اور دوست ہی نہیں بننا ہے بلکہ جنگِ آزادی میں ہراولوں اور رہبروں کا کام کرنا ہے

آنے کے تھوڑے ہی [illegible] نے الہلال نکالا جس سے ہم اور آپ واقف ہیں۔ الہلال کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کرنا اور انگریزی سامراج کے خلاف انہیں تیار کرنا تھا، تاہم [illegible] مذہبی اصلاح اور دینی دعوت ہی کے نام پر ہو سکتا تھا، اس وقت مولانا کی جوانی کا زمانہ تھا اس لئے ان کے یہاں بھی اس دور میں ایک رومانوی انداز فکر [illegible] پر جاری تھی کہ مذہب اسلام غلامی کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا، مسلمانوں کا [illegible] فریضہ ہے بلکہ دینی فریضہ [illegible] کہ وہ غلامی [illegible] آزاد ہو جائیں، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تک کم و بیش یہی صورت رہی، پھر جب تحریک [illegible] کی توجہ ملی سرگرمیوں سے ہٹی تو اطراف و جوانب سے اسلام اور قومیت کے مسئلہ [illegible] موافقت کی آوازیں آنے لگیں، اس وقت مولانا نے لکھا:

"... جب ملی مشغولیت کا دور ختم ہو گیا تو رد عمل کا عمل در آمد شروع ہو گیا۔ وہی چیز جو چند [illegible] کا سب سے زیادہ مقبول عمل تھی۔ اب ایک مشتبہ اور بحث طلب چیز بن گئی اور فکر و خیال نے طرح طرح کی کاوشیں شروع کر دیں۔ جس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ جیل جا رہے تھے تاکہ ترکی کے ساتھ انصاف کیا جائے، اس وقت کسی کو بھی یہ بات نہ سوجھی کہ اس مطالبہ کا اس درجہ انہماک ہندوستانی قومیت کے ساتھ میل کھاتا ہے یا نہیں؟ لیکن اب ہر شخص اسی خیال سے متفکر ہے اور کوئی زبان اور قلم نہیں جس پر یہ سوال طاری نہ ہو!"

"ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو نکتہ چینی کے رنگ میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، دوسری طرف مسلمان اہل قلم ہیں اور چونکہ خود ان کے سامنے بھی کوئی صاف اور واضح حقیقت نہیں ہے اس لئے کچھ عجیب طرح کے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اس قسم کی بحثیں دیکھی تھیں کہ اسلام کی وسعت نظر، وطنیت تنگ نظری کی متحمل نہیں [illegible] بات کے محل اور موقع پر ان کی نظر نہیں ہے اس لئے وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام "نیشنلزم" کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو نیشنلسٹ

نہیں رہنا چاہئے ....

"مالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ [illegible]

جائے، یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈنی چاہیے"

[illegible] موقف بڑے گونجتے [illegible] لہجہ میں واضح کیا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایات [illegible] ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا [illegible] ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں [illegible] ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں [illegible] برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے [illegible] ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی [illegible] میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں [illegible] متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے [illegible] کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

۱۔ مضامین ابو الکلام آزاد [illegible]، "اسلام اور قومیت"، لاہور، صفحات ۱۴۲ تا ۱۴۳

۲۔ خطبات آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری، مکتبہ چٹان [illegible] صفحات ۳۰۰ تا ۳۰۱

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی ایک محب وطن مسلمان کا یہی موقف ہونا چاہیئے اور اسے بغیر کسی جھجک کے خود اعتمادی کے ساتھ اس کا اعلان کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری مذہبی اقلیتوں، خصوصاً عیسائیوں کو بھی اسی موقف کو بہ اصرار پیش کرنا چاہیئے، اور ہندو اکثریت کو اس حقیقی جذبے [illegible] صداقت کو تسلیم کر کے ہندوستان کے اتحاد کو محکم بنانا چاہیئے، بقول مولانا کے "ہندوستان کے لئے قدرت [illegible] چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسانوں کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف [illegible] کے قافلوں کی منزل بنے۔" قدرت کا یہ فیصلہ احیائی تحریکیں بدل نہیں [illegible]، ہاں اُن کی سرگرمیوں سے ملک کے اتحاد اور قومی یکجہتی کو نقصان پہونچ سکتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی قدرت کا یہ فیصلہ مان لینا چاہیئے، جس ماضی کا وہ خواب دیکھنا چاہتے ہیں وہ اب واپس نہیں آ سکتا، ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مشترک زندگی ان کے لئے مقسوم ہو چکی ہے، جو سانچا ڈھل چکا ہے اب وہ ٹوٹ نہیں سکتا، بھلا اسی میں ہے کہ کسی اور جانب دیکھنے کے بجائے وہ یہ دیکھیں کہ اس ملک میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی حامی کون سی طاقتیں ہیں، ان طاقتوں کے ساتھ وہ اس میدان کارزار میں ہمت کے ساتھ کود پڑیں جہاں جمہوریت اور سیکولرزم کے [illegible] کشمکش جاری ہے، اس سے متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت ملے گی، اور ملک کی بھلائی کے ساتھ خود اُن کی بھلائی ہوگی، علاحدگی پسندی کا رجحان انھیں چھوڑنا ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے الہلال کی للکار سے وہ آزادی کی جنگ میں کود پڑے تھے، آج انھیں ملک اور قوم کی نیک نامی کے لئے ان تمام ظلمت پسند قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے جو ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہی ہیں۔

ہزار برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان سے ہوئے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور یہاں کی آبادی کا ایک حصہ بن گئے، لیکن ہندو مسلمانوں کے ہزار سالہ تعلقات میں بھی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ہندوؤں نے اسلام کو اور مسلمانوں کو ہمدرد و محرم کو سمجھنے کی کوشش کی ہو، مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے، لیکن میرا احساس یہی ہے،

ہندوؤں مسلمانوں میں معاشرتی اور تہذیبی لین دین بھی ہوا، مشترک زندگی کے سانچے بنتے، بگڑتے، اور سنورتے رہے، لیکن خالص ذہنی سطح پر دونوں فرقوں کے درمیان افہام وتفہیم کا کوئی شعوری سلسلہ نہ قائم کیا جاسکا، یہی وجہ ہے کہ جب اہم فیصلوں کا وقت آیا تو دونوں فرقوں کی اکثریت کی راہیں مختلف پائی گئیں، اب آزادی کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی جو نئی نسل سامنے آئی ہے وہ گوناگوں تاریخی اور سیاسی اسباب کی بنا پر پچھلوں سے زیادہ ذہنی طور پر ایک دوسرے سے ناآشنا ناواقف اور الگ تھلگ ہے [illegible] چیلنج تھی اور آج بھی ہے [illegible] اور حضرت رسالہ شکل میں، مولانا آزاد [illegible] یہاں ہمیں اس سلسلہ میں بھی رہنمائی ملتی ہے، (غالباً [illegible] کی) [illegible] جسے مرحوم عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکر آزاد (صفحات ۲۷۲-۲۷۵) میں نقل کیا ہے، ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

[illegible] جتنا کہ ۱۲-۱۹۱۱ [illegible]

امید کرتا تھا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اب تک اس درجہ تک نہیں پہنچا کہ ہم اس پر پوری [illegible] دیکھیں، میں ڈرتا ہوں کہ بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال میں اب تک یہ ایک پالیسی سے زیادہ نہیں ہے، محض وقت کے مشترک حالات نے دونوں [illegible] ہے ....

البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حائل نہیں .... بشرطیکہ باہم گر [illegible] دیا جائے ....

[illegible] رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور [illegible] کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس تہذیب اور اشاعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا جو صدیوں سے اس کے ہمسایے میں [illegible]

بدقسمتی سے غلامی کے دور میں بیرونی اقتدار نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جان بوجھ کر غلط فہمی پیدا کی اور اس کے لئے تاریخ کو مسخ کر ڈالا، پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ایسے ظلمت پسند افراد کی کمی نہیں رہی جنہوں نے زبان اور کلچر کے نام پر ایسی کتابیں اور مضامین لکھے جن سے رومانوی جذباتی طرز فکر کو تقویت ملی، اور [illegible] لئے انہوں نے محب وطن ہونے کا دعویٰ کر کے بھی تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیج بڑھتی گئی، آج بھی زبان اور کلچر کا [illegible] ہے اور درسگاہوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ عام [illegible] جاتی ہے، اسکولوں میں نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں غلط تاریخی واقعات کچھ اس انداز سے ترتیب دئے اور بیان کئے جاتے ہیں کہ طالب علموں کے خام ذہنوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تہذیبی رنگا رنگی کی قسم کی کوئی چیز نہیں، مولانا آزاد کی نظر کے سامنے یہ تمام چیزیں تھیں اور وقتاً فوقتاً اس صورت حال کی مضرت رسانی کی طرف وہ متوجہ بھی کرتے تھے، ۱۹۳۹ء میں 'نیشنل تحریک' کے عنوان سے انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا یہ رسالہ چھپ نہیں سکا، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی تازہ تصنیف مولانا ابوالکلام آزاد میں اس کے کچھ ٹکڑے نقل کئے ہیں، میں اسی سے ذیل کا اقتباس دیتا ہوں لیکن اس سے قبل یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ کے متعلق مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ وہ از سرِ نو لکھی جائے اور پوری غیر جانبداری سے لکھی جائے، انڈین ہسٹریکل ریکارڈز کمیشن کے جلسوں میں وہ مورخوں کو ان کا فرض یاد دلاتے رہتے تھے، اور غالباً ۱۹۵۱ء میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ تاریخ داں خواہ غیر ملکی طبقے کے حامی ہوں یا محبانِ وطن، دونوں جانبدار رہے ہیں، لہٰذا آزاد ہندوستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کما حقہ، عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔" نیشنل تحریک کے قلمی مسودہ میں مولانا نے کلچر اور تہذیب کے مسئلہ پر لکھا کہ

"اگر سمپورنانند جی نے یو، پی، اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلہ میں

ہندو مسلم کا امتیاز دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ کلچر اور تہذیب کے معاملہ میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند کرتے ہیں تو یقیناً انھوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کانگریس کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان اس سے متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصائص کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں۔

کانگریس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس کراچی میں پاس کی ہے ... مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے ...

... کے لئے گذشتہ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ میں جو تجویز پاس ہوئی تھی، وہ میں نے ہی لکھی تھی، بعد میں جواہر لال نے ... میں ترمیم کی، اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان اور کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو ترقی بھی دیں گے ... مقصد صاف طور سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی امتیازی ملی حیثیت کو ہندوستان کی قومیت متحدہ میں جذب کر دینا کانگریس کا مدعا ہرگز نہیں ....

... کو صاف طور سے چلا کر اور پکار کر یہ اعلان کر دینا چاہئے اور اس اعلان کو ... دیوار پر نقش کر دینا چاہئے کہ وہ ہندوویت میں جذب ہونے کے لئے ایک لمحے ... بھی تیار نہیں، بحیثیت مسلمان کے ان کی جو قومی خصوصیات ہیں اس کو وہ ... باقی رکھیں گے بلکہ اُن کو ترقی دیں گے ...۔"

کہا جا سکتا ہے کہ یہ باتیں تو ۱۹۳۹ء کی ہیں، اب صورت حال بدل چکی ہے، ملک کی تقسیم ہو گئی ہے اور مسلمانوں کو ان کا حق مل چکا ہے، سچ تو یہ ہے کہ خود کانگریس میں کافی لوگ ایسے ہیں جو اسی نہج پر سوچتے ہیں یہ بات جمہوریت، سیکولرزم اور انصاف و شرافت کے ہر تقاضے کی نفی ہے، خود ہمارا دستور اس نظریے کی نفی کرتا ہے، پاکستان میں ہندو اقلیت اور ہندوستان میں مسلم اقلیت

کی حیثیت یرغمال کی نہیں، ان کے جو جمہوری حقوق ہیں وہ انھیں ملنے چاہئیں، یرغمال کا نظریہ مسلم لیگ کی خود غرض اور تنگ نظر قیادت کا نظریہ تھا، ہم اسے کیسے مان لیں، یہ تو ظالمانہ اور وحشیانہ نظریہ ہے، دو تین سال پہلے کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کے علاقے میں جب خوفناک فسادات ہوئے تو ملک کے ذمہ دار [illegible] ان کے فسادات کا رد عمل قرار دیا تھا اس [illegible] وہی یرغمال کا وحشیانہ نظریہ تھا، مولانا نے ہماری آزادی [illegible] کی طرف اشارہ کیا ہے، تقسیم ملک کے [illegible] کو پہلا پیش کیا جاتا تھا۔ میرا خیال [illegible] عمل خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہندوستان کا ضمیر اس ظالمانہ نظریے کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتا [illegible] تو کل ان ذہنوں سے یہ نظریہ مٹ جائے گا جو مسلم اقلیت کو یرغمال سمجھ کر مسلمانوں کو ہندوستان کی متحدہ قومیت کا جزو نہیں سمجھتے [illegible]

[illegible] اور کابیر کے جھگڑوں کے ساتھ [illegible] ایک اور عفریت ہے جو ہماری یکجہتی اور ہمارے اتحاد کو للکار رہا ہے، وہ علاقائی وفاداری یا علاقائیت کا عفریت ہے، علاقائی وفاداری [illegible] اتنا قوی ہو جائے کہ قومی مفادات علانیہ نظر انداز کئے جائیں، سینائیں منظم کی جائیں اور وطن سے وفاداری کے جذبے کے اظہار کے لئے کسی بیرونی حملہ کا انتظار رہے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری ہیئت اجتماعی کو انتشار کا وہ گھن لگ چکا ہے جو اندر ہی اندر اسے اتنا کھوکھلا اور کمزور کر دے گا کہ باد مخالف کا ایک معمولی جھونکا بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا، مولانا کی بصیرت کی داد دیجئے کہ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا تھا، اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے وہ عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھتے ہیں:

"ایک اور اہم بات ہے جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہئے، اگر ہم ہندوستان [illegible] ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے [illegible] کے ساتھ مختلف [illegible] صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے، میں سمجھتا ہوں

[illegible] دو بعد ایک نئی تفریق "پراونشیلزم" کی بڑھتی جا رہی ہے ۔ "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں ، ۔ ۔ ۔ آپ یقین کیجئے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلزم کے لئے سخت مضر ہوگی ۔"

مسلمانوں کی مذہبی اصلاح سے متعلق مولانا کے افکار و خیالات

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ [illegible] نے شاہراہ عام سے کٹ کر ایک الگ راہ اختیار کی ۔ میرے خیال میں سب سے پہلے اُن کی صالح [illegible] چھوڑ دیا [illegible] کا نتیجہ یہ ہوا کہ شک اور اضطراب نے ان کی روح کو بے چین کیا اور وہ حقیقت کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑے [illegible] صفحات پر [illegible] غبار خاطر میں [illegible] ذکر کیا ہے ، [illegible] سے سرسید کی عقل [illegible] شکوک [illegible] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کے مرتب نے لکھا ہے "سرسید کی تقلید کا خمار بھی جلدی اتر گیا ۔ شکوک و کاوش نے اور مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ ہو گئیں ۔" اس کے بعد حیرانگی و سرگشتگی ، شک [illegible] منزلیں ان کو طے کرنا پڑی ہوں گی اُن کا احساس و ادراک ہم "سرگشتگان خانہ رسوم و قیود" نہیں کر سکتے ، بالآخر مولانا کو "اوہام و خیالات کی گہری تاریکیوں کے [illegible] مل گئی جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی جاتی ہے ۔" فکر و نظر کے ایسے ہفت خوان طے کرنے کے بعد [illegible] مذہب کی اُس حقیقت کا سراغ مل جاتا ہے جسے حقیقی مذہب یا [illegible] کہتے ہیں ، وہ تقلید کی ہر زنجیر کو توڑ ڈالتا ہے ، جمود کو ایک لمحہ کے لئے گوارا نہیں کر سکتا اور زندگی کو ارتقا یعنی مسلسل ، بتدریج ، فطری ترقی سے تعبیر کرتا [illegible]

۱۔ ذکر آزاد ، صفحات

قرائن سے صاف پتہ چلتا ہے اور کہیں کہیں ذکر بھی ملتا ہے کہ مولانا پر عالم عرب کی سلفی تحریک کا بھی اثر پڑا تھا، [illegible] المنار گروپ نے دنیائے اسلام کے علمی ماحول میں ایک حرکت پیدا کر رکھی تھی، تذکرہ میں ابن تیمیہ سے مولانا کی جس گہری [illegible] کے سلفیوں کے اثر [illegible] ہے، یوجمل جامد اسلام کی تقلیدی ذہنیت سے متنفر اور قرن اول کے اسلامی زندگی اور فکر کی خصوصیت کے شیدائی تھے، مولانا کی خواہش تھی کہ طبقۂ علماء پر جس کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام ہے، یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ جسے وہ اسلام سمجھ رہے ہیں وہ حقیقی اسلام نہیں ہے، درس نظامیہ جس کی نصابی کتابوں کو خود انھوں نے پڑھا تھا، موجودہ دور میں مسلمانوں کی ذہنی ترقی کا سامان فراہم نہیں کر سکتا۔ علماء کی اخلاقی [illegible] سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے۔ ندوۃ العلماء کے حلقہ کے علماء کو وہ روشن خیال سمجھتے تھے لیکن جب انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انھیں بہت مایوسی ہوئی، مولانا اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کے آرزومند رہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں ضروری اور تقاضائے وقت کے مطابق تبدیلیاں کر لی جائیں، علماء الگ الگ اُن کی باتیں مان لیتے تھے اس لئے کہ درس نظامیہ کی خرابیوں اور کوتاہیوں پر اُن کی جو دلیلیں ہوتی تھیں اُن کا کوئی توڑ علماء کے پاس نہیں تھا، لیکن جب باہم مل بیٹھ کر مجوزہ تبدیلیوں کے نتائج پر غور کرتے تھے تو انھیں اپنے اپنے خاندان کے اور اپنے طبقے کے خود غرضانہ مفادات کی تباہی نظر آتی تھی، اس لئے صاف، دیدہ و دانستہ غفلت کی چادر تان لیتے تھے، چند جو نیک نیت تھے تقلید اور اسلاف پرستی کی بیڑیاں کاٹ نہیں سکتے تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ طبقۂ علماء کے اس رویے سے مسلمانوں کو کتنا عظیم نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ بھی پہنچے گا، مولانا کے دل پر یہ داغ بہت گہرا تھا اور اسے [illegible] اس دنیا سے لے گئے،

میں یہ مانتا ہوں کہ کوئی قوم اپنی تاریخ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتی، لیکن

[illegible]ی کا غلط احترام قوموں کی فطری ترقی کو روک دیتا ہے، قرآن مجید زندگی کو متحرک اور متغیر قرار
دیتا ہے، ماضی کا غلط احترام حرکت اور تغیر کی نفی کرتا ہے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد وسطیٰ [illegible]
[illegible]م قرآن کی اندرونی روح کے منافی تھا، اس [illegible] کے چیلنجوں کا [illegible] مقابلہ نہیں کر سکتا
تھا اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیائے اسلام رفتہ رفتہ ان چیلنجوں کے [illegible] سرنگوں ہوگئی،
اس تاریخی حقیقت کے [illegible] نے اصول [illegible] قرآن
تعلیمات کی اندرونی روح کے سمجھنے میں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا اور پھر ان تعلیمات کو اپنے
[illegible] انداز بیان کے سہارے ہزاروں انسانوں کے دلوں میں اتار دیا، طبقہ [illegible]
[illegible] اور تغیر کو مستحسن نہیں سمجھتا، اور باتوں کے علاوہ سب سے بڑی شکایت [illegible] وہ
[illegible] پیش کرتے ہیں، مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنی [illegible] انہیں
[illegible] نے قرآن کی سادہ، فطری اور دل میں اتر جانے والی تعلیمات
کو پیش کیا ہے، حقیقت ایک ہے، سچائی ایک ہے، مختلف مذاہب اپنے اپنے طریقے سے اس
سچائی کی طرف [illegible] ہیں، اس لئے جھگڑا درحقیقت مذاہب میں نہیں ہے، بلکہ مدعیان مذاہب
[illegible]ہب کی حقیقی روح کو اگر لوگ سمجھ لیں تو سب خدا کے پرستار اور اعمال صالحہ کے
[illegible] عمل صالح وہ قدر ہے جو کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تمام مذاہب میں تقریباً
یکساں ہے، پھر مذہب کے نام پر یہ نزاعات کیوں؟

[illegible] اور [illegible] یا اس فتنہ کا جسے مولانا فتنہ قبور کہتے ہیں، غرض زندگی کا کوئی
معاملہ ہو [illegible] اور قانونی نقطہ نظر سے جلب مصالح اور دفع مفاسد کا کلیہ سامنے رکھتے
ہیں [illegible] کے خیال میں مسلم سوسائٹی زمانے کے ہر تقاضے کا جواب دے سکتی ہے
بشرطیکہ ذہن کے دریچے بند نہ ہوں، آنکھیں کھلی ہوں اور کان وقت کی پکار سن رہے ہوں۔
[illegible] کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں تو وہ اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں اور جس
ملک میں رہتے ہیں اس کی تعمیر و ترقی میں بھی ممتاز حصہ لے سکتے ہیں، کیونکہ اس سے ان میں [illegible]

پیدا ہوگی، خوف، شک اور تذبذب سے جس کی کاٹ دو دھاری تلوار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، وہ پیچھے رہیں گے اور تاریخ میں وہ نمایاں اور عہد آفریں کام کر جائیں گے جسے اُن کے اسلاف نے کبھی کیا تھا۔ سردار محمد اکبر خاں مرحوم کو مولانا لکھتے ہیں: "دنیا میں جماعتی حقوق و مفاد کا تحفظ خود اعتمادی کی روح سے ہوتا ہے نہ کہ ہمت فرسا کی آندیشناکی [illegible] میں لکھتے ہیں:

[illegible]

[illegible] ہندوستان کے مسلمانوں کے [illegible] سیاسی مستقبل کا [illegible]
[illegible] کی بنیاد عزم اور یقین پر ہونی چاہیے یا خوف و تشکیک پر، میں کہتا ہوں عزم و یقین [illegible] بلکہ کہتے ہیں نہیں شک اور خوف پر، سارا اختلاف اسی اصل کا ہے [illegible]

[illegible] جو چیز کام کر رہی ہے وہ محض سیاسی ہی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے، میں نے [illegible] افکار و عقائد کے جو اصول سامنے رکھے ہیں وہ قرآن کی تعلیمی روح [illegible] ہیں، میں [illegible] سے نہیں بلکہ ایمان و یقین سے اپنی عمارتیں استوار کرتا [illegible] لئے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسلمان کسی راہ میں بھی خوف اور شک کی تاریکی ساتھ لے کر چل سکتے ہیں، اُن کے لئے ہر گوشہ میں ایمان و یقین کی [illegible] موجود ہے، لیکن بعض ابنائے عصر ان بنیادی عقائد سے آشنا نہیں اور اس لئے بہت دشوار ہے کہ وہ کسی راہ میں بھی مجھ سے متفق ہو سکیں۔"[۲]

ابنائے عصر کے ہاتھوں اس برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں پر جو کچھ گذری وہ ہمارے سامنے ہے، اس برصغیر کی وسیع اور باوقار مسلم اقلیت تین حصوں میں بٹ گئی، کہتے ہیں دو حصوں میں اسلام خطرہ میں ہے اور ایک حصہ میں مسلمان، لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے [illegible]

[illegible] ابو الکلام، مرتبہ ظہیر احمد خاں ظہیر، کیمبل پور مغربی پاکستان [illegible]

[illegible] نوادر ابو الکلام، [illegible]

ترقی پسند اور روشن خیال عناصر کے ساتھ مل کر مسلمان ہندوستان میں تاریخی رول ادا کر سکتے ہیں
بشرطیکہ ان میں عزم اور یقین ہو، اور یہ عزم و یقین اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلمان عہد وسطی [illegible]
جامد، غیر متحرک اور بے جان اسلام کی سرحدوں کو عبور کر کے قرن اول کے اسلام کی طرف
جائیں جس کی بے میل فطری سادگی عزم و یقین اور عمل صالح کے لئے مہمیز کا کام کرتی تھی، جو علم
کا مخالف نہیں تھا، جو ترقی کا دشمن [illegible] اس کے اعلیٰ مقاصد
کو بڑھاوا ملتا تھا۔
[illegible] کرتے تھے [illegible]
[illegible] انھیں کاسہ لیسی کی زندگی گذارتے دیکھنا چاہتے تھے، کوئی موت جماعتی
[illegible] سے زیادہ کربناک موت نہیں ہو سکتی، وہ مسلمانوں کو سرتاپا عمل دیکھنا چاہتے
تھے کہ جس طرح ماضی میں مسلمانوں نے تاریخ ہند میں کئی روشن بابوں کا اضافہ
[illegible] ہے اسی طرح مستقبل کی تاریخ میں بھی ان کے لئے نمایاں جگہ ہو، آج سے بہت پیشتر مولانا
نے [illegible] میں جو کچھ لکھا تھا اس کے الفاظ و معنی میں تھوڑی سی رد و بدل کے ساتھ
کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان کا وہی پیغام ہے،
[illegible] والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی، یقیناً ایک
دن آئے گا.... اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے، فرض کر لیجئے کہ اس
[illegible] ملک ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے
[illegible] مسلمانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا
[illegible] لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے
[illegible]، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، حاکمانہ طمع کا کھلونا اور ہندوستان
کی پیشانی پر ایک لہراتا ہوا کلنک بن کر رہی ہے
بات ذرا کڑوی ہے لیکن سچی ہے، میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اس سرزمین کی [illegible]

[illegible] الٰہی کی آنکھیں انہی کی طرف لگی ہیں کہ وہ خود اعتمادی، عزم اور یقین کے ساتھ اٹھیں، اپنی قلت پسندی، اپنے خول میں سکڑ بیٹھنے کے رجحان اور اپنے [illegible] کر اٹھیں اور اُس میدان کارزار میں [illegible] جہاں حق و باطل میں نبرد آزمائی ہو رہی ہے، جہاں [illegible] اپنے بے شمار دشمنوں کے نرغے میں ہیں، اسی طرح اور صرف اسی طرح وہ مشیت الٰہی کی تکمیل میں حصہ لے سکتے ہیں، اور یہی اور صرف یہی وہ طریقہ [illegible] کر وہ مادر وطن کے ماتھے کا ٹیکہ بن سکتے ہیں۔

روشن صدیقی

شمعِ تنہائی

نقابِ شب میں چھپ [illegible] کی یاد آئی سمجھتے ہیں
[illegible] سمجھتے ہیں

نہ سمجھیں بات [illegible]ی کی ہم اتنے بھی نہیں ناداں
[illegible]اں تک ہے بساطِ عقل و دانائی سمجھتے ہیں

[illegible]جہ پھر توجہ ہے، مگر ہم تیرے دیوانے
تغافل کو بھی اک اندازِ رعنائی سمجھتے ہیں

ہمیں ناآشنا سمجھو نہ رسم و راہِ منزل سے
کہاں لے جا رہا ہے ذوقِ رسوائی سمجھتے ہیں

ہم ایسے سرپھروں کو کام کیا ہے مرگ و ہستی سے
[illegible] ہے شوخیٔ نازِ مسیحائی سمجھتے ہیں

ہم اے خلوت نشیں، آخر ہیں تیرے دیکھنے والے
[illegible] ہے اہتمامِ محفل آرائی سمجھتے ہیں

[illegible] والے پاکی و تقویٰ کی عظمت میں تو کیا شک ہے
[illegible]! ہم تو غبارِ کوئے رسوائی سمجھتے ہیں

روشؔ صدیقی

تہذیبِ مغاں

وہ نکہتِ گیسو پھر اے ہم نفساں آئی
[illegible] دم میں دم آیا ہے اب جان میں جان آئی

[illegible] رندوں نے سر اپنا جھکایا ہے
اس پر بھی نہ واعظ کو تہذیبِ مغاں آئی

جب بھی یہ خیال آیا کیا دَیر ہے کیا کعبہ
ناقوسِ برہمن سے آوازِ اذاں آئی

اس شوخ کی باتوں کو دشوار ہے دہرانا
جب بادِ صبا آئی آشفتہ بیاں آئی

اردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہے
وہ شخص مہذب ہے جس کو یہ زباں آئی

یہ خندۂ گل کیا ہے ہم نے تو یہ دیکھا ہے
کلیوں کے تبسم میں چھپ چھپ کے فغاں آئی

آباد خیال اس کا، شاداں رہے یاد اس کی
اک دشمنِ دل آیا اک آفتِ جاں آئی

اشعارِ روشؔ سن کر توصیف و ستائش کو
سعدیؒ کا بیاں آیا، حافظؒ کی زباں آئی

روش صدیقی

رنگ

خود کو گمشدہ کو بہ کو سمجھتے ہیں
اہلِ عشق تجھے روبرو سمجھتے ہیں

خیال کی خوشبو ترے جمال کا رنگ
ہم اس کو تکملۂ رنگ و بو سمجھتے ہیں

کوئی مقام کوئی مرحلہ نظر میں نہیں
کہاں ہے قافلۂ آرزو سمجھتے ہیں

جمالِ شہر کو یہ اعتراف ہو کہ نہ ہو
زبانِ عشق کی سب گفتگو سمجھتے ہیں

[illegible] در آغوش ہے سکوں تیرا
تجھے ہم اے دلِ آشفتہ خو سمجھتے ہیں

ہزار منزلِ نو یک فراغِ گم شدگی
مآل حوصلۂ جستجو سمجھتے ہیں

فقیہِ شہر سے کیا پوچھئے روش کہ جناب
زبانِ شیشہ و جام و سبو سمجھتے ہیں

صالحہ عابد حسین

عورت — اقبال کی شاعری میں

اقبال ہمارا عظیم شاعر اور مفکر ہے جس نے مذہب، اخلاق، سیاست اور زندگی کے مسئلوں پر اتنا سوچا [illegible] کہ ٹیگور کے علاوہ شاید ہی کوئی اور شاعر اس کا مقابلہ کر سکے۔ اگرچہ اقبال عام طور پر عالم اسلامی کے افراد کو مخاطب کرتے ہیں لیکن ان کے کلام کا ایک قابل لحاظ حصہ ساری عالم انسانیت [illegible] ہے کہ وہ ان قدروں کی تبلیغ کرتے ہیں جو سب بڑے مذہبوں [illegible] میں مشترک ہیں۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ عظیم شاعر اپنے لافانی پیام کو صرف مردوں تک محدود رکھتا ہے یعنی آدھی نوع انسانی کو اس پیام کو [illegible] کے قابل ہی نہیں سمجھتا، جس کے ذریعے وہ ایک بہتر و برتر دنیا کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کلام اقبال کے شیدائیوں میں مردوں کے علاوہ تعلیم [illegible] بھی کم نہیں۔ وہ ان کے کلام پر جھومتی، اس سے متاثر ہوتی اور اپنے دل و دماغ کو اس سے فیض پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بڑی مزے کی بات ہے کہ اقبال نے جو کچھ صرف عورت کے بارے میں یا عورت سے خطاب کر کے کہا ہے وہ عورتوں کو بہت کم پسند آتا ہے بلکہ ان کے بعض اشعار پڑھ کر افسوس اور تکلیف ہوتی ہے کہ وہ ایسا کیوں اور کیسے کہہ گئے؟ پرانے زمانے کی قدامت پرست یا تنگ خیال عورتیں ممکن ہے ان شعروں کو صحیح سمجھتی ہوں مگر آج کی باشعور، پڑھی لکھی، روشن خیال عورت ان شعروں کو کس طرح پسند نہیں کرتی ؎

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
[illegible] قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ جانا — اس قوم کا خورشید بہت [illegible]

عورت سوچتی ہے کہ مرد پہلے اپنے اخلاق و کیرکٹر کی تو نگہبانی کر لے وہ عورت کی کیا نگہبانی کرے گا جو اپنی آبرو و اخلاق کو جان سے زیادہ پیارا سمجھتی ہے اور اگر اپنی پیاری سی پیاری چیز اس کی حفاظت کے لئے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ [illegible] کی جگہ اقبال نے یہ کہا ہوتا کہ ' نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی ۔ کوئی بھی عورت [illegible] نہیں کر سکتیں بلکہ مرد [illegible] رت کا عزتِ نفس کا احساس اور اپنی نسوانیت کا پاس کرنے کا [illegible] اس کا نگہبان ہو سکتا ہے تو وہ بہت بڑی سچائی کی ترجمانی کرتے [illegible] تے ہیں

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت — ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

یورپ کی تہذیب کی سطحی جھلک دیکھ کر اقبال مغربی تعلیم اور تہذیب سے بڑے بدظن ہو گئے تھے مگر ان کے خیال میں عورت کے لئے تو یہ زہر اور موت سے بدتر تھی۔ بڑی حیرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ اسلام کا فدائی، کلام الٰہی کو اتنے غور سے پڑھنے اور سمجھنے والا یہ مفکر کیسے عورت کو علم سے محروم رکھنے کی بات سوچ سکتا ہے۔ کلام الٰہی اور حدیث نبوی میں علم کی تاکید [illegible] یکساں کی گئی ہے۔ مگر آخری شعر اقبال کا مطلب واضح [illegible] ہے کہ [illegible] علم و ہنر کو موت سمجھتے ہیں جو مذہبی تعلیم و اقدار سے خالی ہو۔ اس [illegible] ہے کہ ان کی طرح دنیا کے سبھی [illegible] عورت کو دین کی امین سمجھتے ہیں جو اس شمع [illegible] روشن رکھتی ہے

[illegible] دیں سے اگر مدرسۂ زن [illegible]
[illegible] عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

[redacted]

... سے پیدا ہوا ہے۔ صلاحیتیں کی دولت، دل کی شرافت اور ذہنی قابلیت ابھارنی ماں کی تربیت اور تعلیم ہے۔ وہ خود کو مٹا اور کھپا کر افلاطون جیسے عالم اور مفکر پیدا کرتی ہے اور اقبال کے ان طریقے سے دنیا [illegible] عقل والا انکار کر سکتا ہے کہ عورت کا پہلا اور سب سے [illegible] تربیت اور تعلیم ہے اور فطرت نے یہ کام خاص طور پر اسی لئے اسے سونپا [illegible] کو بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ لیکن اس عظیم مفکر کی نگاہ سے دو باتیں [illegible] فطرت کے تقاضے سے ماں بن کر ہی یہ صلاحیتیں اور قابلیت پیدا نہیں ہو جاتی [illegible] بچوں کی بہترین تربیت کر سکے۔ ایک ان پڑھ، جاہل، دنیا سے [illegible] سیاسیات سے بے گانہ، معاشی مسائل سے بے خبر، علم و عمل کی دنیا سے دور عورت [illegible] مذہبی عقیدے [illegible] خود کہاں سے پیدا ہو جائیں گی جن سے کام لے کر [illegible] انسان بنایا جا سکتا ہے۔

[illegible] یہ نہیں آتی کہ اقبال نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ عورت علم [illegible] نہیں کر سکتی۔ اگر عورت اس کی اہل نہ تھی تو قدرت نے اسے [illegible] صلاحیتیں کیوں دی ہوتیں۔ کوئی شک نہیں کہ مجرد علم اور سیاست [illegible] نے مرد سے بہت کم [illegible]

[illegible]

میں بھی [illegible] سے ہوں

ان اشعار سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ اقبال کی نظر میں عورت [illegible] صرف ماں کی حیثیت ہے! وہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ عورت کو بچہ پیدا کرنا اور اسے بہتر بنانا اور اسی طرح بہتر دنیا پیدا کرنا اس کا عظیم و مقدس فرض ہے جو وہ انجام دیتی آئی ہے اور اب بھی یہی کام اسے کرنا چاہئے۔ اس سے آگے وہ قدم بڑھائے تو گویا نسوانیت کی توہین کرے گی۔

 [redacted]

لگتی عورتیں زندگی کے ہر [illegible] میدان میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔ جن عورتوں کو خدا نے ذہنی اور دماغی قابلیتیں دی [illegible] کیوں نہ علم و آرٹ کے میدان میں ان سے کام لے کر ذہنی [illegible] لیتں کا بے کراں [illegible] ہیں۔

بہر حال [illegible] عورت کے عمل کا دائرہ محدود سمجھتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس محدود دائرے میں ان کی نظر میں عورت کا مرتبہ بہت بلند و ارفع ہے۔ وہ [illegible] بچے کی ماں، انسانیت اور تہذیب کی ما[illegible]

اپنی ایک مشہور فارسی نظم میں انھوں نے ماں کے مقام اور درجہ کو بڑی خوبصورتی [illegible] چار شعر سن لیجیے

[illegible] آمہات — جوہر صدق و صفا از امہات

[illegible]ت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت اس[illegible]

[illegible]ات — سیرت اقوام را صورت گر است

ان کا پہلا اندیشہ تو سراسر غلط ثابت ہوا اور دنیا کی آبادی اس خطرناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے کہ لوگ [illegible] رہے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا یہ خیال صحیح نکلا کہ [illegible] بے خبر اور عقیدہ کی دولت سے تہی مایہ مادی افراد جن کے دل میں [illegible] ہی سے ایمان کی شمع روشن نہیں کی جاتی آج بے یقینی، بے زاری اور روحانی کرب میں [illegible] نظر آتی [illegible]

[illegible] (میری طرح اور عورتیں بھی) متفق نہیں کہ مرد کا جوہر [illegible] کے بغیر ظاہر ہوتا ہے مگر عورت کے جوہر مرد کے ذریعے کھلتے اور نکھرتے ہیں ؎

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر
مرد کی ذات سے ہے جوہر عورت کی نمود

[illegible] سے ہی انکاری ہیں کہ جو جوہر مرد میں ہیں وہ عورت میں بھی ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورت میں جو تخلیقی جوہر ہے یہی اس کا اصلی اور واحد جوہر ہے جس کو اسے بروئے کار لانا اور اپنی ساری [illegible] اور صلاحیتوں کو اس میں گم کر دینا چاہیے ؎

راز ہے اس کی تپ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذت تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرار حیات — گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غم ناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ان اشعار سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ اقبال کی نظر میں عورت کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر صرف ماں کی حیثیت سے [illegible] سمجھانا چاہتے ہیں کہ عورت کو بچہ پیدا کرنا اور اسے بہتر انسان بنانا اور اسی طرح بہتر دنیا پیدا کرنا اس کا عظیم و مقدس فرض ہے جو وہ انجام دیتی آئی ہے اور اب بھی یہی کام اسے کرنا چاہیے [illegible] آگے وہ قدم بڑھائے تو گویا نسوانیت کی توہین کرے گی۔

عورت کی آزادی کے بھی وہ خلاف ہیں ؎

اس بحث کا ابھی فیصلہ کچھ کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور ہیں معذور ہیں مردان خرد مند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اقبال کے اس چیلنج یا اپیل یا تنبیہ کا جواب تو ہمیشہ قوم کی عورت [illegible] "زمرد کے گلوبند" کے مقابلے میں آ سے اپنی آزادی — آزادیٔ کردار و گفتار، آزادیٔ عمل اور آزادیٔ [illegible] کے انتخاب سے پڑھا جاتا ہے۔ لیکن میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ اقبال نے "زمرد کا گلوبند" استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جس [illegible] کے علاوہ وہ مذہبی اور اخلاقی [illegible] اس ظاہری اور رسمی آزادی کے مقابلے میں جو ان کے [illegible] میں عام طور عورت کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے بنیادی حقوق، صفات [illegible]

اقبال کی نظر میں عورت کا مرتبہ بلاشبہ بہت بلند ہے۔ اپنے ایک اور قطعہ میں وہ [illegible]

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے صاحبانِ علم، مفکر، فلسفی، ہادی و رہنما گزرے ہیں سب اسی کی گود میں پروان چڑھے ہیں اور اسی لئے اس کا مقام آسمانوں سے [illegible] دنیا کے ہر شرف سے بڑھ کر ہے [illegible] یہاں مقصد صرف یہ نہیں

کہ افلاطون ایک عورت ہی کی کوکھ سے پیدا ہوا اس لئے ماں کا درجہ بلند ہے بلکہ یہ کہ مرد کی ایمان و یقین کی دولت [illegible] اور ذہنی قابلیت اجاگر ہی ماں کی تربیت اور تعلیم سے ہوتی ہے۔ وہ خود کو مٹا اور گھلا کر افلاطون جیسے عالم اور مفکر پیدا کرتی ہے اور اقبال کے اس نظریے سے دنیا میں [illegible] کا پہلا اور سب سے بڑا فرض بچے کی صحیح تربیت اور تعلیم ہے اور [illegible] اسی لئے اسے خدا نے کہ اس میں اس کام کی بے پناہ صلاحیت [illegible] اس عظیم مفکر کی نگاہ سے دو باتیں اوجھل ہیں۔ پہلی یہ کہ عورت میں صرف فطرت کے تقاضے سے ماں بن [illegible] کی بہترین تربیت کر سکے۔ ایک ان پڑھ، جاہل، دنیا سے ناواقف [illegible] معاشی مسائل سے بے خبر، علم و عمل کی دنیا سے دور عورت میں [illegible] بھی قدریں خود بخود کہاں سے پیدا ہو جائیں گی جن سے کام لے کر بچے کو ایک اچھا اور بلند انسان بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آئی کہ اقبال نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ عورت علم فن کی دنیا میں کوئی مقام نہیں پا سکتی۔ اگر عورت اس کی اہل نہ تھی تو قدرت نے اسے [illegible] ذہنی اور دماغی صلاحیتیں کیوں دی ہوتیں۔ کوئی شک نہیں کہ مجرد علم اور سیاست وغیرہ کی دنیا میں عورت نے مرد سے بہت کم نمایاں مقام حاصل کیا ہے (جس کی وجہ بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں)، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس کے باوجود عورت [illegible] فرائض کے علاوہ بھی دنیا میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ حکومت اور سیاست کے میدان میں بڑی بڑی حکمران عورتیں گزری ہیں [illegible] شاعری، مصوری اور موسیقی میں کتنی عورتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ عرب کی مشہور شاعرہ خنساء اور فارسی کی شہرۂ آفاق شاعرہ قرۃ العین [illegible] مادام کیوری کے نام سے کون پڑھا لکھا ناواقف ہے جس نے سائنس کی دنیا [illegible] شہرت پائی جس [illegible] اور آج کے دور میں تو

بے گنتی عورتیں زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔ جن عورتوں کو خدا نے ذہنی اور دماغی قابلیتیں دی ہیں وہ کیوں نہ علم و آرٹ کے میدان میں ان سے کام لے کر ذہنی تخلیق کا بے کراں لطف اٹھائیں۔

بہرحال اقبال اگرچہ عورت کے عمل کا دائرہ محدود سمجھتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس محدود دائرے میں اس کا [illegible] ماں ہے۔ بچے کی ماں، انسانیت اور تہذیب [illegible] اپنی ایک مشہور فارسی نظم [illegible] بیان کیا ہے۔ اس کے دو چار شعر سن لیجئے ؎

سیرت فرزند ہا از امہات   [illegible]

نیک اگر بینی امومت رحمت است   زانکہ او را با نبوت نسبت است

[illegible]

[illegible]یدہ سالم

نظام زر بحران میں

ابھی کچھ دن ہوئے کہ معاشی دنیا میں سونے کی قیمت کے اچانک اضافہ [illegible]
[illegible] ہو گئی تھی۔ سونے کی قیمت میں اضافہ کی وجہ سے ڈالر کی بیرونی قیمت میں تخفیف کو [illegible]
اور دنیا کے بڑے ملکوں کے مرکزی بنک، ماہرین معاشیات اور سیاست داں سب ہی اس صورت
حال [illegible] پیدا ہونے والی معاشی بدحالی اور انتشار کے نئے اندیشوں سے پریشان تھے
یہ بحران عارضی طور پر قابو میں آگیا ہے۔ لیکن اس کے جو اسباب تھے وہ اپنی جگہ باقی ہیں اس لئے
ان اندیشوں کی نوعیت کو سمجھنا اور ان اسباب کا تجزیہ کرنا جو ان حالات کے پیچھے ہیں یقیناً دلچسپی
سے خالی نہیں ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد انہی کی تفصیل و تشریح ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم سونے کی قیمت میں رد و بدل کے اسباب اور نتائج سے بحث کریں
ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بین الاقوامی معیشت میں سونے کی کیا اہمیت ہے۔ مختلف ممالک میں
مختلف سکے اور کرنسی رائج ہیں جن کو اندرونی طور پر عام مقبولیت حاصل ہے لیکن وہ بیرونی
لین دین اور حساب فہمی کے لئے استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ سونا ہی ایک ایسی چیز ہے جو مختلف
ملکوں کے باہمی لین دین کے سلسلے میں ذریعہ ادائیگی کا کام کرتا رہا ہے۔ اس وقت سونے کے
علاوہ دو سکے ڈالر اور اسٹرلنگ بھی بین الاقوامی سطح پر حساب کتاب صاف کرنے کے لئے
استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو ریزرو کرنسی (RESERVE CURRENCY) کہا جاتا ہے لیکن
[illegible] عادی قبول کر رکھی ہے کہ پینتیس 35

ڈالر کے معاوضہ میں ایک آونس سونا خریدے یا بیچے گا اور کسی وقت بھی اگر کوئی چاہے تو ڈالر کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ڈالر کی یہ ساکھ ڈالر ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی براہ راست سونے کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے ہے۔ اسٹرلنگ کی یہ حیثیت برطانیہ کی تاریخ اور روایات کی مرہون منت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ کا شمار دنیا کی عظیم ترین تجارتی اور اقتصادی قوتوں [illegible] ہوتا رہا ہے لہٰذا بہت سے ممالک اسٹرلنگ سے وابستہ ہیں اور اسٹرلنگ ڈالر کی معرفت بالواسطہ طور پر سونے سے وابستہ ہے۔

بین الاقوامی تجارت [illegible] بین الاقوامی سطح پر سرمایہ کاری کی ترقی کے لئے International Liquidity کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے [illegible] اس پر ہے کہ [illegible] پاس وہ چیز کتنی ہے جس کو بین الاقوامی سطح پر حساب فہمی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں [illegible] پاس کتنا سونا ہے یا کتنے [illegible] عام قبولیت کا درجہ حاصل ہے یا جن کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ڈالر بین الاقوامی سطح پر لین دین کے لئے کوئی ایک مشترک سکہ نہیں ہے۔ سونا ہی ایک ایسی دھات ہے جسے عام قبولیت حاصل ہے۔ ساتھ ہی کچھ سالوں پہلے تک کوئی ایسی مشترک مشینری بھی نہ تھی جو مختلف ممالک کے نظام زر میں ایک ہم آہنگی اور توازن کی کیفیت کو بحال رکھنے کی کوشش کرے تاکہ مختلف ممالک کے سکوں کے شرح مبادلہ میں ایک استحکامی صورت برقرار رہ سکے اور [illegible] تعین بین الاقوامی سمجھ بوجھ تعاون اور دوستی کی بنا پر ہو اور [illegible] رسد کی قوتیں قابو میں رکھی جا سکیں۔ ایسی مشینری کی تنظیم کی ضرورت کو ۱۹۴۴ء میں برٹین ووڈس [illegible] کانفرنس میں محسوس کیا گیا اور ۱۹۴۶ء میں ہوانا کانفرنس میں اس نے انٹرنیشنل مونٹری فنڈ (I.M.F.) [illegible] جامہ پہنا۔ اس بین الاقوامی ادارہ کے سامنے دو مقاصد تھے (۱) ممبر ملکوں کے سکوں کی درمیانی شرح مبادلہ کو غیر معمولی اتار چڑھاؤ سے محفوظ رکھنا (۲) ممبر ملکوں کے لئے بر وقت ضرورت زر مبادلہ کی فراہمی۔ یہ دونوں مقاصد [illegible] ہیں اور بین الاقوامی معاشی صحت کے لئے اہمیت

رکھتے ہیں۔ غور کرنے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی سطح
پر سرمایہ کاری کی ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ مختلف ممالک کے سکوں کے مابین شرح مبادلہ میں
استحکام ہو۔ اگر کسی ملک کو کسی دوسرے ملک کے سلسلہ میں یہ خطرہ ہوگا کہ اس کے اپنے سکے
اور غیر ملکی سکہ کا درمیانی رشتہ کمزور بنیادوں پر ہے اور کسی وقت بھی غیر متوقع تبدیلیاں پیدا
ہوسکتی ہیں خواہ سرمایہ کاری کا رشتہ تو وہ تعلقات بڑھاتے ہوئے گھبرائے گا اور ایسی غیر [illegible]
[illegible] کو برقرار رکھنے کے لئے
ضروری ہے کہ ملک کے پاس غیر ملکی سکوں کی رسد ضرورت کے مطابق ہو اگر اس ملک کے پاس غیر ملکی
[illegible] رسد کم ہوتی ہے تو اس کا خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کے سکے کی دوسرے
پیمانہ میں قیمت مقررہ حد سے گر جائے اس صورت میں مرکزی بینکوں کے پاس غیر ملکی سکہ کی
[illegible] تو گویا ملک I.M.F. کے لئے اول الذکر مقصد کی تکمیل کی خاطر آخر الذکر
[illegible] داری کو اٹھانا ناگزیر تھا۔ مثال کے طور پر ایک پاؤنڈ دو ڈالر چالیس سینٹ کے [illegible]
الذکر [illegible] بازار میں ان سکوں کی شرح مبادلہ اس متعین شرح سے صرف دو سینٹ اوپر
نیچے ہوسکتی ہے۔ فرض کیجئے انگلستان کے تاجروں و سرمایہ کاروں کے لین دین [illegible]
کے تقاضے یہ ہوں کہ انگلستان کے تاجروں [illegible] کو ڈالر کی ضرورت بمقابلہ امریکی تاجروں
اور سرمایہ کاروں کی اسٹرلنگ کی ضرورت کے بہت زیادہ ہو تو اس کا مطلب ہوا کہ ڈالر کی [illegible]
[illegible] اسٹرلنگ [illegible] ڈالر کی باہمی قیمت [illegible] ڈالر اڑتیس سینٹ
نیچے گر [illegible] اس صورت میں انگلینڈ کے سینٹرل بینک پر یہ ذمہ [illegible]
وہ ڈالر مہیا کرنے اور اسٹرلنگ کی [illegible] کو تھامے رکھے۔ اسی طرح سے اگر حالات ایسے
ہوں کہ اسٹرلنگ کی رسد کم ہو اور مانگ [illegible] امریکی تاجر [illegible]
اپنی خریداری کے دام ادا کر [illegible] امریکی سرمایہ کاروں کو انگلستان میں سرمایہ
کاری کی وجہ سے تو اسٹرلنگ کی ڈالر [illegible] دو ڈالر بیالیس

[illegible]ٹ نیچے یا ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہوگا۔ ان حالات میں انگلستان کے سینٹرل بنک کی ذمہ داری [illegible] کہ وہ ڈالر خریدے اور اسٹرلنگ مہیا کرے۔ غرضیکہ بنک آف انگلینڈ مانگ کی کمی کی صورت میں خود خریدار کی صورت اختیار کرے اور مانگ کی زیادتی کی صورت میں بیچنے والے کی حیثیت اختیار کرکے طلب و رسد کی قوتوں کو ایسے توازن پر رکھے گا کہ پاؤنڈ کی ڈالر میں قیمت دو ڈالر [illegible] سینٹ سے زیادہ یا دو ڈالر اڑتیس سینٹ [illegible]

[illegible] میں ملکوں کے سینٹرل بنکوں کو اپنے سکوں کی بیرونی قیمت میں استحکام رکھنے کے لئے I.M.F [illegible] ندہ کی ضرورت ہوتی ہے

[illegible]

[illegible] شرکت ان کی معاشی و اقتصادی حیثیت و دیگر حالات سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہے [illegible] کی ادائگی کے لئے کچھ مقدار سونے کی اور کچھ ان کے اپنے سکوں کی مقرر کی گئی ہے۔ سونا ہر جگہ ہر وقت قابل قبول ہے اس سے [illegible] ملک کے سامنے باہمی لین دین کا مسئلہ ہو اور اس کے سامنے دوسرے ملک کے سکہ کی کمی ہو تو سونا ہی ایسی چیز ہے جو ذریعہ ادائگی کا کام دے گا۔ ممبران ممالک کو فنڈ میں شرکت کی بناء پر یہ سہولت دی گئی [illegible] ضرورت کے وقت اپنے چندہ کا سو فیصدی بطور قرض [illegible] ہیں اور اگر توازن ادائگی Balance of payment میں بنیادی طور پر ناموافقت پیدا ہو جائے یعنی صورت حال یہ ہو کہ مستقل طور پر اس کو بیرونی ادائگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو وہ اس سے بھی زیادہ قرض لے سکتے ہیں لیکن اس صورت میں I.M.F قرض ان [illegible] ساتھ دے گا جو توازن ادائگی کی اس بنیادی ناموافقت کو سدھارنے کے لئے ضروری سمجھے گا۔ مثال کے طور پر حال ہی میں بر[illegible] I.M.F سے قرض لینے کی ضرورت پڑی اور I.M.F کے مشورہ پر [illegible] سکہ کی قیمت گرانی پڑی۔

I.M.F کے قیام سے کچھ حد تک یہ خلا تو پر ہو گیا کہ ممبر [illegible]

ممکن ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے ریزرو میں اس دوران میں نمایاں کمی ہوئی۔ حال ہی کے چند سالوں
میں امریکہ کے ریزرو میں ۵ ملین ڈالر کی کمی ہوئی ہے۔ دراصل ۱۹۴۹ء سے امریکہ سے ڈالر باہر
جا رہا ہے۔ ابتدائی دور میں یہ رجحان منصوبہ اور خواہش و ارادہ کے تحت تھا۔ مارشل پلین
کے نام پر جنگ زدہ یورپ کے علاقوں کی بدحالی دور کرنا اور اعانت کرنا مقصود تھا۔ لیکن
[illegible] کے بعد سے ڈالر کا یہ رجحان کہ [illegible] ریزرو سے نکل کر [illegible] ملکوں کے
ریزرو میں پہنچ رہا ہے قطعی غیر ارادی [illegible] رجحان کی بہت کچھ
ذمہ داری ویٹ نام کی جنگ پر اور امریکی [illegible] کی غیر ملکی سرمایہ [illegible]
[illegible] کے سلسلہ میں امریکہ زرمبادلہ [illegible] ۷۰۰ ملین ڈالر سالانہ خرچ کر رہا
ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ امریکہ میں اشیاء کی لاگت پیداوار بمقابلہ [illegible] ملکوں کے اونچی ہے
کیونکہ عام طور پر امریکہ کی سطح اجرت اونچی ہے اس لئے امریکہ کے سرمایہ کار دوسرے ملکوں میں
سرمایہ کاری کو زیادہ نفع آور پا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی امداد کے تحت بھی ڈالر [illegible]
ہے یہ تمام تقاضے ایسے رہے جو امریکہ کی خالص برآمد کی قیمت سے نہیں پورے [illegible]۔ اس لئے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت بھی امریکہ کا موازنہ تجارت (Balance of Trade)
اس کے موافق ہے یعنی تجارت کے میدان میں اس کی برآمد درآمد سے زیادہ ہے لیکن یہ زائد
[illegible] (Balance of Pay[illegible]) کی دوسری مدوں [illegible]
کو پورا کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ موازنہ ادائگی میں نمایاں مد جنگ ویٹنام کے اخراجات
[illegible] سرمایہ کاری کی مزدوریاں ہیں۔ اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی [illegible]
ویٹ نام کی جنگ اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی بنا پر پچھلے دور میں امریکہ پر ادائگی کی ذمہ داریاں
[illegible] ڈالر یا ان دستاویزوں کی صورت میں ہوتی رہی جو اتنی وزنی تھیں جتنی
اور خواہش پر ان ڈالرس یا ان دستاویزوں کے حصول کرنے والے ان کے
[illegible] سکتے تھے اور امریکہ ڈالر کو سونے میں منتقل کرنے سے انکار

نہیں کرسکتا ہے کیونکہ پچھلے چونتیس 34 سال سے اس نے یہ پابندی قبول کر رکھی ہے۔ حال میں کچھ ایسی باتیں پیدا ہوئیں کہ ڈالرس کے پالنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اس ذخیرہ کو بجائے ڈالرس کے اگر سونے میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ لہٰذا سونے کی مانگ بڑھنے لگی اور اس کے ساتھ کئی بازاروں میں اس کی قیمت۔ قبل اس کے کہ ان حالات کے محرکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے بہتر ہوگا کہ سرکاری ریزرو کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت پر نظر ڈال لی جائے۔

مجموعی ریزرو کا زیادہ تر [illegible] ت ہے اور ان دستاویزوں اور معاہدوں پر مشتمل ہے جو زرمبادلہ کے طور پر استعمال [illegible] اضافہ کی رفتار 1.7 تھی اور یہ رفتار 1965 - 1960 کے دوران برقرار رہی یعنی سونے کی رفتار بڑھی [illegible] رفتار اضافہ میں استقلال رہا۔ اس میں تیزی نہیں پیدا ہوئی برعکس اس کے زرمبادلہ (Foreign exchanja) کے اعداد و شمار دکھاتے ہیں [illegible] یہ جز محض ۴ فیصدی کے حساب سے بڑھا تھا لیکن دوسرے دور [illegible] رفتار 5.7 فیصدی ہوگئی یعنی تقریباً سات گنی بڑھ گئی۔ زرمبادلہ کا جز [illegible] کے کیوں اتنی تیزی سے بڑھا اور اس کے کیا نتائج ہوتے؟ [illegible] میں ان سوالات کی بہت اہمیت ہے۔ بین الاقوامی تجارت ۶ فیصدی کے حساب سے بڑھ رہی [illegible] کی پیداوار صرف ۲ فیصدی کے حساب سے۔ ساتھ ہی ساتھ سونے کی مانگ صنعتی و ذاتی ضرورتوں کے لئے بہت بڑھی ہے لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بین الاقوامی لین دین کے معاملات کو طے کرنے کے لئے کسی نعم البدل کی یعنی کسی ایسی شے کی جو عام قبولیت کا درجہ رکھتی ہو ضرورت پڑی۔ وہ دستاویزیں یا کاغذات ہی یہ کام انجام دے سکتے تھے جنکو اپنے اپنے ملکوں کے سنٹرل بینکوں [illegible] پشت پناہی حاصل ہو۔ لہٰذا زرمبادلہ (Foreign exchange) اس دور میں بہت تیزی سے بڑھا۔

اس کے ریزرو کے سونے کے جز میں بہت کم اضافہ ہوا کیونکہ سونے کی مجموعی رسد اس کے لئے ناکافی رہی کہ وہ بڑھتی ہوئی صنعتی و نجی ضرورتوں کو پورا کرے اور ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی ادائگیوں کے تقاضوں کو۔

سونے کی طلب و [illegible]

(ملین ڈالر میں)

[illegible]	نئی پیداوار	سوویتی فروخت	کل	سرکاری مانگ	صنعتی استعمال (۱۲ ممالک کی)	نجی استعمال	مجموعی نجی مانگ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	455	–	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	7[illegible]	1015	665	–	–	[illegible]
[illegible]	[illegible]	200	1375	345	265	765	[illegible]30
[illegible]5	[illegible]	550	1980	400	475	1105	1580
[illegible]	[illegible]	—	1435	-55	530	960	149[illegible]

اوپر دئے ہوئے اعداد و شمار یہ دکھاتے ہیں کہ ۱۹۵۵ء میں سونے کی مجموعی رسد ۱۰۱۵ ملین ڈالر کی قیمت کی تھی اس میں [illegible] ملین ڈالر کا سونا نجی و صنعتی استعمال میں آیا بقیہ 665 ملین ڈالر کا سونا زر کے زمرہ میں سرکاری استعمال میں آیا۔ برعکس اس کے ۱۹۶۵ء میں گو کہ سونے کی مجموعی رسد بڑھ کر ۱۹۸۰ ملین ڈالر کی قیمت کی ہو گئی لیکن اس میں سے 475 ملین ڈالر کا سونا صنعتی استعمال میں آیا۔ 1105 ملین ڈالر کا سونا نجی استعمال میں آیا اور صرف 400 ملین ڈالر [illegible] زر کے استعمال میں آسکا یعنی کل رسد کے ایک پانچویں حصہ سے خفیف سا زیادہ سرکاری استعمال میں آسکا۔ ۱۹۶۶ء میں حالت اور بھی گئی گذری رہی رسد 1435 ملین ڈالر کے سونے کی ہوئی لیکن پرائیویٹ سیکٹر سے مانگ اتنی بڑھی کہ [illegible] سرکاری استعمال سے نکل کر نجی و صنعتی ضرورتوں میں کام آیا۔ غرضیکہ سونے کی رسدیوں تو تقریباً دگنی ہو گئی لیکن اس کی

مانگ خصوصاً نجی استعمال کے لئے اس قدر بڑھی کہ اس کی قلت بہت ہی نمایاں ہوگئی اور یہ ایک معاشی حقیقت ہے کہ قلت کے دور میں ردعمل کے طور پر آئندہ کی قلت کے اندیشہ کی وجہ سے مانگ اور بھی بڑھتی ہے جو قلت میں مزید اضافہ کرتی ہے اور عمل و ردعمل کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ سونے کی مانگ کے بڑھنے کی ابتدائی ذمہ داری کن عناصر [illegible] یہ سوال لازمی طور پر اٹھتا [illegible] کیا اس بیسویں صدی میں عورتوں کو اپنے کو زیورات سے بوجھل کرنے کا یا مردوں کو سونے کے بیٹن و بروچیاں بنانے کا شوق [illegible] اس رجحان کے لئے شاید [illegible] ملتی۔ البتہ سٹہ بازی کے میدان [illegible] وسیع تر اضافہ ہوتا نظر آ رہا۔ سٹہ بازی میں اتنا اضافہ کیوں ہوتا گیا [illegible] کی قیمت [illegible] نے کی قیمت آج سے چونتیس سال پہلے 35 ڈالر فی آونس مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران میں دیگر اشیاء کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں [illegible] سونے کی مانگ میں بمقابلہ اس کی [illegible] اضافہ ہوا لیکن طلب و رسد کے توازن کی اس تبدیلی نے سونے کی قیمت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ [illegible] کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی اپنی جگہ منجمد رہی۔ لیکن اس خارجی و مصنوعی پابندی کے لئے [illegible] روز افزوں شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے تھے۔ سٹہ بازوں کی اس توقع کو تقویت پہونچ رہی تھی کہ سونے کی قیمت اس پابندی کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکے گی [illegible] گی۔ پابندی کو توڑنے کے غیر قانونی رجحانات مضبوط پڑ رہے تھے ایسی فضا میں پرائیویٹ سیکٹر سے سٹہ بازی کے لئے سونے کی مانگ روز افزوں [illegible] [illegible] حالات میں پاؤنڈ کی بیرونی قیمت میں تخفیف (Devaluation) نے ایک چنگاری کا کام کیا۔ بارود تو موجود تھا ہی شعلے بھڑک اٹھے۔ اس دلیل میں منطق تھی کہ اگر ایک ریزرو کرنسی کی یعنی پاؤنڈ کی ناموافق موازنہ ادائگی (Unfavourable Balance of Payment) کی وجہ سے [illegible] گھٹ سکتی ہے تو انھیں اسباب کے ساتھ دوسری ریزرو کرنسی یعنی ڈالر کب تک اپنی بیرونی سمت کو برقرار رکھ سکے گا۔ اس کی بھی بیرونی قیمت

عنقریب گھٹے گی لہذا ڈالر کو جلد از جلد خرچ کرنے اور اس کے بدلے سونا خریدنے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

سونے کے ساتھ اس بڑھتی ہوئی عقیدت اور ڈالر کے ساتھ اس بدعقیدگی کی ذمہ داری کچھ حد تک فرانس کے رویہ پر بھی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے ڈی گال زر کے لئے سونے کے معیار کے راگ الاپ رہے ہیں اور فرانس سونا خریدنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈی گال فرانس میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری سے بھرا ہوا بیٹھا ہے۔ امریکہ جس قسم کی سرمایہ کاری کر رہا ہے اس لئے فرانس کے پیداواری عناصر میں سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہونچ رہا۔ جب ایک ملک کسی دوسرے ملک میں نیا کارخانہ کھولتا ہے تو نفع پہلے ملک کو بھی پہونچتا ہے لیکن اس کے مزدوروں کو اجرت ملتی ہے کچھ خام مال کے استعمال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں کچھ اشیاء کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے کچھ حد تک آنسو پونچھ جاتے ہیں لیکن فرانس میں جو امریکی سرمایہ کاری ہو رہی ہے وہ اس صورت کی ہے کہ فرانسیسی ریزو میں سرمایہ کاروں کا ادا کیا ہوا ڈالر یا ڈالر سیکیورٹیں بڑھ رہی ہیں جن کی گارنٹی پر فرانسیسی بنک اپنے ملک میں زر اعتبار (Credit money) میں اضافہ کر رہے ہیں۔ بدلے میں فرانسیسی ملکیتیں اور جائدادیں امریکی سرایہ کاروں کے نام منتقل ہو رہی ہیں، غرضیکہ فرانسیسی خود کے معاوضہ میں فرانسیسی جائدادیں بک رہی ہیں اور فرانس کو حاصل کیا ہو رہا ہے ڈالر کا اندوختہ جس کی بنا پر کچھ حد تک افراط زر (Inflation) کا تلخ ذائقہ۔ اس رجحان کو روکنے کے لئے فرانس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی نظر آیا کہ تیزی سے ڈالر خرچ کر کے سونا خرید لیا جائے۔ یہ ہتھیار ایسا تھا جس کے استعمال نے امریکہ کو کیا پوری دنیا کو جھٹکا دیا۔ نتیجہ یہ کہ سونے کی مانگ اور بھی تیزی سے بڑھی اور مجموعی مانگ اتنی بڑھ گئی جس کا پورا کرنا ناممکن نظر آئے گا۔ ایک افراتفری کی فضا پیدا ہو گئی۔ زر کی دنیا میں ہلچل مچ گئی اور سونے کی قیمت اور ڈالر کی حیثیت پر فوری طور پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

زرکی معاشیات کے ماہرین اکٹھا ہوئے ۔ زرکی پالیسی بنانے والے بینکوں سر جوڑ کر بیٹھے
[illegible] دسپے میٹنگ اور کانفرنسیں ہوئیں۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ سونے کی قیمت بڑھائی جائے
تاکہ سٹہ بازوں کی ہوس سرد پڑے لیکن یہ معاملہ ڈالر اور امریکہ کی ساکھ کا تھا۔ ڈالر کی [illegible]
قیمت کا گھٹنا (Devaluation) معمولی حادثہ نہ ہوتا [illegible] بین الاقوامی معیشت
زیر پر اس کے اثرات پڑتے۔ لہذا واشنگٹن [illegible]
[illegible] ہوئی اور اس میں یہ طے ہوا کہ سونے کی دو قیمتیں مقرر کی جائیں ایک قیمت اس سونے
کی جو سرکاری کام [illegible] غیر سرکاری کام [illegible]
سونے کا بازار جو دنیا کا سب سے بڑا سونے کا بازار ہے۔ پہلی اپریل تک بند کردیا گیا تاکہ سونے
[illegible] لین دین [illegible] سونا خریدنے والوں میں انکار کی صورت [illegible]
پیچھے۔ مانگ اس رفتار سے بڑھ رہی تھی کہ فوری طور پر اس کا پورا کرنا وقت طلب مسئلہ تھا۔
[illegible] دو راستے تھے۔ ایک طریقہ کار یہ تھا کہ امریکہ اس کا اعلان
کرے ڈالر ایک ایسا ہی سکہ ہے جیسا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سکے اور اس کا سونے
[illegible] ختم کردے لہذا ڈالر کی مدد سے سونے کی خرید و فروخت کا سلسلہ منقطع
کردے لیکن اس راستے کے اختیار کرنے سے ایک طرف اندیشہ یہ تھا کہ ڈالر اور امریکہ کی
ساکھ کو نقصان [illegible]

[illegible] دوسرا طریقہ کار جو امریکہ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈالر کی موجودہ قیمت حیثیت
[illegible] اور مانگ کے دباؤ کو قابو میں لانے کی خاطر اپنی اندرونی کرنسی کی پچیس فیصدی
[illegible] رکھنا ضروری تھا اس پابندی کو ختم کر کے اپنے 11400 ملین ڈالر کے سونے
کے ذخیرہ میں سے [illegible] ڈالر کا سونا سونے کی مانگ کو پورا کرنے پر لگا دیا ہے۔ سونے
کی دو قیمتیں مقرر کردی گئی ہیں۔ دنیا کے سات بڑے سینٹرل بینکوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ
[illegible] استعمال کے [illegible] بجائے 35 ڈالر فی آونس رکھیں گے لیکن غیر سرکاری [illegible]

کے لئے بھاؤ 35 ڈالر اور 44 ڈالر 45 سینٹ کے درمیان رہے گا۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی چیز کی یہ دو قیمتیں کب تک چل سکیں گی۔ سونے کی قیمت کھلے بازار میں کیا ہوگی اس کا فیصلہ بہت کچھ جنوبی افریقہ [illegible] دو ممالک سے ہوتی ہے [illegible] سنٹرل بنک جو اس فیصلہ میں شریک [illegible] کم قیمت پر سونا خرید کر زیادہ قیمت پر بیچنے کے کاروبار میں شریک ہو جائیں۔ اگر ایسی [illegible] تو دو قیمتوں کا یہ ڈھانچہ آناً فاناً بیٹھ جائے گا۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک [illegible] کار اختیار کیا [illegible] کی فوری روک تھام کی حیثیت [illegible] مستقل علاج نہ [illegible] علاج کے لئے تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو مرض پھر ایسی مہلک شکل اختیار کرے [illegible] رضی تدبیروں سے کام نہیں چلے گا اور دنیا کو زیادہ پریشانیاں برداشت کرنی ہوں [illegible] کو اس وقت موقعہ مل گیا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لے کر مناسب اور دیرپا حل تلاش کرے۔ عالمی نظام زر میں سونے کو جو جگہ ملی ہوئی ہے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس [illegible] سے ہٹایا جائے۔ اور سونے کے بجائے امریکی ماہر معاشیات برنسلین (Bernslain) کے مشورہ کے مطابق Reserve Units یا S.D.R. قسم کی تدابیر سے کام لیا جائے۔ لہذا بین الاقوامی لین دین کی سطح پر سونے کا استعمال و اہمیت ختم ہو جائے۔

ڈالر کا سونے میں منتقل ہونا بند کر دیا جائے اور ڈالر کا و دیگر سکوں کا رشتہ اس سے برطرف اور ڈالر سونے سے وابستہ نہیں رہے۔ دوسرے مناسب تقاضوں کی روشنی میں نئے سرے سے طے کیا جائے۔ فوری طور پر یہ ضروری ہے کہ امریکہ اپنے موازنہ ادائگی Balance of Payment کو درست کرے۔ ویٹ نام کی جنگ کے طفیل امریکی معیشت پر بہت دباؤ پڑ رہا ہے کچھ افراط زر کے بجا رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، لاگت پیداوار بڑھ رہی ہے [illegible] بین الاقوامی بازار میں امریکہ کے مقابلہ کی قوت گھٹ رہی ہے۔ امریکہ کی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار دکھاتے ہیں کہ پچھلے چند مہینوں میں امریکہ کی درآمد میں گیارہ فیصدی کا اضافہ ہوا جبکہ

برآمد اپنی جگہ برقرار رہی آیندہ کے رجحانات نہیں ہیں کہ برآمد و درآمد کے فرق میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ ان حالات میں پریذیڈنٹ جانسن کا یہ دعویٰ کہ یہ فرق ۵۰۰ ملین ڈالر ہوگا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

مسئلہ کے صحیح اور دیرپا حل کا انحصار اس پر ہے کہ امریکہ سوجھ بوجھ سے کام لے مفاد میں قدم اٹھایا جائے۔ لکیر کا فقیر بنے رہنے اور روایتی طور پر سونے کے [illegible] سے کام نہیں چلے گا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر سونے کی رسد سونے کی مانگ کا ساتھ نہیں [illegible] بڑھتی [illegible] کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے۔ اور اس صورت حال کی [illegible] کہ سونے کی وہ قیمتیں متعین حلقوں تک محدود رہیں بہت ہی دشوار کن مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ قرین قیاس [illegible] نظام زر کو سونے کی قیمت کی ردوبدل کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی خاطر ڈالر اور سونے کے رشتہ کو ختم کرنا ہی ہوگا۔



سعید انصاری

تعلیم

طبیعی علوم یا انسانی علوم؟

موجودہ تعلیم کے سامنے یہ ایک بڑا سوال ہے کہ ہمیں طبیعی علوم (Physical Sciences) پر زیادہ توجہ دینی چاہیے یا انسانی علوم (Humanities) پر۔ اس سوال کے جواب میں سٹر آئی۔ ڈی معرا نے ایک تعلیمی رسالہ کے نام ایک مراسلہ بھیجا ہے جس میں وہ بڑے دل چسپ انداز میں ایک منظر کشی کرتے ہیں اور پھر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ایک بڑی عظیم الشان عمارت کے سامنے بہت سی بڑی اور چھوٹی موٹریں کھڑی ہیں۔ عمارت کا اندرونی حصہ طرح طرح کی دواؤں کی بو سے بھرا ہے، ایک طرف بڑے بڑے آپریشن کے کمرے ہیں دوسری طرف بڑے بڑے ہال مریضوں سے بھرے ہیں۔ ہر چیز صاف ستھری اور قاعدے سے لگی ہوئی ہے۔ اتنے میں پلنگ نمبر ۲ سے ایک مریض کے کراہنے کی آواز آتی ہے اور کئی مرتبہ کراہنے کے بعد ایک مہتر کی توجہ اس طرف جاتی ہے اور وہ لپک کر نرس کو یہ اطلاع کرتا ہے کہ میم صاحب! فلاں نمبر کا مریض بہت کراہ رہا ہے۔ نرس ایک حاکمانہ انداز میں آتی ہے اور پوچھتی ہے "کہو، کیا بات ہے؟" بہرحال، مریض کو دیکھ کر وہ سمجھتی ہے کہ اسے کوئی شدید تکلیف ہے اور وہ ایک چٹ دے کر چپراسی کو بھیجتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو دے آؤ جو راؤنڈ پر ہیں۔ وہ بے چارا تمام ہسپتال کے چکر لگا کر بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر صاحب تک پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب معمول کے مطابق اس

[illegible] کی بار وہ ان کے پاس آتے ہیں اور ایک پرچہ پر کچھ لکھ کر چلے جاتے ہیں یہ بھی نہیں کہ کہ دو چار کلمے تسکین اور تسلی کے مریض سے کہہ جاتے۔ ہسپتال کے سارے عملے میں کہیں ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ [illegible]

[illegible] اس کے بعد مراسلہ نگار سوال کرتا ہے کہ [illegible] مقابل مغرب میں کیوں ہمارے اس اعلیٰ تعلیم یافتہ طبعی علوم کے ماہر ڈاکٹروں میں کیوں نہ تھا [illegible] صورت حال اس ڈاکٹر کے معاملہ میں تھی اس سے کچھ کم اور علوم طبعی کے ماہر [illegible] سے اعلیٰ تعلیم کے بعد ہمارے علماء و فضلاء میں [illegible] کا جذبہ اس نسبت سے ترقی نہیں پاتا ہے جس رفتار [illegible] میں اضافہ ہوتا [illegible] سبب فاضل مراسلہ نگار کے نزدیک یہ ہے کہ ہماری تعلیم میں انسانی علوم [illegible] یعنی قدیم کلاسکی زبانیں اور ادبیات ہمارے [illegible] روز بروز خارج ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسرے معاشرتی علوم مثلاً فلسفہ، تاریخ، اجتماعیات، فنون لطیفہ [illegible] ہے۔ ان مضامین اور علوم کی تعلیم کا انسانی جذبات کی نشو و نما اور عام انسانی [illegible] کے پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں کسی شخص کی تعلیم مکمل نہیں [illegible] اگر وہ ان علوم سے بے بہرہ ہے

لیکن آج کل کا زمانہ اس کے برعکس ہے۔ آج کل کا دور سائنس کا دور سمجھا جاتا ہے، اور اس [illegible] تعلیم میں ان مضامین کو ہٹا کر یا کم سے کم ان کی اہمیت کو گھٹا کر علوم طبعی اور سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ طلباء کو شروع ہی سے انتخاب کر کے سائنس کی تعلیم [illegible] جاتی ہے اور تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں اچھی [illegible] ملازمتیں اور کام مل جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو طلباء سائنس لے کر کامیاب نہیں ہوتے ہیں، وہ برسوں دھکے کھاتے رہتے ہیں اور اگر انہیں کام مل بھی گیا تو وہ سماج [illegible] درجہ کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ رخ ہمارا [illegible] رفتہ رفتہ زیادہ تیز دکھائی دیتا ہے۔ اب سے

کوئی ۱۰ سال پہلے جب ایک یونیورسٹی کمیشن ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں مقرر ہوا تھا، اس وقت اس نے ہمارے نظام تعلیم کی تنگ دامانی کا علاج ایک جنرل ایجوکیشن کی شکل میں تجویز کیا تھا، یعنی جو انسانی علوم کے طلبا ہیں، انھیں تھوڑا بہت جدید سائنس سے واقف ہونا چاہئے اور جو [illegible] انسانی تہذیب، تار[illegible]فہ کے اثرات پیدا کرنے چاہئیں۔ لیکن [illegible]یشن کی اس سفارش پر منجملہ اور کمیشنوں کی سفارشات کے سب یونیورسٹیوں نے عمل نہیں کیا [illegible] سال پہلے کوٹھاری کمیشن جو تعلیم کی تمام منزلوں کا جائزہ [illegible] کے لئے مقرر ہوا [illegible] اس کمی کو دور کرنے کے بجائے مزید سائنس اور سائنسی علوم کی تعلیم پر اتنا [illegible]

[illegible]ال یہ نہیں ہے کہ علوم طبیعی ہوں یا انسانی علوم، بلکہ تعلیم کا سارا دارومدار اس پر [illegible] توازن کس طرح قائم رکھا جائے تاکہ موجودہ وقت کی ضروریات بھی پوری ہوں اور انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں بھی باقی رہیں۔

کیا بنیادی تعلیم ختم ہوگئی؟

اسی عنوان سے ابھی تھوڑے دن ہوئے اجمیر میں ایک سیمینار ہوا تھا، جس میں ٹیچرز کالج جامعہ ملیہ کے پرنسپل جناب ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے بھی شرکت کی تھی۔ آپ نے اسی مباحثہ کی بنیاد پر "بنیادی تعلیم کی حمایت میں" ایک مضمون لکھا ہے، جس میں آپ نے خود سیمینار کے منتظمین سے یہ سوال کیا ہے کہ یہی سوال تعلیم کے اور حصوں پر کیوں نہیں کیا جاتا ہے؟ مثلاً ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، صنعتی تعلیم وغیرہ۔ صرف بنیادی تعلیم ہی کو کیوں اس کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اس مخصوص انداز سوال سے ش[illegible] ہے کہ بنیادی تعلیم کے حامیوں کا اعلا[illegible]

[illegible]

۔ فرض کیجئے کہ اگر بنیادی تعلیم ختم بھی ہوگئی ہے تو اس کے خاتمے کے اس[illegible]

کیا یہ اس وجہ سے ناکام ہوئی ہے کہ ایک ابتدائی تعلیم کی اسکیم کی حیثیت سے یہ تجربہ کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری ہے؟ اگر یہ ناکام ہوئی ہے تو کیا اس کے اغراض و مقاصد صحیح نہیں تھے؟ یا اس کا نصاب تعلیم ناقص تھا؟ یا اس کے طریقہ تعلیم اور اسلوب میں خامیاں تھیں؟

واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کے اصول کا تعلق ہے، تمام روشن خیال حلقہ اسے تعلیم کا ایک صحیح نظام سمجھتا رہا ہے۔ اس کے بڑے سے بڑے مخالف [illegible] اس کے اصولوں کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرنا آسان نہیں سمجھا ہے۔ بنیادی تعلیم کے بنیادی اصول بہ حیثیت مجموعی تعلیم کے نزدیک بالعموم اور تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک بالخصوص غیر معمولی سمجھے گئے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں حکومت ہند نے جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے اس کا جس انداز میں اپنی رپورٹ کے اندر ذکر کیا ہے، وہ بعض لوگوں کے نزدیک اس کی رسم فاتحہ سے کم نہیں ہے۔ حالانکہ کمیشن نے جن لفظوں میں ذکر کیا ہے، وہ خود بہت قابل تعریف ہیں۔

> بنیادی تعلیم جو مہاتما گاندھی نے ۲۵ سال قبل شروع کی تھی، وہ ابتدائی تعلیم کی ایک نئی شکل تھی جو کسی ہاتھ کے اور نفع بخش کام پر مبنی تھی اور جس کا سماجی زندگی سے بہت گہرا تعلق تھا، وہ ہندوستان کی تعلیم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔

پھر آخر ناکام کیوں رہی؟ اس کی ناکامی کا اصل سبب لائق مضمون نگار کی نگاہ میں ہماری سماجی زندگی کی بناوٹ ہے۔ ایک طرف تو پیداوار بڑھانے پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔ ہندوستان [illegible] کرنی چاہئیں، آج کا سب سے بڑا نعرہ ہے۔ اس کے لئے ظاہر ہے ہمیں زراعت [illegible] دونوں کو ترقی دینی ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر ہندوستان میں اشتراکی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل میں ہماری تعلیم کو بھی بہت بڑا حصہ لینا ہے، چنانچہ ایسی تعلیم جس میں پیداوار پر زور دیا جاتا ہو، ہر شخص چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے [illegible] تعلیم کا ہونی کی جو حالت ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس اختلاف کی آخر وجہ کیا

ہے جو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ برسر اقتدار طبقہ نے دماغی کام اور جسمانی کام میں ایک آہنی دیوار کھڑی کر رکھی ہے [illegible] ہے اور جسمانی کام ادنیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ اور جب تک یہ امتیاز ہمارے ذہنوں میں رہے گا، کوئی کام ہاتھ کا مدرسے کے نصاب [illegible] ترقی پسندانہ انداز میں کہا ہے کہ اگر ہمارا ارادہ ایک سماجی نظام قائم کرنے کا ہے تو اس سے مفر نہیں ہو سکتا کہ [illegible] ہمارے مدرسے پیداواری کاموں سے ایسے بھرپور ہوں کہ ہمارے بچے اور نوجوان پیداواری ہنرمندیوں اور صلاحیتوں میں کامل ہو کر نکلیں۔ بنیادی تعلیم یقیناً ایک اشتراکی نظام قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہے، اس لئے کہ یہ ایک ہاتھ کے کام اور دماغ کے کام کے فرق کو مٹاتی ہے [illegible] دوسری طرف بچوں میں ایسی صلاحیتیں اور ہنرمندیاں پیدا کرتی [illegible] سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن یہ صرف چند پرانے حرفوں اور دستکاریوں تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ ایجوکیشن کمیشن کے الفاظ میں "بنیادی تعلیم کے پروگرام کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے جو ایسے سماج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو جو سائنس اور ٹکنالوجی سے روز بروز متاثر ہو رہا ہے۔"

جلد ۷۵ کی فہرست مضامین

[illegible] جامعہ کی جلد ۷۵ کی فہرست مضامین یعنی جنوری سے [illegible] جون [illegible] مضامین اور مضمون نگاروں کی فہرست [illegible] کے ساتھ بھیجی جائے گی۔ جلد بندھوانے سے قبل [illegible] انتظار کر لیا جائے۔

عبداللطیف اعظمی

نیاز فتحپوری کے خطوط

(... [illegible] ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا تھا، ان کی [illegible]
برسی کی مناسبت سے ذیل کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے)

[illegible] کی ہر تحریر میں ان کا [illegible]
[illegible] موجود ہوتا ہے [illegible] معاملے میں مولانا ابوالکلام اور مولانا نیاز فتحپوری دو [illegible]
[illegible] زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ دونوں کا اسلوب [illegible] دور کے ذوق اور چلن سے مختلف تھا، مگر پھر بھی دونوں کی مقبولیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، دونوں کی تحریروں میں اشعار کی کثرت ہوتی ہے، [illegible] کا استعمال اس قدر برمحل ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں جان پڑ جاتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا [illegible] دونوں کے خطوط میں بھی زبان و بیان کی وہی خوبیاں موجود ہیں جو ان کے دوسرے ادب پاروں [illegible] ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی خط نہیں، کسی سنجیدہ موضوع پر کوئی اہم مقالہ لکھ رہے ہوں، ان دونوں کے مکتوب الیہ بھی قریب قریب اسی پائے کے ادیب اور عالم ہیں، جتنے یہ خود ہیں۔

[illegible] کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان خطوں پر نہ کوئی تاریخ ہے، نہ مکتوب الیہ کے [illegible] پتا چلتا ہے کہ مکتوب نگار نے کس جگہ سے لکھا ہے، جس کی وجہ سے ان کی تاریخی حیثیت باقی نہیں رہی۔ ان [illegible] کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خطوط نہ کسی کو لکھے گئے اور [illegible] بھیجے گئے، بلکہ یہ مختصر انشائیے ہیں، جنہیں نیاز نے خطوط کے طرز میں لکھا ہے۔ ظاہری صورت حال اسی خیال کی تائید کرتی [illegible] صاحب کی زندگی میں اس قسم کے شبہات کئے گئے تھے مگر انھوں نے کبھی اس کی تردید نہیں کی، اس لیے اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے، لیکن ان مجموعوں میں بہت سے خط ایسے بھی ہیں، جن میں اشخاص اور واقعات کا اسی طرح ذکر ہے، جس طرح نجی خطوط میں ہوتا ہے،

اس لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تمام کے تمام خطوط محض فرضی نہیں، میرا خیال ہے کہ اگر سب کے سب نہیں تو بیشتر مختلف لوگوں کو لکھے گئے ہیں اور بھیجے بھی گئے ہیں اور انھیں ضرورتاً نگار میں شائع کیا گیا۔ نیاز صاحب چاہتے تھے کہ ان کے مکتوب الیہ زیر بحث نہ آئیں، اس لیے خطوط کے تمام لوازمات کو حذف کر دیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ انھیں [illegible] اسی حالت میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ میرے اس خیال کی جن باتوں سے تائید ہوتی [illegible] ملاحظہ ہوں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "[illegible] گرامی عزیزی یوسف کے ذریعہ سے پہونچا۔" ایک اور خط میں [illegible] اسلم صاحب نے زبانی خط و کتابت بند کر دی ہے اور اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ بمبئی میں ہیں تو مجھے یہ بھی خبر نہ ہوتی [illegible] زندہ ہیں یا مر گئے۔" ایک اور مثال ذرا طویل، ملاحظہ [illegible] جون کا گرامی نامہ کل ۸ راگست کو ملا، آپ نے دیکھا، آپ مجھ سے کتنی دور ہیں، یعنی اس دورِ برق کہربا میں بھی پورے دو مہینے دور۔ اگر ہم آپ دو مختلف کرّوں [illegible] فاصلہ اربوں میل ظاہر کیا جاتا۔ آپ ابھی جوان ہیں، اس لیے یہ سمجھ کر شاید [illegible] لیکن مجھے اس خیال سے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ آپ نے یہ لکھ کر "میری والسی کا کچھ ٹھیک نہیں" اور [illegible] مایوس کر دیا، بار بار میر کا شعر یاد آتا ہے

[illegible] تک نہ [illegible] کرنے ہم سے بے وفائی کی

جنگ کا زمانہ ہے، ہندوستان میں رہتا ہوں، ملاحظات میں کیا رکھا ہے کہ انھیں علیحدہ کر کے آپ کو پرچہ بھیج [illegible] کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ درمیان میں بیس جگہ احتساب و مراقبہ ہوتا [illegible] پرزے پرزے ہو کر اس قابل نہیں رہتا کہ آگے بڑھایا جا سکے۔ مارچ و اپریل کے پرچے پھر بھیج رہا ہوں، لیکن ان کے پہونچنے یا نہ [illegible] اطلاع بھی غالباً چار مہینے کے بعد آئے گی [illegible] اللہ!

[illegible] دوران میں آپ کے پاس جتنے عربی رسائل جمع ہو گئے ہیں وہ سب یا ان میں سے خاص خاص بھیج دیجیے۔ کتابوں کی ضرورت نہیں۔" (مکتوبات نیاز حصہ دوم صفحات ۲۰۷ و [illegible])

[illegible] اوپر کا خط [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] کوئی ایسا شخص ہے جو [illegible] میں ہے، اس کو پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہے، اس شخص کو ملاحظات اس قدر پسند ہیں کہ خواہش کر [illegible] رسالہ سے الگ کر کے بھیج دیجیے [illegible] ہیں مگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ واقعات سب صحیح ہوں اور مخاطب واقعی کوئی زندہ شخصیت ہو، مگر پھر بھی میرا خیال غلط ہو سکتا ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ یہ خط اس کو نہ بھیجا گیا ہو۔ "نگار" کے کسی قاری کا کوئی خط آیا ہو اور اس کے مضمون کے پیشِ نظر ایک خط لکھ کر "نگار" کے صفحات [illegible] اس لیے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ خطوط لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کئے جائیں۔ اس خیال کو اس سے اور تقویت پہنچتی ہے کہ بیشتر خطوط میں ایسے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، جن سے نیاز کو بڑی دلچسپی تھی اور جن پر عام طور پر نجی خطوط میں اس انداز اور اس تفصیل کے ساتھ، جس طرح ان خطوط میں کثرت سے ہے، اظہار خیال نہیں کیا جاتا۔ مثلاً علمائے کرام کو چھیڑنا، ان پر طنز کرنا، ان کے خیالات کا مذاق اڑانا اور ان کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچانا، نیاز کا خاص مشغلہ تھا، ان خطوط میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"حضرت! یہ آپ کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ "قالو بلیٰ" کہنے والوں میں میری روح بھی شامل تھی۔ "لن ترانی" کی توہین برداشت کرنے والے کب کے ختم ہو چکے اور ... داری کے دور کو ... ہیں، یعنی ...

...، طاعت و عبادت کا مفہوم اگر صرف یہ ہے کہ پیشانی رگڑ رگڑ کر تقدیر کے لکھے کو مٹایا جائے (حالانکہ آپ اس کے بھی قائل نہیں) تو یہ "گھس گھس" میرے بس کی بات نہیں لیکن اگر ... بتایئے کہ اس کا انحصار "تسبیح و مصلا" ... پر کیوں؟

روزکار عشق نالہ و آہ ہے ضرور نیست

(حصہ دوم صفحات ۴۶ و ۴۷)

... خطوط میں جس کثرت سے اپنے ادبی نظریات اور خیالات کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں، اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو، ان کو پڑھ کر خاص طور پر یہ خیال یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ خطوط محض قارئین نگار کی دلچسپی اور تسکین ذوق و شوق کی خاطر لکھے گئے ہیں:

"کرم فرمائے نیاز منداں، گرامی نامہ نے معزز فرمایا۔ فارسی تغزل کے باب ... اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میری عزت بڑھاتے ہیں ... ظاہر ہے میں کیا اور میری زبان سے کیا ... سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں، لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جس حد تک تغزل کا تعلق ہے، میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی، اس میں شک نہیں کہ "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائی اور پچھلے پہر کے سکوت میں سوائے ... کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا ... اور شعرا ...

لہ نگار (پاکستان)، نیاز نمبر حصہ اول صفحہ ۳۴

خسرو کے تغزل کا اس لیے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوشدلی" آتی ہے۔
یوں ادب و انشا میں میرا ذوق کافی دقت پسند ہے، لیکن غزل میں جہاں کوئی اشکال پیدا ہ[illegible]
[illegible] سہل الفاظ، سلجھا ہوا انداز بیان، شگفتہ ترکیبیں، ــــ یہ ہیں ایک غزل [illegible]
[illegible] رنگ اتنا ہی رچا ہوا ہے جتنا اردو میں میر کے یہاں۔"
([illegible] صفحات ۵۱ و ۵۲)

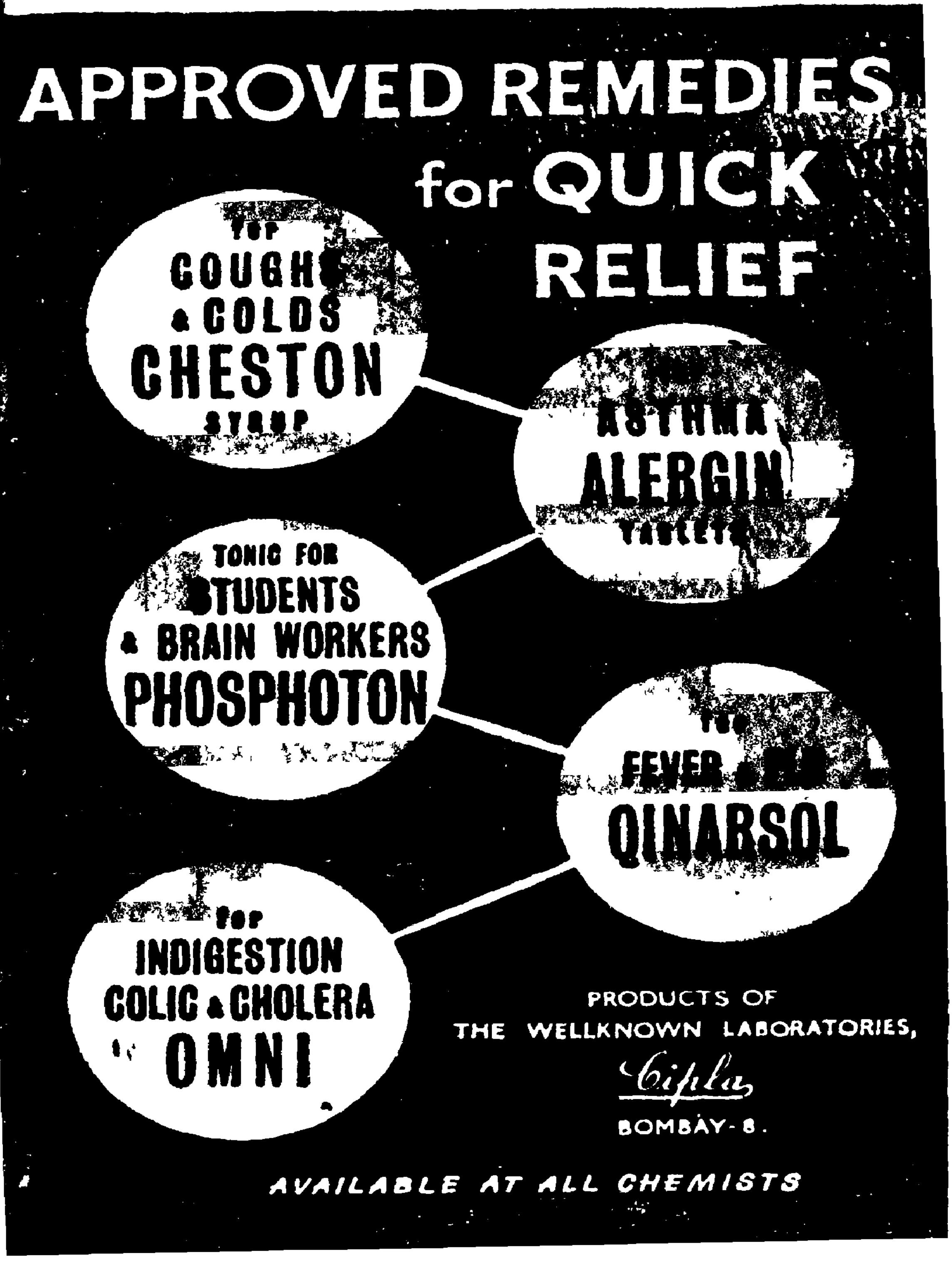
اس کے بعد نیاز [illegible] خیال کی تائید میں مختلف اور متعدد اشعار پیش کر کے تفصیل سے بحث کی ہے [illegible] یہ خطوط کسی کو بھیجے گئے ہوں یا نہ بھیجے گئے ہوں، نجی خطوط کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں [illegible] وہ یہ کہ اپنی شوخی، ندرت بیان، لطف زبان اور ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے [illegible] عقیدت مند ــــ ارشد کاکوی ــــ لکھتے ہیں:

"[illegible] کے مکاتیب شاد کی حیثیت کو UNDERVATE کرتے ہیں، حالی کے خطوط ان کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں، وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں، شبلی کے نامہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل [illegible] میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر تھی، غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی کے [illegible] ہیں، اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں، لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو اور ان کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں۔" [1]

اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے، خصوصاً موازنہ کرنے اور دوسرے مشاہیر کے خطوط کی خصوصیات کے تعین میں، میرے نزدیک خلوص سے کام نہیں لیا گیا ہے، مگر آخری فقرہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔
غرض "مکتوبات نیاز" چاہے نجی خطوط کی دلچسپی، خلوص اور سادگی سے محروم ہوں، مگر ان کے [illegible] کا تنوع، پھیلاؤ اور رنگارنگی، ان کی انشا پردازی اور ادبی و تنقیدی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس لحاظ سے ان کا مقابلہ دوسرے خطوط سے نہیں کیا جا سکتا، وہ خطوط بھی اس [illegible] کے نہیں ہیں، جو محض ادبی موضوعات اور زندگی کے مختلف مسائل پر اظہار خیال اور صرف چھپنے کے لئے لکھے گئے [illegible]

---

[1] نگار، نیاز نمبر، حصہ اول صفحہ [illegible]


APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
COUGHS
& COLDS
CHESTON
ALERGIN
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
FEVER
QINARSOL
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY-8.
AVAILABLE AT ALL CHEMISTS